اے میرے عزیزو! میرے پیارو! میرے درختِ وجود کی سرسبز شاخو!

(حضرت مسیح موعودؑ)

برگِ سبز

حکیم نذیر احمد ریحان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : برگِ سبز

مصنف : حکیم نذیر احمد رہان

ناشر : رفیق احمد رہان

مطبع : ضیاءالاسلام پریس چناب نگر (ربوہ)

فہرست

پیش لفظ

خاکسار بطور مربی سلسلہ احمدیہ میدانِ عمل سے 1991ء میں مرکز بلا لیا گیا۔ یہاں مختلف دفاتر میں مرکزی حکم کے مطابق فرائض کی ادائیگی کے بعد مجھے 1999ء میں مدرس کے طور پر مدرسۃ الظفر وقف جدید میں تعینات کر دیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مدرسۃ الظفر میں انتظامی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی اور مکرم ومحترم جناب مبشر خالد صاحب مربی سلسلہ کی جگہ حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے مکرم ومحترم اسفندیار منیب صاحب مربی سلسلہ احمدیہ کو پرنسپل مقرر فرما دیا۔ اس وقت مکرم رفیق احمد جاوید صاحب مربی سلسلہ احمدیہ اور قاری محمد عاشق صاحب اور خاکسار تینوں بڑی عمر کے استاد تھے۔ مکرم ومحترم اسفندیار منیب صاحب نے ہم تینوں کے حالات زندگی مدرسۃ الظفر کی طرف سے ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مدرسہ کے پاس اپنا ویڈیو کیمرہ تو تھا ہی۔ پہلے محترم قاری محمد عاشق صاحب کے حالات زندگی مختلف نشستوں میں تدریسی سٹاف کی موجودگی میں ریکارڈ کیے گئے اور پھر مجھے بھی اپنے مکمل حالات بیان کرنے کے لیے فرمایا گیا۔ چنانچہ اغلباً پانچ نشستوں میں مَیں نے اپنے حالات زندگی روانی سے کیمرہ میں محفوظ کروا دیے۔ یہ 2010ء کی بات ہے۔

اسی دوران بعض احباء اور دوستوں کی طرف سے ان یادداشتوں کو قلمبند کرنے کی بھی تحریک کی گئی۔ باوجود مدرسہ کے دوستوں کی ہمت افزائی کے خاکسار اپنے اندر یہ ہمت محسوس نہیں کر پا رہا تھا کہ ان حالات کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ تا آنکہ 2016ء کا فروری آ گیا تو اچانک عزیزم مسعود احمد رہان جو میرا بچپن کا دوست بھی ہے اور عزیز بھی، وہ اسلام آباد سے ربوہ آ گیا اور ایک دو روز کے بعد مصر ہوا کہ آپ اپنی

زندگی کے واقعات قلمبند کریں۔ اس پر اس نے کافی اصرار کیا لیکن پھر بھی میں نے اپنے آپ میں یہ ہمت اور قابلیت محسوس نہ کی اور معذرت کر لی۔ مگر مسعود احمد اس معاملہ میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگیا۔ بازار گیا، بہت سارے کاغذ، قلم، مارکر اور دیگر سامان خرید لایا۔ آتے ہی لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن پھر اس کی تحریر کی بجائے بالآخر میں نے حوصلہ کر لیا اور لکھنا شروع کر دیا اور پھر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے جب کافی صفحات لکھ چکا تو بعض اہلِ علم کو یہ تحریر دکھائی۔ چنانچہ انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی اور آہستہ آہستہ یہ کام جاری رہا۔ پھر گرمیوں میں جرمنی سے بیٹی اور بیٹا بمع اہل وعیال آگئے۔ اسی طرح گھانا سے بھی میرے داماد مکرم عبدالحمید طاہر صاحب مربی سلسلہ احمدیہ بمع بچوں کے آگئے۔ گھر میں خوب رونق ہوگئی اور تین ماہ تک یہ کام معرض التواء میں رہا۔ ان کے جانے کے بعد پھر لکھنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ مضمون کی تکمیل ہوتی نظر آئی۔

دوسری طرف مضمون کو کمپوز کرنے کے لیے مکرم طارق محمود طاہر صاحب استاذ مدرسۃ الظفر نے معاونت کا وعدہ کیا اور پھر اس کام کو نہایت عمدگی سے انجام تک پہنچایا۔ کتاب کے مسودہ کا بنظرِ غائر جائزہ لے کر کئی امور کی تکمیل کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس انتھک محنت کی بہترین جزاء عطا فرمائے۔ اس طرح قریباً تین صد صفحات پر محیط یہ مضمون ضبطِ تحریر میں آ کر تکمیل پذیر ہوا جس کے لیے میں عزیزم مسعود احمد صاحب کا بھی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں اور مکرم طارق محمود طاہر صاحب کا بھی کہ ان کی معاونت سے یہ مضمون کتابی صورت میں قارئین تک پہنچ پایا۔ فجز اھما اللہ احسن الجزاء

عزیزم مسعود احمد صاحب میرے تایا زاد بھائی ماسٹر کمال الدین صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں۔ میں اور مسعود احمد دونوں بچپن میں ایک ساتھ رہے ہیں۔ اکٹھے کھیلتے رہے، اکٹھے سکول جاتے رہے تا آنکہ 1947ء میں مڈل پاس کر کے میں قادیان چلا

گیا اور وقف کر کے مدرسہ احمدیہ میں داخل ہو گیا اور مسعود احمد مجھ سے دو اڑھائی سال عمر میں چھوٹا ہونے کے باعث ابھی مڈل سکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ تقسیم ملک کے بعد ہمارا خاندان پاکستان آ گیا۔ عزیزم نے ٹی آئی کالج ربوہ میں تعلیم حاصل کر کے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی۔ کالج میں کبڈی اور کشتی رانی کی ٹیموں کا فعّال ممبر تھا۔ خوب صحت مند تھا۔ کالج سے رول آف آنر دیا گیا۔ بی اے کے بعد آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کے محکمہ میں ملازمت کر لی اور محکمانہ امتحان پاس کر کے ڈویژنل اکاؤنٹس آفیسر کی پوسٹ پر متعین ہوا۔

1970ء تک لاہور میں ملازمت کی اور 1971ء میں اسلام آباد تقرری ہو گئی اور اسلام آباد سے ہی ریٹائر ہو کر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ہماری رشتہ داری اور دوستی آج بھی اسی طرح قائم ہے جس طرح بچپن میں ہمیں ایک دوسرے کے بغیر سکون اور چین نہیں آتا تھا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ چنانچہ ذکر آ چکا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب تحریر کرنے کے لیے بزور آمادہ کیا۔

علاوہ ازیں مکرم و محترم اسفند یار منیب صاحب کا بھی خاکسار از حد شکر گزار ہے جن کی وجہ سے حالات زندگی کے بیان کا آغاز ہوا۔ دورانِ تحریر بھی ان کی رہنمائی اور تعاون حاصل رہا۔ اسی طرح مکرم عمران اسلم صاحب استاذ مدرسۃ الظفر، مکرم لقمان احمد شاد صاحب لائبریرین مدرسۃ الظفر اور مکرم حافظ طاہر اسلام صاحب استاذ مدرسۃ الظفر اور مکرم فراست احمد راشد صاحب مربی سلسلہ شعبہ تاریخ احمدیت نے بھی مختلف مواقع پر تعاون فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو بہترین جزا سے نوازے۔ آمین

تبصرہ

ازمکرم مولانا عبدالباسط شاہد صاحب ساکن لندن

خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعت احمدیہ میں خدمت دین اور وقف زندگی کا بہت بابرکت سلسلہ جاری ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسے مخلص ساتھی عطا فرمائے کہ جو خدا تعالیٰ کی راہ میں ہر قربانی کو سعادت اور فضل الٰہی سمجھتے ہوئے ہمیشہ خدمت دین پر مستعد رہے۔ پریس قادیان میں لانا پڑا۔ اخبار قادیان میں لانا پڑا۔ ہجرت اختیار کرنے کی نوبت آئی۔ ہر قربانی شرحِ صدر سے پیش کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کو بھی ایسے ساتھیوں سے نوازا جو تن من دھن سے راہِ خدا میں وقف تھے۔ حضرت حافظ روشن علی صاحب، حضرت چوہدری نصر اللہ خان صاحب اور آپ کی ساری ٹیم سلسلہ کی خدمت کی ایسی مثال تھی کہ جنہوں نے آگے بڑھ کر خلافت ثانیہ کو ایک شاندار مثالی زمانہ بنا دیا۔ وقف زندگی کی صورت تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ سے شروع تھی مگر زمانے کی ضرورت اور حالات کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود نے اسے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت دے دی اور جماعت نے اس پر اس شاندار طریق سے عمل کیا کہ دشمن بھی اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ احمدیوں کی باہم اخوت، بھائی چارہ اور ترقی کی کوئی مثال نہیں۔ وقف زندگی کی بے شمار درخشاں مثالیں موجود ہیں جن کا ہم اکثر ذکر سنتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب ایک ایسے واقف زندگی کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے جو قدم قدم پر وقف کے

تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خدمت دین میں رواں دواں رہے۔نصف صدی سے زیادہ خدمت کی توفیق پانے والے یہ خوش قسمت برادرم مکرم حکیم نذیر احمد صاحب رہان ہیں۔آپ نے اس ایمان افروز داستان کونہایت سادہ رنگ میں اس طرح بیان کیاہے کہ اس میں دلچسپی کے ساتھ یہ امر بھی شامل ہوگیا ہے کہ ہمارے نوجوان واقف زندگی اس سے سبق حاصل کریں اور استفادہ کریں۔محترم رہان صاحب نے کسی جگہ بھی تکلف یا تصنع اور بناوٹ نہیں کی بلکہ خدائی تائید کے واقعات بڑی سادگی سے بیان کر کے آپ بیتی کی کشش اور جان ڈال دی ہے۔خدا تعالیٰ ان کی اس گرانقدر کوشش میں برکت عطا فرماوے اوراس کے پڑھنے سے بہتوں کوفائدہ ہو۔آمین

خاکسار

عبدالباسط شاہد

شجرۂ نسب

خاکسار نذیر احمد رہان کا شجرۂ نسب درج ذیل ہے۔

1۔شہزادہ+ جیوی

2۔میراں بخش

2۔الٰہی بخش

2۔شناہہ

2۔خیردین

2۔نصردین

2۔میراں بخش

3۔عبداللہ (4۔ابراہیم۔اسماعیل)

3۔برکت اللہ (4۔عبدالحق۔لطیف احمد)

3۔رحمت اللہ (4۔عبدالرحمٰن۔محمد حسین)

2۔الٰہی بخش

3۔رحیم بخش

3۔کریم بخش (4۔محمد شفیع)

3۔ اللہ دین (4۔عنایت اللہ۔غلام محمد۔شریف)

3۔ مولا بخش

2۔سپاہی بخش

3۔ احمد (4۔اسماعیل)

4۔اسماعیل (5۔محمد علی۔غلام حسین۔محمد حسین۔ارشاد)

2۔خیر دین

لاولد

2۔نصر دین

3۔ محمد علی (4۔محمد عبداللہ۔محمد ابراہیم۔کمال الدین۔جلال الدین)

3۔ احمد علی (4۔نذیر احمد رہان)

4۔محمد عبداللہ

5۔ محمد اسماعیل (6۔عبدالقیوم۔مشتاق احمد۔طارق محمود۔خالد احمد)

4۔محمد ابراہیم

5۔ فضل احمد (6۔وسیم احمد کلیم)

5۔ فیض احمد (6۔عبدالمنان۔برکات احمد۔سعادت)

5۔ منظور احمد (6۔صغیر احمد۔بشیر احمد۔محمد لقمان

4۔کمال الدین

5۔مسعوداحمد (6۔مشہوداحمد۔مودوداحمد۔مسروراحمد۔احمدطارق)

5۔بشارت احمد (6۔رضوان۔نعمان۔لقمان۔ارسلان)

6۔مشہوداحمد (7۔شاہ میر)

6۔مودوداحمد (7۔ہوداحمد)

6۔رضوان (7۔دانیال احمد۔مبارزاحمد۔عدنان احمد)

4۔جلال دین

5۔مبشراحمد

5۔بشیراحمد (6۔آصف۔عاطف۔یاسر)

4۔نذیراحمدرہان

5۔رفیق احمد (6۔انیق احمد۔انیب احمد)

5۔بشیراحمد (6۔سدیداحمد)

میرا خاندانی پس منظر

1800ء سے 1830ء تک سکھوں کے عہدِ اقتدار میں میرے آباء و اجداد ان کے ہاتھوں لٹ لٹا کر قصبہ بنام کھڈور رہاناں دا تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر انڈیا سے نقل مکانی کر کے تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ کے اردگرد آباد ہو گئے۔ میرے دادا چٹھہ جاٹ قوم کے گاؤں ساکن چٹھہ تحصیل بٹالہ میں آباد ہو گئے۔ میرے پڑدادا کا نام شہزادہ اور پڑدادی کا نام جیوی تھا۔ کھڈور سے نقل مکانی اور تحصیل بٹالہ میں آبادی کے بعد دونوں میاں بیوی پیدل حج کے لیے چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے۔ مجھے یہ علم اپنے سابقہ پیر برکت علی شاہ صاحب جو قصبہ مسانیاں کے رہنے والے تھے، سے اپنی اوائل عمر میں ان کی ہمارے ہاں تشریف آوری کے وقت ہوا تھا۔ مسانیاں میں سیدوں کی گدی تھی۔

پردادا کے پانچ بیٹے تھے۔ میراں بخش صاحب۔ الٰہی بخش صاحب۔ سپاہی بخش صاحب۔ خیر دین صاحب اور نصر دین صاحب۔ اول الذکر تینوں صاحب اولاد تھے۔ خیر دین صاحب لاولد تھے۔ اور نصر دین صاحب جو خاکسار کے دادا تھے وہ سب سے چھوٹے تھے۔ بہت حد تک علوم دینیہ سے آراستہ عالم باعمل تھے۔ بعض لوگ ان کو پیر بھی مانتے تھے اور وہ بعض کرامات بھی رکھتے تھے۔ دادا جان کی ایک کرامت مشہور ہے کہ گاؤں میں ایک ہندو گنپت رائے کی زمین میں آم کا بہت بڑا درخت تھا لیکن

پھل نہیں لگتا تھا۔ وہ ہندو ایک دن دادا جان سے دعا کے لیے ملتجی ہوا اور کہا کہ اگر پھل لگا تو میں پہلا سارا پھل آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ دادا جان نے ایک پیالے میں پانی دم کر کے دیا اور کہا کہ جڑوں پر ڈال دو۔ چنانچہ آم کو خوب پھل آیا لیکن ہندو نے وعدہ خلافی کی تو اس کے درخت کو پھر پھل نہیں آیا۔ اسی طرح دادا جان مرض اٹھرا کی مریض عورتوں کو کالی زہری، کالی مرچ اور اجوائن تینوں ملا کر اور دم کر کے دیا کرتے تھے جن سے اٹھرا کی مریض عورتوں کو فائدہ ہوتا تھا۔

خاندان میں احمدیت

دادا جان کے سن پیدائش وغیرہ کا تو علم نہیں۔ مگر یہ ضرور واضح ہے کہ اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام دعویٰ فرما چکے تھے اور حضرت دادا جان بوجہ دیندار ہونے کے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے حسنِ ظن بھی رکھتے تھے۔ قادیان جا کر ملاقات بھی کی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دستر خوان پر (بیتِ) مبارک میں آپ کی معیت میں کھانا بھی کھایا اور ایک روایت بھی کرتے تھے کہ جب دستر خوان پر کھانا کھانے کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی معیت میں بیٹھے تو ڈاکیا ایک بے رنگ خط لے کر آ گیا۔ اسے پیسے دے کر خط لیا گیا۔ کھول کر پڑھا گیا تو سارا خط گالیوں سے پُر تھا۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ نبی لادو ہوتا ہے جتنا چاہیں دنیا والے بوجھ ڈال دیں۔ ایک تو پیسے دیے دوسرے گالیاں ملیں۔

ایک بار حضرت مسیح موعود علیہ السلام بٹالہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہمارا گاؤں بٹالہ سے نو میل کے فاصلہ پر تھا۔ آپ گاؤں کے ایک بزرگ جو اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور عام طور پر انہیں میاں موحد کہا جاتا تھا، کے ہمراہ بٹالہ گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے شرف ملاقات بھی پایا اور آپؑ کے ہاتھ بھی

دھلوائے۔لیکن بیعت کی سعادت حاصل نہ کر پائے۔جس کی کوئی وجہ معلوم نہیں۔ بیعت کرنے کی سعادت آپ نے خلافت اولیٰ میں پائی تھی۔

دادا جان کی اولاد

آپ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام محمد علی صاحب اور چھوٹے بیٹے کا نام احمد علی صاحب تھا۔ بیٹی کا نام امام بی بی صاحبہ تھا۔دادا جان کے بڑے بیٹے محمد علی صاحب 1911ء میں جوانی کی عمر میں فوت ہو گئے۔ان کی اہلیہ کا نام ہاجرہ صاحبہ تھا۔(ہاجرہ صاحبہ کے والد جن کا نام اللہ دتہ صاحب تھا،احمدی تھے اور گلاں والی تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے۔)محمد علی صاحب کے چار بیٹے تھے۔محمد عبداللہ صاحب، محمد ابراہیم صاحب، کمال الدین صاحب اور جلال الدین صاحب۔ یہ سب نابالغ مگر احمدیت کی نعمت سے سرفراز تھے اور اب ان کی اولاد بھی سب بفضلِ خدا احمدیت کی سعادت سے بہرہ ور ہے۔

دوسرے بیٹے کا نام احمد علی صاحب تھا جو خاکسار کے والد تھے۔والد صاحب مخلص احمدی تھے۔نہایت مخلص، دیندار، پانچ وقت کے نمازی، تہجد گزار اور خلافت کے فدائی تھے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کا فضل ہے کہ پڑدادا صاحب کے پانچ بیٹوں میں سے چار صاحبِ اولاد تھے ایک لا ولد تھے۔لیکن احمدیت کی سعادت میاں نصر دین صاحب اور ان کی اولاد کے حصہ میں آئی باقی سب محروم رہے۔مگر غیر از جماعت برادری والے بھی والد صاحب کی بے حد عزت و احترام کرتے تھے۔ والد صاحب تجارت کرتے تھے، کچھ زمین بھی ٹھیکہ پر لے کر کاشت کراتے تھے اور مضبوط مالی حیثیت کے مالک تھے۔

بڑے بھائی محمد علی صاحب کی وفات (1911ء) کے بعد ان کے چاروں بیٹوں

کی کفالت اور بوڑھے والد کی دیکھ بھال بھی آپ کے ذمہ تھی۔اپنے بھتیجوں سے نہایت محبت وشفقت کا سلوک تھا۔انہیں تعلیم دلوانے کی کوشش کی۔ بڑے دونوں یعنی محمد عبداللہ صاحب اور محمد ابراہیم صاحب تو نہ پڑھ سکے۔لیکن تیسرے بیٹے کمال الدین صاحب نے مڈل تک تعلیم حاصل کر کے ورنیکلر ٹیچر کا کورس کیا اور محکمہ تعلیم میں بحثیت استاد ملازم ہو گئے۔والد صاحب نے ان تین بھائیوں کی شادیاں بھی کر دیں۔دو بڑوں کی شادی تو غیر از جماعت برادری میں کر دی اور تیسرے کی شادی ایک احمدی صاحبِ حیثیت خاندان میں کر کے دادا کی جائیداد تقسیم کر کے دے دی۔جائیداد کے حصے کر کے عمدہ حصے ان کو دے دیے اور کم تر حصے خود لیے۔چوتھے بھتیجے جلال الدین صاحب سے دریافت کیا کہ آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا کسی بھائی کے ساتھ تو اس نے بھائی کمال الدین صاحب کے ہمراہ رہنا پسند کیا۔

والد صاحب کی شادیاں اور اولاد

والد صاحب نے موضع کالا افغاناں میں میاں الٰہی بخش صاحب جو نہایت نیک اور پارسا بزرگ تھے، کی بیٹی سے شادی کی لیکن وہ جلد فوت ہو گئیں اور ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

اسی گھرانے میں آپ کی دوسری شادی محترمہ خیراں بی بی صاحبہ سے ہوئی جن کے بطن سے یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔جن کے نام یہ ہیں۔ بڑی بیٹی کا نام فاطمہ بیگم صاحبہ۔ان سے چھوٹی کا نام بیگم بی بی صاحبہ اور تیسری کا نام عالم بی بی صاحبہ تھا۔چوتھی کا نام معلوم نہیں یا یاد نہیں رہ سکا۔وہ جلد ہی فوت ہو گئیں۔اسی اثناء میں دین محمد صاحب بہشتی نے خواب دیکھا کہ میاں احمد علی صاحب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور اس کا نام فاضل شاہ رکھا گیا ہے۔

چنانچہ 25 مارچ 1930ء بروز منگل دس بجے قبل دوپہر اس عاجز کی پیدائش ہوئی۔ میری پیدائش کے وقت میرے تایازاد بھائی کے بیان کے مطابق اس وقت تین ہزار روپیہ نقد والد صاحب کی ملکیت تھا جو ایک بہت بڑی رقم تھی اور والد صاحب علاقہ میں امیر آدمی سمجھے جاتے تھے۔ والد صاحب نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ اردگرد کے کئی دیہات میں بھی نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حالانکہ آپ کی تعلیم پرائمری تھی۔ گاؤں میں چند معمولی تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک آپ تھے۔ وثیقہ نویسی بھی کرتے تھے اور گاؤں کے نمبردار کی سرکاری لگان کی وصولی میں معاونت بھی کرتے تھے کیونکہ نمبردار ان پڑھ تھا۔ میری پیدائش سے سارے خاندان اور عزیزوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بہنوں کی خوشی کی بھی انتہا نہ تھی۔ والدہ بھی ظاہر ہے بے حد خوش تھیں۔ لیکن والدہ کی خوشی دیرپا نہ ہوسکی کیونکہ میری پیدائش کے قریباً ڈیڑھ دو سال بعد والدہ کو پیغام اجل آ گیا اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مجھے اپنی والدہ کو دیکھنے کا ہلکا سا احساس باقی ہے۔ والدہ کی جدائی کے بعد مسکینی کی زندگی کا آغاز ہوا۔ بہنوں نے بڑی توجہ اور حفاظت و پیار اور شفقت سے میری پرورش کی۔ زندگی کے شب و روز اسی طرح بے خبری اور لاشعوری میں بسر ہو رہے تھے کہ میری بڑی ہمشیرہ فاطمہ بیگم صاحبہ کو بھی اللہ کے حضور حاضری کا پیغام آ گیا۔ انہیں مرضِ خنازیر تھا۔ جسے غدودوں کی ٹی بی بھی کہا جاتا ہے۔

والدہ اور بڑی بہن کی وفات کے بعد جبکہ دوسری دونوں بہنیں چھوٹی تھیں۔ گھر کی ضروریات اور میری پرورش کی غرض سے تیسری شادی محترمہ برکت بی بی صاحبہ سے کر لی جو پہلے خاوند سے علیحدگی حاصل کر چکی تھیں اور ان کے والد فوت ہو گئے ہوئے تھے۔ ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بہنیں تو شادی شدہ اور اپنے گھروں میں تھیں لیکن بھائی ابھی اپنے چچا کے ساتھ ہی کام کاج کر کے گزر بسر کرتا تھا۔ ان کے

گھر میں غربت و مفلسی کا ڈیرہ تھا۔ دوسری والدہ کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت محبت کرتی تھیں اور میں بھی ان کو حقیقی والدہ ہی سمجھتا تھا۔

میری تعلیم

عمر کے چوتھے پانچویں سال مجھے گاؤں کے پرائمری سکول میں پڑھنے کے لیے داخل کروایا گیا۔ وہاں گاؤں کے ہی ایک استاد مکرم نواب دین صاحب پڑھاتے تھے، ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ان کے علاوہ ماسٹر سید عبدالحمید شاہ صاحب جو تحصیل شکر گڑھ چک قاضیاں کے رہنے والے تھے وہ بھی کسی جگہ سے تبدیل ہو کر ہمارے گاؤں آ گئے۔ بہت ہی نیک نفس، محنتی اور ہمدرد استاد تھے۔ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ زندگی کے ان ایام میں ایک بار مجھے محرقہ بخار ہو گیا جو کافی طویل ہو گیا۔ مایوسی کے آثار تھے۔ والد صاحب نے دعائیں کیں اور صدقات دیے۔ چنانچہ ایک دن بے ہوشی کی حالت تھی کہ پسینہ آ کر میرا بخار ٹوٹ گیا اور لواحقین کی جان میں جان آئی۔

1939ء کی جنگِ عظیم سے پہلے جاپان تیزی سے صنعتی ترقی کر رہا تھا۔ ہندوستان سے جاپان کو کپاس برآمد ہونے لگی۔ والد صاحب نے بھی منوں کپاس ذخیرہ کی جو اس وقت پچیس روپے من کے حساب سے خریدی گئی تھی۔ ابھی برآمد نہ کر پائے تھے کہ اچانک جنگ کی آگ میں جاپان بھی شامل ہو گیا اور کپاس کا کوئی بھی خریدار نہ رہا۔ والد صاحب کا سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ گھر میں تیس روپے تھے وہ بھی نہیں مل رہے تھے۔ سخت فکر مندی دامنگیر تھی کہ اچانک ایک الماری میں رکھے گئے کپڑوں کو نکالنے پر وہ روپے مل گئے جس سے بہت ڈھارس بندھی۔

دوسری طرف گھر میں چاندی کے بہت سے زیورات تھے۔ جن کو والد صاحب نے بڑے ترازو میں تولا اور گاؤں کے ہندو ساہوکار کے پاس رہن رکھ کر رقم لے

لی۔ کپاس تو کئی سال میں من من یا بیس بیس سیر کر کے سوت کاتنے والی عورتیں لے گئیں اور دس گیارہ روپے من کے حساب سے فروخت ہوئی۔ ادھر والد صاحب نے ایک ہندو دلال کے ساتھ مل کر گورنمنٹ کو گھوڑے سپلائی کرنے شروع کیے جس سے مالی حالت پھر بہتر ہو گئی۔ جنگ کی وجہ سے گورنمنٹ گھوڑے خریدتی تھی۔ والد صاحب گھر میں ایک بھینس دودھ کے لیے ضرور رکھتے تھے اور اس کو سنبھالنے کے لیے گاؤں کا کوئی لڑکا نوکر رکھتے تا کہ گھر میں دودھ دہی اور گھی میسر آ سکے۔

ان کے علاوہ دوسرے بھائی ماسٹر کمال الدین صاحب بھی ٹیچر تھے۔ وہ بھی سردیوں کی راتوں میں مجھے اور اپنے بیٹے عزیزم مسعود احمد کو اور بعض اور شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔ بھائی جان نے مجھے چوتھی جماعت میں وظیفہ کے امتحان کے لیے تیار کیا۔اس وقت چوتھی جماعت کے ہونہار طلباء کو وظیفہ کا امتحان پاس کرنے پر چار روپے ماہوار چار سال تک وظیفہ ملتا تھا۔ میں نے تیاری کر کے اپنے سکول کی طرف سے بٹالہ جا کر یہ امتحان دیا لیکن اس میں کامیاب ہو کر وظیفہ نہ حاصل کر سکا۔ گاؤں میں چھٹی جماعت تک اردو ذریعہ تعلیم پر مشتمل سکول تھا۔ میں نے یہاں ہی چھ جماعتیں پاس کیں۔ دوسری طرف والد صاحب مجھے دو تین سال پہلے اپنے طور پر وقف کر چکے تھے اور قادیان میں داخلہ کے لیے اب انگریزی پڑھنا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا چھٹی جماعت پاس کرنے کے بعد گاؤں سے تین میل پر ماڈل سکول کالا افغاناں میں جو اس وقت آٹھویں جماعت تک تھا، مجھے پانچویں میں داخل کروا دیا گیا۔

گاؤں میں صرف ہمارا خاندان احمدی تھا۔ یا گاؤں کے نمبر دار طالع مند صاحب جو فوت ہو چکے تھے، کی بیوی اور بیوہ بہو اپنے نابالغ لڑکے کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ اور کوئی احمدی نہ تھا۔ چنانچہ والد صاحب اور تایا زاد بھائی علیحدہ با جماعت نماز ادا کرتے، علیحدہ نماز عید ادا کرتے۔ سب گاؤں والے اور ارد گرد کے لوگ جانتے تھے

کہ اس خاندان کا تعلق جماعت احمدیہ سے ہے اور اِرد گرد کے دیہات میں بھی نہایت قلیل تعداد میں احمدی موجود تھے۔ میرے ذہن میں بھی اپنے احمدی ہونے کا احساس اجاگر تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ احمدیت کی تفاصیل کیا ہیں۔ نئے سکول میں داخلہ کے وقت میں نے اپنی ہر کاپی کے سرورق پر جلی حروف میں نذیر احمد احمدی لکھا ہوا تھا جس کے باعث میرے احمدی ہونے کے بارہ میں کسی کو اشتباہ نہ تھا۔

سکول میں مخالفت کا ایک واقعہ

ماسٹر محمد ایوب ہاشمی صاحب میرے استاد تھے۔ چھٹی جماعت میں بیٹھنے کا پہلا دن تھا۔ تقسیم ملک اور آزادی ہندوستان کی مہم زوروں پر تھی۔ سیاسی جلسے جلوس عروج پر تھے کہ فتح گڑھ چوڑیاں میں احرار کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک منتظم چندہ لینے کے لیے سکول میں بھی آن پہنچا۔ مکرم ہاشمی صاحب کے توسط سے مسلمان لڑکوں کو کلاس میں کھڑا کر کے احرار کے جلسہ کے لیے چندہ طلب کیا گیا۔ نمبر ایک پر میں کھڑا تھا میں نے صاف کہا کہ ایک دھیلا بھی نہیں دوں گا۔ کیا آپ ہمیں دیا کرتے ہیں؟ میرا یہ جواب سن کر ہاشمی صاحب آگ بگولا ہو گئے کہ تم نے تو مرزائیت کو ظاہر کیا ہے۔ میں مانیٹر کلاس تھا میرے انکار پر بعض دوسرے مسلمان لڑکوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ کیا وہاں کوئی لولے لنگڑے آنے ہیں؟ الغرض چار لڑکوں نے ہاں کی۔ انہیں آٹھ آٹھ آنے چندہ دینے کو کہا گیا۔ اس کے بعد چندہ اکٹھا کرنے والا مہمان تو چلا گیا۔ ہاشمی صاحب کے اندر کی آگ باہر آنا شروع ہوئی اور انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خلاف نازیبا کلمات کہنے شروع کیے۔

تقریر کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لیے کلاس سے باہر گئے تو میں نے ہندو اور سکھ لڑکوں سے کہا کہ دیکھیں آپ کے گرو یا مرشد کو کوئی برا کہے تو آپ کو کیسا لگے گا؟

انہوں نے کہا بہت برا۔ میں نے کہا دیکھیں اسے میرے مرشد یا گرو کو برا کہنے کا حق نہیں۔ تو انہوں نے کہا ہم اسے کلاس میں مارتے ہیں۔ میں نے کہا مارنے کی ضرورت نہیں آپ وقت پر گواہی دے دیں۔ انہوں نے کہا ہم تیار ہیں۔ اتنے میں ہاشمی صاحب نے کلاس میں آتے ہی دوبارہ اپنی تقریر شروع کر دی۔ میں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ آپ کو سکول کے وقت میں میرے عقیدے کے خلاف بات کرنے کا کیا حق ہے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ بیٹھ جاؤ میں کروں گا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا کہ میں روک لوں گا۔

اتنے میں ریسیس یعنی آدھی چھٹی ہو گئی۔ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس گیا۔ لیکن وہ فارغ نہیں تھے۔ چھٹی ختم ہو گئی۔ ماسٹر صاحب نے مجھے کلاس میں کھڑا کر دیا۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا کہ اس طرح تو بیر نہیں اترتے اور کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں پیریڈ ختم ہوا اور ہم دوسرے ٹیچر کے پاس پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ شام کو گھر آ کر میں نے بھائی جان سے بات کی اور سارا واقعہ بتایا۔ انہوں نے کہا کل جا کر اپنے ہیڈ ماسٹر سے بات کرو۔ وہ بڑا شریف آدمی ہے۔ اس لیے اور کوئی ایکشن لینا مناسب نہیں ہو گا۔ اگلے روز میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا۔ انہوں نے ہاف ٹائم میں سٹاف میٹنگ بلا کر ہاشمی صاحب کی خوب خبر لی۔ یہ 1944ء کے مارچ اپریل کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد میں جنوری فروری 1947ء تک اس سکول میں پڑھتا رہا۔ کسی بھی ٹیچر نے کسی بھی قسم کی بدگوئی نہیں کی بلکہ تمام ٹیچر میری بے حد عزت کرتے رہے۔ میرے اس اقدام سے بعض احمدی لڑکے جو چھپے ہوئے تھے وہ بھی ظاہر ہو گئے اور علاقے کے سب احمدیوں پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔

ان دنوں مولانا غلام احمد ارشد صاحب سلسلہ کی طرف سے علاقہ میں (مربی) بھی تھے اور انسپکٹر بھی۔ ارد گرد کے دیہات کے دورہ کے بعد ہمارے گاؤں آئے

انہیں میرے اقدام کی خبر دیگر دیہات کے بعض احمدیوں نے دے دی تھی۔ چنانچہ انہوں نے میری خوب ہمت افزائی کی۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ مولانا غلام احمد ارشد صاحب بہت خوبصورت جوان اور نہایت خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔اس دورہ میں انہوں نے میرے پاس کچھ پیسے دیکھ کر مجھے چندہ کی تحریک کی۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ چھ آنے میں نے چندہ میں دے دیے اور یہ زندگی میں میرا پہلا چندہ تھا۔اس کے بعد آج تک مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے چندوں کی توفیق مل جاتی ہے۔

میرے گاؤں کے اردگرد کے چند گاؤں

میرے گاؤں کا نام چھٹے تھا۔ ہمارا ڈاکخانہ کالا افغاناں تھا۔ ہمارے گاؤں کے مشرق میں دوتین گاؤں زیادہ تر سکھ آبادی پر مشتمل تھے۔شمالی جانب ڈالے چک میں ہندو مسلمان دونوں آباد تھے۔مغرب میں کالا افغاناں، فتے والا، سیڑھے آباد تھے۔کالا افغاناں میں اکثریت مسلمان پٹھانوں کی تھی، یوں ہندو بھی آباد تھے۔فتے والا میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور سیڑھوں میں کثرت سکھوں کی تھی۔اگرچہ اس میں بعض مسلمان بھی آباد تھے۔جنوب میں موضع کلار اور گوجر پورہ تھے جن کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی۔احمدیت کے نفوذ کے لحاظ سے ہمارے گاؤں میں والد صاحب، تایازاد بھائی اور چوہدری طالع مند صاحب مرحوم کا گھرانہ احمدی تھا۔جنوب میں ڈالے چک میں حضرت بابا عیدا صاحب مرحوم کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی رفاقت کا شرف حاصل تھا اور انہوں نے دیارِ مسیح کو اپنا مسکن بنا لیا ہوا تھا۔ان کے میرے والد صاحب کے ساتھ تعلقات تھے۔میں نے ان کو دیکھا ہوا ہے۔ان کے علاوہ جنوب میں ہمارے گاؤں کے قریب کوئی احمدی نہ تھا۔

کالا افغاناں میں ایک محترم منشی لال دین صاحب احمدی تھے۔البتہ جنوب میں گھنیکے بانگر میں ایک فیملی احمدی تھی۔مغرب میں لودھی ننگل، تیجے خورد اور تیجے کلاں اور چھچھریالہ میں احمدی احباب موجود تھے۔تیجے اور چھچھریالہ سے بعض احمدی لڑکے کالا افغاناں سکول میں تعلیم کے لیے آتے تھے۔انہی میں سے تین میرے کلاس فیلو تھے۔ان کے نام یہ ہیں۔محمد شریف صاحب چھچھریالہ کے تھے۔بشیر احمد صاحب اور محمد امین صاحب تیجے کلاں کے رہنے والے تھے۔

بہر حال یہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔سکول میں ہندو،سکھ،مسلمان سب مل کر پڑھتے تھے اور کسی قسم کی باہمی تفریق نہ تھی۔اساتذہ کرام بھی سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔اساتذہ کرام میں اس وقت ٹیوشن فیس لینے کا احساس تک نہ تھا۔وہ نہایت محنت سے سب شاگردوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہوئے پڑھاتے تھے اور امتحان کے قریب آنے پر راتوں کو بھی سکول میں رہائش رکھوا کر پڑھاتے تھے۔شاگردوں میں بھی اساتذہ کا بے حد ادب واحترام تھا۔اگر کہا جائے کہ باپ سے بھی زیادہ طلباء استاد کا احترام کرتے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔

کالا افغاناں سکول کے اساتذہ کرام کا قدرے ذکر

اغلباً میں کالا افغاناں سکول میں 1943ء میں دوبارہ پانچویں جماعت میں انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہوا تھا۔اس وقت اس سکول میں مندرجہ ذیل اساتذہ تدریسی فرائض سرانجام دیتے تھے۔

۱۔ہیڈ ماسٹر چوہدری غلام محی الدین صاحب بی اے

۲۔سیکنڈ ماسٹر عبدالجبار صاحب بھٹی

۳۔ماسٹر عبدالغنی خان صاحب

۴۔ ماسٹر اللہ بخش صاحب

۵۔مکرم محمد ایوب ہاشمی صاحب

۶۔ ماسٹر کرنیل سنگھ صاحب۔ زراعت ماسٹر

۷۔ ماسٹر دلیپ سنگھ صاحب۔ فارسی پڑھاتے تھے۔

۸۔ ماسٹر محمد صدیق صاحب۔ دستکاری سکھاتے تھے۔

دستکاری میں دستی کھڈی پر سوتی کپڑا بنانا اور چارپائیوں کے لیے نواڑ بنانا سکھایا جاتا تھا۔

سارے کے سارے اساتذہ نہایت محنتی ، فرض شناس اور طلباء سے نہایت ہمدردی رکھنے والے تھے۔ مجھے تو ماسٹر اللہ بخش صاحب جو ہمیں حساب پڑھاتے تھے، کی خصوصی ہمدردی اور شفقت اور رہنمائی ملی تھی۔ اسی طرح انگریزی میں استاذی المکرّم عبدالجبار بھٹی صاحب نے خصوصی تربیت کی۔ اردو تو پہلے ہی مجھے عام طلباء سے بدیں وجہ زیادہ آتی تھی کہ والد صاحب بچپن سے ہی مجھ سے اخبار فاروق اور بدر سنا کرتے تھے جس سے میرا تلفظ اور روانی بہت بہتر تھی۔ جو انگریزی نہیں پڑھتے تھے وہ زراعت کا مضمون پڑھتے تھے۔

سکول آنا جانا

ابتدائی طور پر تو گاؤں میں سکول تھا۔ گھر سے کھانا کھایا اور سکول چلے گئے۔ چھٹی جماعت میں ہم تین طلباء تھے۔ ایک محمد صادق جو میرے بڑے دوست تھے اور ان کے والدین میرے والدین سے بہترین تعلقات رکھتے تھے۔ دوسرے محمد اسحٰق تھے۔ یہ بھی گاؤں کے ہی تھے۔ چھٹی جماعت کے بعد جب تین میل کے فاصلہ پر واقع کالا افغاناں سکول میں داخلہ لیا تو گھر سے صبح ہی صبح پیدل چل کر جانا ہوتا تھا۔

چنانچہ صبح صبح ناشتہ کر کے اور دوپہر کی روٹی رومال میں باندھ کر کتب کا بستہ کندھے پر رکھے باقی لڑکوں کے ہمراہ روانہ ہو جاتا۔ وقت پر سکول پہنچ جاتا۔ اسمبلی میں شامل ہو کر کلاس میں چلا جاتا۔ دوپہر کو وقفہ میں جسے عرف عام میں آدھی چھٹی کہا جاتا تھا پانی کے قریب بیٹھ کر دستر خوان سے روٹی نکال کر کھا لی جاتی اور دستر خوان اگلے دن کے لیے سنبھال کر رکھ لیتا اور گھنٹی بجنے پر پھر کلاس میں حاضر ہو جاتا۔ چھٹی ہونے پر بستہ اٹھاتا اور گھر کو روانہ ہو جاتا۔ نہ سردی کی پرواہ نہ گرمی کی فکر۔ روزانہ یہ سفر جاری رہتا۔

اگلی کلاسوں میں چلے جانے پر سائیکل بھی سواری کے لیے مل گیا۔ چنانچہ اب سکول آنے جانے کا سفر سائیکل پر طے ہونا شروع ہو گیا۔ سائیکل چلانا میں نے گاؤں میں تیسری جماعت میں سیکھ لیا تھا جو زندگانی بھر کام آیا۔

سجانپور کا سفر

مجھے اپنے سکول کی طرف سے دو بار سکاؤٹ کیمپ میں شمولیت کے لیے بھیجا گیا۔ پہلی دفعہ تو ہم چار لڑکے تھے۔ بٹالہ سے پٹھانکوٹ جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر پٹھانکوٹ ریلوے سٹیشن پر اترنا تھا۔ یہاں سے بذریعہ تانگہ سجانپور جانا تھا۔ گاڑی سے اتر کر تانگہ میں سامان از قسم بستر وغیرہ رکھا اور سجانپور سکاؤٹ کیمپ گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ وہاں اپنا خیمہ تیار کر کے نصب کیا اور اس میں رہائش اختیار کر لی۔ اور ایک ہفتہ کے قریب سکاؤٹ پریڈ اور پروگراموں میں حصہ لیا۔

نوردین جو سکول کے بورڈنگ کا باورچی تھا، ہمراہ تھا اور تین وقت کا کھانا پکا کر دیتا تھا۔ اسی سفر میں مادھوپور ہیڈ ورکس کی بھی سکاؤٹ پروگرام کے مطابق سیر کی۔ جہاں سے قادیان اور علی وال والی نہروں کو جانے والی دو بڑی نہریں نکلتی ہیں اور ان کا پانی لاہور اور ساہیوال تک کے علاقوں کو اس وقت سیراب کرتا تھا۔ ہیڈ ورکس کا

انچارج ایک انگریز میجر اینڈرسن تھا۔

ریاست جموں کے کچھ حصہ کی بھی سیر کی۔ پہلی دفعہ پہاڑ پر بننے والے مکانات دیکھے۔ شام کو واپس کیمپ آ گئے۔ دوسری دفعہ سکول سے غالباً سات لڑکے شامل ہوئے جن میں مَیں بھی شامل تھا اور میرے کلاس فیلو سردار کلدیپ سنگھ اور پنڈت دیوان چند بھی شامل تھے۔ اس سال قادیان سے بھی اٹھارہ سکاؤٹس کا گروپ خوبصورت وردیوں میں ملبوس نیلی مائع دار پگڑیاں پہنے حضرت چوہدری علی محمد صاحب بی اے بی ٹی کی سرکردگی میں شامل ہوا۔ مجھے ان کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ بعض سے ملا بھی۔ ان میں سے بعض کے نام مجھے آج تک یاد ہیں۔

قادیان کے سکاؤٹس میں سے بعض کے نام

آج سالوں بعد بھی ان احمدی سکاؤٹس کا نظارہ مجھے نہیں بھولتا۔ بعض کے نام یہ ہیں۔

۱۔ محمد حنیف عرف ہیرو مرحوم

۲۔ جلال موٹا۔ اس سے پاکستان بننے کے بعد دوبار ملاقات بھی ہوئی ہے۔

۳۔ محمد یحیٰ سرساوی۔ یہ رات کے کیمپ فائر میں کشکول پکڑ کر سادھو بنا تھا۔ یہ ڈاکٹر محمد احمد صاحب سرساوی کا بھائی تھا۔

۴۔ مسعود طوطی ۵۔ عبدالحمید ۶۔ محمود باجوہ

یہ گروپ خصوصی شان اور امتیازات رکھتا تھا۔ مثلاً یہ اپنے طور پر نماز با جماعت ادا کرتے تھے جو سارے کیمپ میں نرالی بات تھی۔ باقی پروگراموں میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اختتام کیمپ پر سب نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا اور اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

یونہی ماہ وسال گزرتے گزرتے 1947 کا سال آ گیا۔اس سال ہمیں فروری میں مڈل کے امتحان کے لیے ڈیرہ بابا نانک جانا تھا۔امتحان دے کر 10/11 فروری کو واپس اپنے اپنے گاؤں آ گئے۔سکول سے اب ہمیں چھٹیاں تھیں۔گاؤں آئے چند روز ہوئے تھے کہ والد صاحب مجھے ہمراہ لے کر قادیان حاضر ہوئے اور(بیت) مبارک میں نماز مغرب کے بعد حضرت مصلح موعود کے حضور پیش کر کے عرض کیا کہ حضور اس نے مڈل کا امتحان دے لیا ہے اور میں نے اسے وقف کیا ہوا ہے۔حضور نے فرمایا: نتیجہ نکلنے کے بعد لے کر آئیں۔چنانچہ واپس گاؤں آ گئے۔

قادیان سے واپسی کے بعد میں نے ورزش شروع کر دی۔گھر سے بیٹھک الگ تھی۔وہاں مالش کر کے ڈنڈ اور بیٹھک لگاتا۔آہستہ آہستہ روزانہ کی ورزش پانچ صد پچاس بیٹھک اور سوا سو ڈنڈ لگانے شروع کر دیے۔پی ٹی ایکسر سائز اس کے علاوہ تھیں۔ورزش کے بعد غسل کرتا اور پھر لسی اور مکھن کھاتا۔گھر میں بھینس کا دودھ،مکھن اور گھی میسر تھا۔خوب مزے اڑائے اور جسم بھی خاصہ مضبوط ہو گیا کہ اتنے میں امتحان کا نتیجہ نکل آیا۔میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔نمبر تو اس وقت مجھے یاد نہیں۔

غالباً شروع اپریل میں والد صاحب پھر قادیان لے گئے۔حضور کی خدمت میں باریابی پر حضور نے فرمایا: اسے مدرسہ احمدیہ میں داخل کروا دو۔چنانچہ میرے چھوٹے بہنوئی فیض احمد صاحب نے مجھے مدرسہ احمدیہ میں داخل کروا دیا۔اب ہوسٹل کی رہائش اور لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں کھانا شروع ہو گیا۔تینوں وقت گھی لگا کر روٹی کھانے والے کو اب خشک روٹی دال کے ساتھ کھانا پڑی تو بہت مشکل لگا لیکن بہر حال یہاں رہنا تھا۔اتنے میں روزے آ گئے اور اسی خشک کھانے سے روزے رکھنے شروع کر دیے۔گرمی کا موسم تھا۔چند روز بعد کانوں سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا۔

دوسری طرف آزادی ہندوستان کی تحریک زوروں پر تھی۔ملک خطرات سے

دوچار ہوا چاہتا تھا۔ حضور نے تہجد پڑھنے اور دعائیں کرنے کی تحریک فرمائی۔ دل میں تہجد پڑھنے کی شدید خواہش ہوئی۔ میرے پاس کوئی گھڑی بھی نہیں تھی۔ دعا کی کہ تہجد کے لیے اٹھ کر وضو کے لیے جاؤں تو مینار کی گھڑی پر ٹن ٹن تین بجیں۔ بعینہٖ ایسا ہوا، وضو کیا اور تہجد ادا کی۔ ہوسٹل کی زندگی بڑی منظّم تھی۔ نماز کے لیے پہلے ایک گھنٹی بجتی تھی تو فوراً وضو کر کے لائن میں کھڑا ہونا ہوتا۔ دوسری گھنٹی بجنے پر لائن میں (بیت) اقصیٰ یا (بیت) مبارک جانا ہوتا۔ نماز کے بعد (بیت الذکر) کے باہر پھر لائن میں کھڑے ہو کر حاضری دینی ہوتی۔ پانچوں نمازوں میں یہ طریق قائم تھا۔ اگر کوئی لائن میں غیر حاضر ہوتا تو وہ نماز میں غیر حاضر شمار کیا جاتا جسے رات کی اجتماعی حاضری کے وقت سپرنٹنڈنٹ صاحب ہوسٹل سزا دیتے اور کمروں کے مانیٹر اپنے اپنے کمرے کی پانچ نمازوں کی حاضری پیش کرتے۔ حضرت مصلح موعود مغرب وعشاء کی نماز (بیت) مبارک میں پڑھاتے تھے اور مغرب کی نماز کے بعد دیر تک مجلسِ علم وعرفان جاری رہتی اور پھر حضور عشاء کی نماز کے لیے (ندا) دینے کا ارشاد فرماتے۔ ان مجالس عرفان میں شمولیت قلب وروح میں ایک سرور، وجد اور قوت عمل پیدا کرتی تھی۔ مدرسہ احمدیہ کے ایک طالب علم سلطان محمود صاحب جو ضلع رحیم یار خان کے رہنے والے تھے (بیت الذکر) کے بائیں طرف کھڑے ہو کر نہایت خوش الحانی سے (ندا) دیتے جو میرے لیے ایک سرمایۂ حیات سے کم نہ تھی۔ قادیاں میں قیام کے ان ایام میں مَیں نے اپنے اندر زبردست تبدیلی محسوس کی۔ مجھے نمازوں اور دعاؤں میں ایک کیف اور لطف آنے لگا جسے میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

قادیان کی پر کیف فضاؤں میں شب وروز بسر ہو رہے تھے۔ حضور نے ایک جمعہ کے خطبہ میں بڑے عمدہ طریق سے سمجھایا کہ آپ لوگوں کی شکلیں اسلامی ہونی چاہئیں۔ اگلے روز حجاموں کی دوکانوں پر انگریزی طرز کے کٹے ہوئے بالوں کے

ڈھیر لگ گئے۔حضور کی زبان مبارک سے جب بھی کوئی بات نکلتی تو احباب اسے اچک کر لے لیتے اور اس پر عمل پیرا ہو جاتے۔قادیان کے شب و روز کی مثالیں غیر از جماعت بھی دے چکے ہیں۔ ہر گھر سے تلاوت قرآن کریم کی آواز علی الصبح بلند ہوتی ہوئی ایک عجب روحانی کیف پیدا کرتی تھی۔اس ماحول نے میرے جیسے دیہاتی اجڈ کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا۔اب تہجد کی ادائیگی کی خواہش اور نمازوں میں توجہ میسر تھی جس کا پہلے مجھ میں نام ونشان بھی نہ تھا۔قادیان آنے سے قبل پانچ نمازوں کا بھی پابند نہ تھا۔الغرض اس وقت کے ماحول اور کیفیت کو بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

قادیان میں (رفقاء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وجود باجود

قادیان میں اُس وقت بہت سے (رفقاء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام بقیدِ حیات تھے۔ان کی روحانی تاثیرات بھی قادیان پر سایہ فگن تھیں۔حضرت اماں جان (اللہ آپ سے راضی ہو) بھی حیات تھیں۔ان سب کے روحانی اثرات اہلِ قادیان کو اپنے جلو میں لیے ہوئے تھے۔حضرت مولوی شیر علی صاحب کو بارہا دیکھا، رستے میں پہلے سلام کی کوشش کی لیکن ہر بار وہ سبقت لے گئے۔ان کے خطبات بھی سنے ہیں۔حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کا بابرکت وجود اپنی برکات کے ساتھ موجود تھا۔الغرض اس پیارے اور بابرکت ماحول کو کسی صاحب حال کے علاوہ کوئی دوسرا محسوس نہیں کرسکتا۔

یہاں ضمناً میں ان (رفقاء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اسماء گرامی بھی درج کرنا چاہتا ہوں جن کو دیکھنے کی سعادت مجھے ملی۔(اللہ ان سب سے راضی ہو)

۱۔حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ

۲۔حضرت اماں جان سیدہ نصرت جہاں بیگم صاحبہ

۳۔حضرت مرزا بشیر احمد صاحب ایم۔اے

۴۔حضرت مرزا شریف احمد صاحب

۵۔حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری صاحب

۶۔حضرت محمد عبداللہ بوتالوی صاحب

۷۔حضرت شیر محمد صاحب خیاط ربوہ

۸۔حضرت روشن دین صاحب زرگر

۹۔حضرت ماسٹر محمد پریل صاحب کنڈیارو

۱۰۔حضرت مولوی عطاء اللہ صاحب جماپور

۱۱۔حضرت بابا جان محمد صاحب کنزی

۱۲۔حضرت بابا رحمت علی صاحب کرونڈی

۱۳۔حضرت عمر دین صاحب کرونڈی

۱۴۔حضرت چوہدری علی محمد صاحب گوٹھ علی محمد

۱۵۔حضرت بے بے جی والدہ محترم ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب مرحوم نوابشاہ (جو راہِ مولا میں قربان ہوئے تھے)

۱۶۔حضرت قاضی ملک محمد عبداللہ صاحب والد ملک مبارک احمد صاحب

۱۷۔حضرت بابا حسن محمد صاحب

۱۸۔حضرت شیخ محمد حسین صاحب لاہور کا چھو پورہ

۱۹۔حضرت میاں عزیز احمد صاحب

۲۰۔حضرت چوہدری فتح الدین باجوہ صاحب گمبٹ

۲۱۔حضرت............کاٹھ گڑھی صاحب

۲۲۔حضرت مولوی جلال دین صاحب لودھی ننگل

۲۳۔حضرت خالہ آمنہ صاحبہ بنت نانا اللہ دتہ صاحب

۲۴۔والد اقبال وشریف صاحب پیر کوٹی۔نام یاد نہیں

۲۵۔والدہ اقبال وشریف صاحب پیر کوٹی

۲۶۔حضرت قاضی محمد یوسف صاحب پشاوری

۲۷۔حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی

۲۸۔حضرت مولانا محمد حسین صاحب سبز پگڑی والے

۲۹۔حضرت بابا فضل محمد صاحب ہرسیاں والے

۳۰۔حضرت چوہدری فتح محمد صاحب سیال

۳۱۔حضرت حکیم محمد حسین صاحب مرہم عیسیٰ

۳۲۔حضرت مولوی غلام رسول خاں صاحب شیر فروش والد عبدالکریم افغان

۳۳۔حضرت بابا شیر محمد صاحب سٹیشنری فروش قادیان

۳۴۔حضرت بھائی محمود احمد صاحب ڈسپنسر

۳۵۔حضرت حاجی محمد دین صاحب درویش ساکن تہال

۳۶۔حضرت حافظ محمد رمضان صاحب

۳۷۔حضرت اللہ دتہ صاحب چک سکندر

۳۸۔حضرت میاں مولا بخش صاحب ساکن رعیہ تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر

۳۹۔حضرت میاں اللہ بخش صاحب ساکن رعیہ تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر

۴۰۔حضرت مولوی صدر دین صاحب درویش قادیان

۴۱۔حضرت چوہدری علی محمد صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی قادیان

۴۲۔حضرت مولوی محمد عثمان صاحب ڈیرہ غازی خان۔امیر ضلع رہے ہیں۔

۴۳۔حضرت صوفی محمد رفیع صاحب سکھر۔امیر جماعتہائے خیر پور ڈویژن سکھر

۴۴۔حضرت بابا چوہدری غلام محمد صاحب ساکن پولہ مہاراں

۴۵۔حضرت مولوی خیر دین صاحب ساکن بدوملہی

۴۶۔حضرت حاجی خدا بخش صاحب میاں خانوالی

۴۷۔حضرت مولوی قدرت اللہ سنوری صاحب

۴۸۔حضرت قاضی محمد عبداللہ صاحب

۴۹۔حضرت محمد ظہور الدین اکمل صاحب

۵۰۔حضرت شیخ یعقوب علی عرفانی صاحب

۵۱۔حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب جٹ

۵۲۔حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی

۵۳۔حضرت بھائی عبدالرحیم صاحب (جگت سنگھ)

۵۴۔حضرت ماسٹر عبدالرحمٰن صاحب (ہرسنگھ)

قادیان میں میرے کلاس فیلوز

پینسٹھ (65) کے قریب لڑکے اس سال مدرسہ احمدیہ کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ سب کے نام تو مجھے یاد نہیں البتہ چند ایک معروف ہم جماعت احباب جنہیں تعلیم کے بعد خدمات سلسلہ کی توفیق ملی۔ ان میں

سید کمال یوسف صاحب جو حضرت سیدہ ام وسیم صاحبہ کے بھتیجے ہیں اور تکمیل تعلیم کے بعد سکینڈے نیوین ممالک میں (دعوت الی اللہ) کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

عبدالحکیم اکمل صاحب۔ شاہد کے بعد ہالینڈ میں بطور (مربی) بھیجے گئے۔

عبدالباسط صاحب شاہد۔ انہیں اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان افریقہ کے بعض ممالک میں خدمت کی سعادت حاصل ہوئی اور اب انگلستان میں ناظم

دارالقضاء ہیں۔

صاحبزادہ مرزا حنیف احمد صاحب (مرحوم) بھی قادیان میں میرے ہم جماعت تھے اور پاکستان میں احمد نگر میں بھی ہم باہم کلاس فیلو رہے ہیں۔

محموداحمد مختار میرپوری صاحب۔نہایت ذہین تھے۔مولوی فاضل میں پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔

راجہ نذیر احمد صاحب بھی بعد میں وقف سے علیحدہ ہوگئے۔مگر اپنے طور پر جماعتی خدمات بجالاتے رہے۔راجہ صاحب کے ساتھ خاکسار کی دوستی بھی تھی۔وہ ہمارے گاؤں ملہو کے تحصیل نارووال بھی آئے تھے۔

اس کے علاوہ محمد شریف خالد صاحب، عبدالرشید عابد صاحب، قاضی محمد احمد صاحب، نذیر احمد صاحب حیدر آبادی، مکرم خان صاحب، ظفر احمد صاحب اور محمد رفیق صاحب تھے۔یہ احباب پاکستان بننے کے بعد گردشِ روزگار کے باعث خدمات سلسلہ سے وقف کی صورت میں محروم رہے البتہ مقبول احمد صاحب ذبیح کو اندرون و بیرون پاکستان خدمت کی سعادت حاصل ہوئی جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

قادیان میں اساتذہ کرام

مدرسہ احمدیہ میں جن اساتذہ کرام سے فیض حاصل کرنے کی سعادت ملی ان کے اسماءگرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔مدرسہ احمدیہ کے ہیڈ ماسٹر حضرت ماسٹر عبدالرحمٰن عرف جٹ صاحب

۲۔مولانا محمد شریف امینی صاحب

۳۔مولانا محمود سکندر صاحب فاضل۔قادیان میں ہی وفات پا گئے تھے۔

۴۔چوہدری غلام حیدر صاحب بی اے بی ٹی۔سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل

۵۔مولوی محمد حفیظ صاحب بقاپوری

سارے اساتذہ علم وفضل،خلوص، زہد وتقویٰ اور ہمدردی طلباء میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ان میں سے ماسٹر غلام حیدر صاحب کے علاوہ سب کو تقسیم ہند کے بعد درویشان دیار مسیح ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔

تقسیم ملک اور پاکستان آمد

تعلیم جاری تھی کہ آزادی ہندوستان اور تقسیم ملک کے پروگرام پر ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ چنانچہ تعلیمی ادارے موسم گرما کی تعطیلات کے لیے بند کر دیے گئے۔ مدرسہ احمدیہ بھی بند ہو گیا۔طلباء اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ میں بھی گاؤں آ گیا۔

گھر آ کر بھی امن وسکون نہ ملا۔علاقہ میں روزانہ سکھوں کے حملوں سے بدامنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔تقسیم کا ابھی اعلان نہ ہوا تھا۔چنانچہ والد صاحب اور بھائیوں نے باہم مشورہ سے اپنے گھر کے کچھ افراد کو قادیان بھیج دینے کی تجویز کی اور ایک روز کئی افراد پر مشتمل یہ قافلہ قادیان جانے کے لیے بٹالہ کو روانہ ہوا کیونکہ بٹالہ سے ریل گاڑی قادیان جاتی تھی۔جب بٹالہ سے کوئی دو میل قبل گاؤں مولا سنہیا پہنچے تو یکدم مسافروں میں ہل چل سی مچی اور شور ہوا کہ سکھوں کا جتھہ آ گیا ہے۔جو مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔جتھے سے تھوڑے فاصلہ پر فیض آباد مسلمانوں کا گاؤں تھا۔انہوں نے ان پر فائر کھول دیا جس سے گھوڑوں پر سوار یہ سکھ حملہ آور بھاگ گئے۔ہمیں سکھوں کی چمکتی تلواریں اور ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ہم لوگ بٹالہ سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ مختلف دیہات سے آنے والے جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی تھیں۔بٹالہ سٹیشن آ کر معلوم ہوا کہ ریل بند ہو گئی ہے۔چنانچہ سٹیشن پر ہی پڑے

رہے۔اگلے روز گاؤں سے جو یہاں سے نو میل کے فاصلہ پر تھا والد صاحب اور تایا زاد بھائی تین چار روز تک روزانہ ہمیں گاؤں سے بٹالہ سٹیشن پر کھانا پہنچاتے رہے۔غالباً تین چار روز ہمیں سٹیشن پر گزر گئے۔قادیان بھی اطلاع ہوئی تو انہوں نے پہلے عورتوں اور بچوں کو وہاں سے نکالا اور ایک ٹرک میں سوار کرا کر لے گئے۔

بٹالہ میں دن بھر کرفیو لگا رہتا تھا۔شام غروب آفتاب سے پہلے کرفیو میں وقفہ دیا جاتا تھا۔بٹالہ میں کافی احمدی احباب جمع تھے۔کچھ اپنے اپنے علاقوں سے حفاظت مرکز کے لیے بھی تشریف لائے تھے۔کرفیو کے وقفہ میں سب احباب نے پیدل قادیان جانے کی ٹھانی۔ابھی نصف کے قریب فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ہندو ملٹری آ گئی اور ہمیں روک کر لائن میں کھڑا کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ ان کے گولی چلانے سے لمحہ بھر پہلے قادیان سے ریٹائرڈ فوجی اپنی وردیوں میں ملبوس جو ہندو ملٹری کے آفیسر سے زیادہ رینک کے تھے پہنچ گئے اور انہوں نے ان ہندو ملٹری والوں کو روکا اور کہا کہ یہ شریف آدمی ہیں، قادیان جا رہے ہیں۔چنانچہ ہندو ملٹری نے اپنی راہ لی اور اہل قافلہ بخیریت رات اندھیرے میں قادیان پہنچ گئے اور قدرے سکھ کا سانس لیا۔

قادیان میں والد صاحب اور بھائی کمال الدین نے پہلے سے دو الگ الگ مکان بنائے ہوئے تھے۔بھائی کے مکان میں ایک احمدی گھرانہ کرائے پر رہتا تھا۔اہلِ خانہ کا نام محمد اسماعیل کاتب تھا۔ہمارے والے مکان میں بھی ایک گھرانہ کرایہ دار تھا جس نے جلد ہی مکان خالی کر دیا اور ہم اپنے اپنے گھروں میں بے سرو سامانی کی حالت میں رہنے لگے۔گرمیوں کا موسم تھا۔بستر وغیرہ بھی میسر نہ تھے۔زمین پر ہی سونا پڑتا تھا۔یہ اغلباً جون کے آخر یا جولائی کے ابتداء کی بات ہے۔آخر چودہ اگست کو آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور سراسر ظلم کی راہ سے مسلم اکثریت کا ضلع گورداسپور ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔18 اگست کو عید تھی۔اس پر حضور کو

خطبہ کے لیے لاؤڈ سپیکر کی اجازت نہیں دی گئی۔

والد صاحب گاؤں سے ہمارے ساتھ عید کرنے کے لیے قادیان آ گئے۔ بھائی محمد ابراہیم بھی ہمراہ تھے۔عید کے اگلے روز بھائی، والد صاحب اور ایک دو اور افراد گاؤں جانے کے لیے پیدل ہی قادیان سے چل پڑے۔ چلتے چلتے یہ لوگ جب گاؤں سے چند میل دور گاؤں بھاگوالہ ایک نہر کے پل پر پہنچے تو مسلح سکھ حملہ کے لیے تیار کھڑے تھے۔اتنے میں والد صاحب کے واقف کار ایک سکھ نے والد صاحب سے کہا۔میاں صاحب ہیں کیا؟ والد صاحب نے ہاں میں جواب دیا تو اس سکھ میں والد صاحب کا احترام جاگ پڑا۔اس نے ان سکھوں سے کہا کہ راستہ چھوڑ دو یہ میاں جی ہیں اور ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا کہ میاں جی آپ دیکھ نہیں رہے کیسی آگ لگی ہوئی ہے اور آپ سفر کر رہے ہیں۔

خیر یہ چار افراد کا قافلہ بخیریت گاؤں پہنچ گیا اور والد صاحب نے گاؤں کے شرفاء کو اکٹھا کر کے ان پر صورتحال واضح کی کہ اب یہاں رہنا موت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ بہتر ہے گاؤں خالی کر کے ڈیرہ بابا نانک کے راستہ سیالکوٹ جو پاکستان میں آ چکا ہے اس میں داخل ہو جائیں۔ڈیرہ بابا نانک سے سے تھوڑے فاصلے پر دریائے راوی ہندوستان اور پاکستان میں حدِ فاصل قرار پا گیا تھا۔ یہاں دریا پر ریل اور سڑک کا پل بنا ہوا تھا جس پر سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

گاؤں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اور آبادی کافی تھی۔ایک دو گھر سکھوں کے اور چند گھر ہندوؤں کے تھے۔لوگ بڑے دلیر اور نڈر تھے،لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔اردگرد کے دیہات کے لوگ ہمارے گاؤں کے لوگوں سے خوف کھاتے تھے۔گاؤں کے لوگوں کے اتحاد کے متعلق مشہور تھا کہ کھانے پینے کے لیے الگ ،لڑنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔گاؤں میں تین مساجد تھیں وہ بھی آباد

تھیں۔ چند افراد معروف ڈاکو، بعض پہلوان اور بعض کبڈی کے کھلاڑی تھے اس لیے اردگرد کے لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ والد صاحب کی بات سن کر سب نے اس پر عمل کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ چنانچہ 22 اگست کی صبح صبح سارے گاؤں والے بشمول قریب کے چھوٹے گاؤں والے اور کالا افغاناں جیسے کثیر آبادی والے گاؤں کے سب لوگ جو اٹھایا جا سکا، اٹھا کر چل پڑے اور 22 اگست 1947ء کو شام تک پاکستان میں داخل ہو گئے۔ یہاں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دریائے راوی حائل تھا اس پر ریل اور سڑک کا پل تھا۔ اس پر سے چل کر دریا عبور کیا جاتا تھا۔

23 اگست کو بھی قافلے خیریت سے گزرے لیکن 24 اگست کو پل پر گولی چلنی شروع ہو گئی اور دونوں طرف کے مسافر مارے جانے لگے۔ میرا نصف خاندان تو قادیان تھا باقی نصف جو پاکستان پہنچا ان میں سے بعض افراد کے موضع باٹھاں والا کچھ عزیز تھے ان کے ہاں چھوڑا اور بھائی کمال الدین صاحب لاہور قادیان سے آنے والوں کو دیکھنے چلے گئے۔

ادھر قادیان کے اردگرد فسادات زوروں پر تھے۔ ہر روز قادیان میں پناہ گزینوں کا جم غفیر آ رہا تھا۔ کچھ لوگ بٹروں والی سڑک کے ساتھ ساتھ کھلے میدان میں پڑے تھے۔ سکھ آئے روز، دن دہاڑے ان کے مویشی اور مال لوٹ کر لے جاتے تھے۔ ہندو ملٹری بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ پولیس بھی ان لوٹ مار کرنے والوں کی معاون تھی۔ ان حالات میں ہم یہاں رہ رہے تھے۔ قریب ہی حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب کا گھر تھا، ان کے پاس ریڈیو تھا، روزانہ ہی خبریں سننے ان کے گھر کے باہر چلے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد والد صاحب بھی پاکستان میں میرے بھائیوں سے یہ کہہ کر لاہور سے قادیان جانے والے ٹرک میں بیٹھ کر قادیان پہنچ گئے کہ میرا اکلوتا بیٹا قادیان میں ہے وہ آ جائے گا تو میں بھی آ جاؤں گا۔ ورنہ میں نے

پاکستان آ کر کیا کرنا ہے۔میری دونوں بہنیں اور سوتیلی والدہ اور ان کا بھائی بھی قادیان میں تھے۔ لاہور سے قادیان ٹرکوں کا آنا جانا رہتا تھا۔بعض فوجی اپنے عزیزوں کو لینے کے لیے فوج سے ٹرک لے کر جاتے تھے۔ میں روزانہ جہاں سے ٹرک روانہ ہوتے تھے کسی موہوم امید پر وہاں گھومتا رہتا تھا۔ایک دن کیا دیکھا کہ ایک ٹرک پر چوہدری محمد صدیق صاحب فوڈ انسپکٹر جو احمدی نہیں تھے لیکن انہوں نے خریداری گندم میں ان دنوں بہت تعاون کیا تھا اور یہ میرے گاؤں کے قریبی گاؤں ڈالے چک کے رہنے والے تھے۔میرے والد صاحب کے بھی خوب واقف تھے اور میرے ساتھ بھی ان کی واقفیت تھی ،ایک ٹرک میں سوار ہیں۔میں ان کے قریب گیا تو انہوں نے مجھے بھی ٹرک میں سوار کرلیا اور کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ٹرک سامان سے بھرا ہوا تھا اور اس میں صرف کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔چنانچہ رات کو بخیر وخوبی پاکستان لاہور جودھامل بلڈنگ پہنچ گیا۔کسی قسم کا سامان پاس نہ تھا۔اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ پاکستان میں پہلی رات کیسے بسر کی۔

راولپنڈی سے پناہ گزینوں کو لانے کے لیے کچھ پرائیویٹ بسیں قادیان گئی ہوئی تھیں۔ان میں میری سوتیلی والدہ اور برادری کی دو جوان غیر احمدی لڑکیاں،جن کو ان کے ماں باپ نے ہمارے ساتھ قادیان بھیج دیا تھا وہ بھی پاکستان جودھامل بلڈنگ پہنچ گئیں اور وہ مجھے مل گئیں۔تھوڑی دیر بعد بھائی کمال الدین صاحب جو ہمیں تلاش کرنے لاہور آئے ہوئے تھے وہ جودھامل بلڈنگ پہنچ گئے اور ہمیں مل گئے۔ ایک دفعہ پھر زندہ وسلامت ملنے پر بے حد خوشی ہوئی۔

ایک نہایت اہم ذکر جو کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قادیان کے لیل ونہار اور ملکی فسادات کو حضور انور نے بخوبی بھانپ لیا تھا۔اس لیے آپ نے قادیان سے ہجرت کرنے کا پروگرام بنالیا جس کی تمام تر تفصیلات تاریخ احمدیت میں موجود ہیں۔یہاں

یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ اگر حضور ہجرت کر کے لاہور نہ قیام فرماتے تو قادیان کی آبادی کے انخلا میں جو آپ کے حسنِ تدبیر سے عمدہ طور پر عمل میں آئی، انتہائی مشکلات پیش آتیں۔ بلکہ بہت سی جانوں کے تلف ہونے کا امکان تھا۔ چنانچہ پہلے تو حضور نے فوجی ملازمین کو ٹرک لے جا کر محصورین کو لانے کی تحریک کی۔ اس سے بھی کافی لوگ پاکستان پہنچے۔ حضور 31 اگست کو سوا ایک بجے دوپہر قادیان سے روانہ ہو کر لاہور تشریف لے آئے۔

حضور کے تشریف لے آنے کے بعد فسادات میں تیزی آ گئی۔ قادیان پر سکھوں نے براہِ راست حملہ 13 اکتوبر 1947ء کو کیا۔ 11 اکتوبر کو اٹھارہ ٹرکوں کا قافلہ قادیان پناہ گزینوں کے لیے بھیجا گیا اور بارہ اکتوبر کو پھر بہتر ٹرکوں کا قافلہ بھیجا گیا جس میں قادیان کے اکثر محصورین پاکستان لائے گئے۔ میرے زیادہ تر عزیز بھی اسی قافلہ میں آئے اور عزیزم مسعود احمد جو میرا بھتیجا بھی ہے اور ہم عمر دوست بھی، وہ بھی ان بہتر ٹرکوں کے قافلہ میں پاکستان آیا۔ اس سے دو روز بعد والد صاحب کو بھی کسی ٹرک میں پاکستان آنے کا موقع مل گیا۔ اس طرح ہم اکٹھے ہو گئے۔

مصائب کے ان سمندروں کو عبور کرتے ہوئے افرادِ خاندان اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ وسلامت پاکستان پہنچ گئے اور اس امید پر کہ ضلع گورداسپور پھر پاکستان میں آئے گا حضرت مصلح موعود کے حکم کے تحت ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ملہو کے (اس وقت) تحصیل نارووال میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں میں اکثر آبادی سکھوں کی تھی۔ جن کو قتل بھی کیا گیا اور ان کے گھروں کو بھی آگ لگا دی گئی۔ بعض مکان جو جلنے اور گرنے سے بچے ہوئے تھے ان پر مقامی مسلمانوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ہم لوگوں کو ایک گوردوارہ میں پناہ لینی پڑی جس میں ایک چھوٹی کوٹھڑی تھی اور ایک کافی لمبا کمرہ تھا۔ زمین پر سوتے تھے، کھانے کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ متروکہ اموال مقامی لوگوں

نے اپنے سمجھ کر قبضہ کر رکھے تھے۔ ہماری کوئی دادِفریاد نہ تھی۔ کچھ بستر اور برتن ملے جو تقسیم کر لیے گئے۔ قریبی گاؤں راؤکے میں ایک زمیندار احمدی گھرانہ تھا۔ اس گھر کے سربراہ کا نام حاجی بلند بخش تھا جو مخلص احمدی تھا۔ اس نے ہماری ہر طرح مدد کی۔

وسط نومبر میں محترم مولوی عبدالحق صاحب نور جو ہمیں یہاں آباد کر رہے تھے ان کی اور ان کے بھائیوں کی زمین بھی یہاں الاٹ کرائی گئی اور ہمیں بھی فی خاندان سات ایکڑ زمین الاٹ کی گئی۔ مولوی عبدالحق صاحب نور اور ان کا خاندان تقسیم ملک سے بہت پہلے سے سندھ میں آباد تھا۔ اس وقت کرونڈی ریاست خیر پور میں تین چار صد ایکڑ زمین ٹھیکہ پر لے کر کاشت کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے واپس سندھ جانا چاہا۔ میری بڑی ہمشیرہ کے سسرال تحصیل گمبٹ ریاست خیر پور میں زمین ٹھیکہ پر لے کر کاشت کر رہے تھے۔ ہمشیرہ کے خاوند واقف زندگی تھے اور اب قادیان میں تھے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ہمشیرہ کو ان کے سسرال پہنچایا جائے۔ چنانچہ ہمشیرہ، مولوی عبدالحق صاحب نور اور میں سندھ جانے کے لیے لاہور پہنچ گئے اور اغلباً 14 نومبر کو کراچی جانے والی ایک پیسنجر ٹرین کی چھت پر سوار ہو گئے کیونکہ اندر تو تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دو دن اور ایک رات کے سفر کے بعد ہم بھریا روڈ سٹیشن پر اترے۔ ہمارے ساتھ ایک حادثہ یہ ہوا کہ ہمشیرہ کا زیورات اور کپڑوں والا بکس چھت سے اترنے والا کوئی مسافر لے گیا جس سے ہمشیرہ بہت پریشان ہوئیں۔ بھریا روڈ سے اونٹ پر سوار ہو کر کرونڈی پہنچے۔ وہاں مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالمجید صاحب کے ساتھ میرے تایا زاد بھائی کی بیٹی صفیہ بیاہی ہوئی تھی۔ ان کے ہاں قیام کیا۔ تمام اہل خانہ نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ کچھ دن بعد مولوی صاحب مجھے اور ہمشیرہ کو ہمشیرہ کے سسرال ایک جنگل بیابان میں آباد ایک بستی چھوڑ آئے جہاں ہمشیرہ کے سسرال والے بستے تھے۔ نومبر کا مہینہ تھا، کئی ایکڑ پر کماد کی فصل

کاشت تھی جس کو سب نے مل کر سنبھالنا تھا چنانچہ میں بھی بیلنا چلانے میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن چھیلی کرتے تھے اور دوسرے دن گنے بیلنے پر سٹاک کر کے بیلوں کے ساتھ ان کا رس نکال کر بڑے کڑاہ میں ڈال کر اس کے نیچے آگ جلاتے اور رس پکنے پر معروف طریق سے اس کا گُڑ بناتے۔ اسی طرح کوئی دو ہفتے کا عرصہ گزر گیا۔ مجھے پھر کرونڈی جانے کی خواہش ہوئی تو میں کچھ دن کے لیے پھر کمبٹ سے ریل میں سوار ہو کر بھریا روڈ اور وہاں سے کرونڈی چلا گیا۔

کرونڈی میں بھائی عبداللہ کا بیٹا اسماعیل مل گیا۔ اس کے ساتھ مل کر مولوی عبدالمجید صاحب کے حصہ کی زمین میں ہم دونوں نے گندم کی بوائی کی۔ وہاں سے کچھ روز بعد کمبٹ کے لیے کمر باندھی۔ کرونڈی سے بھریا روڈ کا سفر پیدل طے کیا۔ راستہ بھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سندھیوں کے کتے گھیر لیتے اور بڑی مشکل سے جان چھڑانی پڑتی۔ کتوں سے تنگ آ کر ایک اونٹ والے کو کہا کہ کرایہ لے کر بھریا روڈ چھوڑ دو۔ اس نے اونٹ کو تازہ تازہ نکیل ڈالی تھی جس سے وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ خیر خدا خدا کر کے بھریا روڈ پہنچا۔ گاڑی لیٹ تھی اور یہ وہ گاڑی تھی جو روزانہ لاہور سے کراچی کے درمیان چلتی تھی۔ شام کمبٹ پہنچا وہاں سے تین چار میل آگے جانا تھا۔ اندھیرا ہو گیا اور پھر کتوں سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ کیونکہ جنگل میں لوگ حفاظت کے لیے کتے بہت رکھتے تھے۔ خدا خدا کر کے رات کو خیریت سے آپا کے سسرال کی بستی پہنچا۔ معلوم ہوا کہ آپ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ اب دسمبر گزر رہا تھا۔ ابا جان کا خط ملا کہ آپ کا جامعہ کھل گیا ہے بلا تاخیر چلے آئیں۔ میرے والد میرے وقف کے بارہ میں بہت حساس تھے۔ اگرچہ ملکی حالات دگرگوں ہو چکے تھے اور سب کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے لیکن میرے والد میرے اکلوتے ہونے اور معاشی حالات خراب ہونے کے باوجود میرے وقف پر کسی سمجھوتے کے روادار نہ تھے۔ چنانچہ کمبٹ

سے ریل پر سوار ہو کر ایک دو روز میں لاہور پہنچ گیا۔ والد صاحب لاہور منتظر تھے۔ انہوں نے کہا کہ جامعہ چنیوٹ میں کھلا ہے چلو آپ کو چھوڑ آؤں۔ اس وقت لاہور سے سرگودھا تک بس چلتی تھی لیکن تیل کی بجائے گیس پلانٹ سے۔ سرائے سلطان جو لاہور سٹیشن کے قریب ہی بس اڈہ تھا، پہنچے تو ڈیرہ غازی خان کے کچھ طلباء جن کو میں جانتا تھا وہ بھی چنیوٹ جا رہے تھے۔ میں نے ابا جان سے عرض کیا کہ میں ان طلباء کے ساتھ چلا جاتا ہوں آپ واپس چلے جائیں۔ چنانچہ ان طلباء کے ساتھ میں چنیوٹ پہنچ گیا۔

جامعہ کے شب و روز

جامعہ پہنچ کر دیکھا تو طلباء کی رہائش صدیوں پرانے چھوٹی اینٹ کے تاریک مکانوں میں تھی۔ جہاں چند دوسرے طلباء بھی مل گئے۔ مجھے آج یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے پاس کوئی پیسہ بھی تھا یا نہیں۔ بستر اور پہننے کے کپڑے بھی تھے یا نہیں۔ البتہ جو جوڑا پہنا ہوا تھا وہ تو تھا۔ یہاں کھانے کے لیے بڑے توے کی جسے پنجابی میں لوہ کہتے ہیں روٹی ملتی تھی جس میں مکئی اور گندم کا آٹا ملا ہوا تھا۔ چنانچہ لوہ پر روٹی دونوں طرف سے جل کر سیاہ ہو جاتی تھی اور اندر سے کچی رہتی تھی۔ سالن کے لیے مجھے یاد ہے کہ کالی گاجروں کا شوربہ دیا گیا۔ اسی طرح ایک روز جامعہ جانے سے پہلے کھچڑی ملی جس کی کیفیت یہ تھی کہ چاول صرف تیسرا حصہ پکا تھا دو حصے کچا تھا اور چنے کی دال کا تو کیا حال ہوگا خود اندازہ کر لیں۔ چنانچہ اس کھچڑی کو رکھ کر پڑھنے لگے۔ پڑھائی کے بعد کسی کے گھر سے سلور کی پرانی اور میلی سی دیگچی لے کر کھچڑی اس میں ڈالی اور پانی ملا کر کاغذوں کی آگ پر پکا کر کھائی۔ الغرض چنیوٹ میں حالات بہت کٹھن تھے۔ کچھ دن تک یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی سنی اور جامعہ احمدیہ

کے احمد نگر منتقل ہونے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ جہاں تک مجھے یاد ہے یکم جنوری 1948ء کو جامعہ احمد نگر منتقل ہوا تھا۔ ہم نے سامان ایک تانگے میں رکھا اور خود پیدل احمد نگر پہنچے۔

احمد نگر ایک گاؤں تھا جس میں ہندوؤں کے مکان جو وہ چھوڑ کر گئے تھے بالعموم پکے تھے لیکن عام مقامی لوگوں کے مکان کچے تھے۔ ان کا رہن سہن خصوصی طور پر مقامی لوگوں ہی کی طرح تھا۔ اکثر لوگ ماچھیوں سے روٹی تنور پر لگواتے تھے جو بڑے سائز کی ہوتی۔ بڑی نرم اور صاف ستھری جس پر پکنے کا کوئی سیاہ داغ بھی نہیں ہوتا تھا۔ لسی اور دودھ عام تھا لیکن یہ لوگ دودھ بیچنا سخت ناپسند کرتے تھے۔

طلباء جامعہ کی رہائش ان متروکہ حویلیوں میں تھی جن میں ہندو سکھ خود بھی رہتے تھے اور اپنے مویشی بھی باندھتے تھے۔ ہمیں گاؤں سے باہر مغرب میں رہنے کے لیے ایک کشادہ حویلی ملی جس میں چھوٹے بڑے کئی کمرے تھے۔ ان کمروں میں پرالی اور صفیں وغیرہ بچھا کر اوپر بستر بچھا لیے۔ حویلی میں کوئی بیت الخلاء نہیں تھا۔ صرف ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ حوائج ضروریہ کے لیے باہر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ ان ایام میں مہاجر طلباء کے پاس تو تن ڈھانپنے کے لیے صرف ایک ایک جوڑا تھا جس کو جمعہ کے دن باہر کنوؤں پر جا کر دھو کر پہن لیتے تھے۔ کپڑے استری کر کے پہننے کا تصور بھی نہیں تھا۔ کھانے کے لیے تنور کی ایک بڑی روٹی صبح اور ایک شام کو مل جاتی تھی۔ باورچی سے پکی ہوئی دال لینے کے لیے برتن لے کر لائن میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ بہرحال چنیوٹ کی نسبت حالات بہت بہتر ہو گئے تھے اور واقفین زندگی کا یہ ادارہ تقسیم ملک کے بعد پھر منظّم ہو کر اپنی منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔ الحمدللہ

ہوسٹل کے نظم و ضبط کے مطابق پہلے پہل تو غیر از جماعت لوگوں کی دو مساجد میں سے ایک میں ہم قادیان والے ڈسپلن کے تحت نماز کے لیے جاتے۔ قادیان کی ہی طرح رات کو نمازوں کی حاضری ہوتی۔ غیر حاضری پر بدنی سزا بھی ملتی۔ لیکن کچھ

عرصہ بعد غیر از جماعت احباب نے ہمیں اس مسجد میں نماز کی ادائیگی سے روک دیا۔ چنانچہ گاؤں کی دوسری مسجد میں نماز کی ادائیگی شروع کی گئی مگر کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے بھی معذرت کر لی۔ اس پر احمدی احباب جو طلباء جامعہ کے علاوہ ہوشیار پور، جالندھر وغیرہ کے اضلاع سے ہجرت کر کے آئے تھے اور یہاں آباد تھے، سب نے مل کر گاؤں کے وسط میں ایک خالی جگہ پر کچی (بیت الذکر) بنائی اور اس میں نمازیں پڑھنے لگ گئے۔

کپڑے دھونے کے لیے جمعہ کے دن سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل مکرم چوہدری غلام حیدر صاحب تشریف لا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے اور ضرورت مند لڑکے لائن بنا کر اپنی ضرورت کے لیے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے پرچی بنوانے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اگر کوئی لڑکا کپڑے دھونے کے لیے صابن کی ضرورت بیان کرتا تو اسے دو آنے کی پرچی دکاندار کے نام دے دی جاتی۔ یہ پرچی متعلقہ دکاندار کو دے کر صابن لے لیا جاتا۔ اور اگر نہانے کے لیے صابن کی ضرورت پڑتی یا سیاہی اور کاپی وغیرہ کی ضرورت پڑتی تو اس کی بھی دکاندار کے نام پرچی مل جاتی۔ مہینے بعد دکاندار کو حساب کر کے پیسے ادا کر دیے جاتے اور وہ پیسے متعلقہ لڑکوں کے کھاتوں میں لکھ لیے جاتے۔ اگر کبھی عرض کیا جاتا کہ سرسوں کے تیل کی ضرورت ہے تو سپرنٹنڈنٹ صاحب سر سے پگڑی اتار کر دکھاتے کہ دیکھو میں نے کبھی سر کو تیل نہیں لگایا آپ نے تیل لگا کر کیا کرنا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد سلسلہ کے مالی حالات کمزور تھے جس کا ہر شعبہ پر اثر تھا۔ طلباء جامعہ کے وظائف بھی کم تھے، انہی میں گزر بسر کرنا ہوتی تھی اس لیے بڑی احتیاط کی جاتی تھی۔ ہوسٹل میں لڑکوں کے اخراجات کے حساب کتاب کے لیے ایک عمر رسیدہ بزرگ منشی عبد الخالق صاحب، جو قادیان سے کام کرتے چلے آرہے تھے،

موجود تھے۔ان کے علاوہ بھی شاید ایک بزرگ تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں۔احمد نگر آئے تین ماہ کے قریب عرصہ گزر گیا تھا۔ پڑھائی جاری تھی کہ پہلے سال کے امتحانات کا وقت آ گیا۔امتحان دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے 700 میں سے 512 نمبر لے کر جماعت میں دوم آیا۔ اول راجہ نذیر احمد صاحب تھے جنہوں نے 520 نمبر لیے۔جہاں تک مجھے یاد ہے ہجرت کے بعد ہماری کلاس میں پندرہ بیس لڑکے تھے جن میں سے بعض جن کے نام یاد ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔راجہ نذیر احمد صاحب ۲۔نذیر احمد رہان ۳۔سید کمال یوسف صاحب ۴۔محمود احمد مختار میر پوری صاحب ۵۔عبدالباسط صاحب ۶۔محمد رفیق صاحب ۷۔مکرم خان صاحب ۸۔ مقبول احمد ذبیح صاحب ۹۔عبدالرشید عابد صاحب ۱۰۔قاضی محمد احمد صاحب ۱۱۔عبدالحکیم اکمل صاحب ۱۲۔محمد شریف خالد گجراتی صاحب

جامعہ احمدیہ احمد نگر میں ہمارے معزز اساتذہ جن کی صحبت و تربیت اور رہنمائی ہمیں میسر آئی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱۔حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل جالندھری۔عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ دونوں زبانوں میں نہایت روانی سے تقریر کر سکتے تھے۔اعلیٰ درجہ کے مناظر تھے۔ بیرون ہندو پاک بلاد عربیہ میں مبشر (دین حق) رہ چکے تھے۔خلعت زہد وتقویٰ سے مزین تھے۔ خلافت سے گہری محبت تھی۔ آپ پرنسپل جامعہ کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور رسالہ الفرقان کے ایڈیٹر اور مالک بھی تھے۔تفہیمات ربانیہ جیسی عظیم کتاب کے مصنف تھے۔نہایت شفیق اور ہمدرد استاد تھے۔اگر کسی لڑکے کی کوئی کمزوری دیکھتے تو نہایت پرحکمت طریق سے اس کو اس کی کمزوری سے آگاہ کرتے تھے۔

۲۔حضرت قاضی محمد نذیر صاحب فاضل لائلپوری۔اعلیٰ پائے کے مناظر اور

متعدد کتب کے مصنف تھے۔طلباء کے نہایت ہمدرد، بے حد منکسر المز اج اور پڑھانے کے خوب ماہر تھے۔رات دن طلباء کو پڑھانے کے لیے سوچتے رہتے تھے۔اگر رات لیٹے لیٹے کوئی اٹکا ہوا مسئلہ سمجھ میں آ گیا تو اسی وقت ہوسٹل آ کر متعلقہ طلباء کو جگا کر سمجھاتے تھے۔

۳۔حضرت مولانا ارجمند خان صاحب۔نہایت عمدہ طریقِ تعلیم،خود بے حد بے نفس،نہایت سنجیدہ مزاج تھے۔طلباء کے بے حد ہمدرد تھے۔

۴۔حضرت مولانا ظفر محمد صاحب ظفر۔فاضل عربی و فارسی،قادرالکلام شاعر،ان گنت عربی،اردو اور فارسی اشعار کے حافظ۔ایک مضمون کے مختلف زبانوں کے کئی کئی شعر سنا دیا کرتے تھے۔

۵۔مولانا عطاء الرحمٰن صاحب طالب فاضل۔صرف و نحو میں سند تسلیم کیے جاتے تھے۔''الفیہ''جو عربی گرائمر کی کتاب ہے اس کے خوب عالم تھے۔طلباء کو خوب پڑھاتے تھے۔نہایت خاموش طبع صاحب علم و فضل تھے۔

۶۔حضرت مولانا ظہور حسین صاحب مجاہد بخارا۔آپ ہمیں ترجمۃ القرآن پڑھاتے تھے۔

۷۔محترم چوہدری غلام حیدر صاحب بی اے بی ٹی سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل بھی اساتذہ کرام میں موجود تھے اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ہوسٹل کے نظم و ضبط کو عمدگی سے قائم رکھتے تھے۔

۸۔حضرت مولانا شہزادہ خان صاحب بھی بہت نیک صالح،متقی و زاہد بزرگ بھی اساتذہ میں موجود تھے۔

اسی طرح **حضرت قریشی محمد نذیر صاحب ملتانی** بھی سٹاف میں شامل تھے اور **حافظ شفیق احمد صاحب** حافظ کلاس کے انچارج تھے۔

جامعہ احمدیہ میں مختلف کھیلیں ہوتی تھیں جن میں والی بال، فٹ بال، کبڈی، رِنگ وغیرہ شامل تھیں۔فٹ بال اور والی بال کے دوسرے شہروں کی ٹیموں سے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ جامعہ احمدیہ میں چوہدری سردار احمد بزمی صاحب، چوہدری عبدالمالک صاحب، چوہدری محمد حسین صاحب، مبارک احمد اعجاز صاحب وغیرہ والی بال کے عمدہ کھلاڑی تھے۔ میں بھی اکثر والی بال کھیلتا تھا، کبڈی ٹیم کا بھی ممبر تھا اور کبھی کبھی فٹ بال بھی کھیلا کرتا تھا۔ لمبی دوڑ بھی لگاتا تھا۔ گاؤں کے باہر جو سرگودھا کو سڑک جاتی ہے اس پر شام کے وقت تین میل تک دوڑ لگاتا تھا جس کا کبڈی کھیلتے ہوئے مجھے فائدہ ہوتا تھا کہ سانس نہیں پھولتا تھا۔

جامعہ احمدیہ آخر لڑکوں کا ادارہ تھا۔ بعض اوقات لڑکے دلچسپ شرارتیں بھی کیا کرتے تھے۔احمد نگر میں ماحول خالصتاً دیہاتی تھا۔ ادارے میں کوئی بیت الخلاء موجود نہیں تھا۔ قضاء حاجت کے لیے باہر کھیتوں میں جانا پڑتا تھا اور طہارت واپس ہوسٹل آ کر طہارت خانے میں کی جاتی تھی۔ طہارت کے لیے لوٹے کی بجائے لوہے کا ڈبہ رکھا ہوا تھا اس میں پانی لے کر پاکیزگی حاصل کی جاتی تھی۔ یار لوگوں نے اس ڈبے کا نام PWD رکھا ہوا تھا جو پیشاب والے ڈبے کا مخفف تھا۔ کسی من چلے نے ایک رات کو کچن کی مرچوں والی دوری میں پانی ڈال کر ڈبے میں ڈال دیا۔ جو بھی صبح طہارت کے لیے جاتا سرین کھجاتا باہر آتا لیکن کوئی بات نہ کرتا۔

ادارے میں ایک حافظ کلاس بھی تھی جس میں بعض طلباء قرآن مجید حفظ کرتے تھے۔اس کلاس کے انچارج مکرم حافظ شفیق احمد صاحب تھے۔ ہاں اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ پہلے سال کا امتحان ہو گیا تو ہمیں کچھ دنوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور اکثر لڑکے گھروں کو چلے گئے۔ میں بھی گھر پہنچا تو دیکھا کہ ابھی تک وہی ویرانی کی کیفیت ہے۔ فصل ابھی آئی نہیں۔ کھانے کو مسور کے آٹے کی روٹی، خودرو بوٹی جس کو مقامی زبان میں

خواب کہتے تھے، کے ساگ کے ساتھ ملی۔ گلے سے اترتی نہیں تھی۔

چمن والوں سے مجھ صحرانشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

کا نقشہ تھا۔ بہرحال ابھی کسمپرسی کی زندگی تھی۔ حالانکہ تقسیم ملک سے قبل والد صاحب گاؤں کے امیر آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ والد صاحب اجناس کی تجارت کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے وقت مختلف اجناس کے سٹاک پڑے تھے۔ نقدی کی صورت میں والد صاحب کے پاس صرف تین روپے نو آنے کے پیسے آئے تھے اور میں قادیان سے آیا تھا۔ مجھے اخراجات کے لیے والد صاحب نے جو رقم دی تھی اس میں سے 40 روپے بچ کر پاکستان آئے تھے۔ ان تمام حالات کے باعث اگر میں کبھی عرض کرتا کہ کچھ عرصہ کوئی کام کر کے گھر کے حالات بہتر ہونے پر وقف کر دوں گا تو سخت برا محسوس کرتے کہ میں جیسے بھی ہو گزر کروں گا مگر تم نے وقف کو نبھانا ہے۔ اس بارہ میں ان کا مؤقف بہت سخت تھا۔

چھٹیاں گزار کر واپس احمد نگر آ کر تعلیم میں لگ گیا۔ آہستہ آہستہ جماعت کے مالی حالات درست ہو رہے تھے تو جامعہ کے طلباء کے انتظام میں بھی بہتری آنے لگی۔ کھانے کا معیار بھی قدرے بہتر ہو گیا۔ کبھی کبھی پلاؤ بھی ملنے لگا اور سالن میں ایک وقت دال اور ایک وقت گوشت کا شوربہ ملنے لگا۔ وظیفہ بھی بارہ روپے سے بڑھ کر اٹھارہ روپے ہو گیا۔ وظیفے سے بچت کر کے کپڑے بھی بنا لیتا تھا لیکن مہنگا کپڑا خریدنے کی بجائے سستا کپڑا خرید کر دو جوڑے بنا لیتا جس سے لباس کے لحاظ سے صاف ستھرا رہنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ان حالات میں جسمانی ورزش سے غفلت نہیں کی۔ رنگ بہت گورا اور سرخ تھا۔ کانوں کی لویں بہت سرخ تھیں۔ ایسے لگتا تھا تھا جیسے ان سے خون ٹپک رہا ہو۔

فرقان بٹالین میں شمولیت

1948ء جون میں جماعت کی طرف سے جہاد کشمیر کے لیے گورنمنٹ پاکستان کو ایک بٹالین رضا کار فورس قائم کر کے دی گئی اس میں مَیں بھی شامل تھا اور جامعہ کے اکثر باقی طلباء بھی شامل تھے۔ علاوہ ازیں پاکستان کی جماعتوں سے رضا کار بھی بھرتی کر کے شامل کیے جاتے تھے۔ ہمیں پہلے لاہور لے جایا گیا وہاں فوجی وردیاں زیب تن کروائی گئیں۔ پھر ریل میں سوار کرایا گیا اور جہلم سٹیشن پر ریل سے اترنے کا حکم دیا گیا۔ وہاں سے پیدل مارچ کر کے واپس سرائے عالمگیر نہر اپر جہلم کے کنارے کیمپ میں ہماری فوجی ٹریننگ شروع ہوگئی۔ علی الصبح جسمانی ورزش یعنی پی ٹی کرائی جاتی۔ دوپہر تک پریڈ جاری رہتی۔ ہماری چار کمپنیاں بنائی گئی تھیں۔ اے، بی، سی اور ڈی۔ سی کمپنی میں زیادہ تر جامعہ کے طلباء تھے اور کچھ افراد کو جن کے قد چھوٹے تھے بوائز میں الگ پریڈ کرائی جانے لگی۔ ہمارے سکھانے والے اساتذہ ابتداء میں سب احمدی تھے۔ کچھ ریٹائر فوجی تھے اور کچھ حاضر سروس افسران اپنے محکمہ سے چھٹی لے کر آئے ہوئے تھے۔ ہمارے بٹالین کمانڈر اس وقت مکرم میجر محمد حیات خان صاحب قیصرانی بلوچ تھے۔ اس کے علاوہ کیپٹن عبداللہ مہار صاحب، کیپٹن نعمت اللہ شریف صاحب اور کیپٹن حمید احمد کلیم صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت بابا حسن محمد صاحب کا ذکر خیر

یہاں ہمارے امام الصلوۃ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے رفیق حضرت بابا حسن محمد صاحب جن کو سب سے پہلے وصیت کرنے کا شرف عطا ہوا اور ان کا وصیت نمبر 1 تھا، نمازیں پڑھاتے تھے اور قرآن مجید کا درس بھی دیتے تھے۔ آپ کی شکل

نہایت نورانی تھی اور ریش مبارک کو مہندی بھی لگاتے تھے۔

پندرہ دن کی ابتدائی ٹریننگ کے بعد جہلم چھاؤنی میں سب سے فائر کروایا گیا۔فائر کے نتائج عام فوجی ریکروٹ سے بہت اچھے تھے۔ایک دوروز میں پاکستانی فوج کی معاونت سے ان نوآموز سپاہیوں کو محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔لیکن مجھے،مولانا سلطان محمود انور صاحب اور کچھ اور لڑکوں کو محاذ جنگ پر اس لیے نہیں لے جایا گیا کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں۔مزید پندرہ دنوں بعد مجھے بھی محاذ جنگ پر جانے کا موقع ملا۔جانے سے قبل میرے بچپن کا دوست اور بھتیجا مسعود احمد بھی سرائے عالمگیر پہنچ گیا اور ڈی کمپنی جسے شوکت کمپنی کا نام دیا گیا تھا اس کی پلاٹون نمبر 10 میں ہم دونوں کو شامل کر دیا گیا جس کے تین سیکشن تھے۔جہلم سے محاذ جنگ تک کے سفر کی روئیداد بھی بڑی دلچسپ ہے۔شام کے وقت ملٹری ٹرکوں میں سوار کرایا گیا۔رات گئے ہم بھمبر پہنچے جہاں رات کا کچھ حصہ گزار کر آگے پیدل روانہ ہونا تھا۔جیسے ہی ہم بھمبر کے کھنڈرات اور بڑی بڑی گھاس میں ٹرکوں سے اترے پاکستان کے سپاہیوں نے اینٹی ایئر کرافٹ گن کے ایک دو فائر کیے جس سے ہم بہت خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر چھپنے لگے۔یاد نہیں کہ رات کتنے بجے ہم وہاں سے پیدل سوکھے تالاب کے لیے روانہ ہوئے۔صبح سورج نکلتے ہی انڈین فورس کے ایک جہاز نے بھمبر پر گولہ باری شروع کر دی۔ہم راستے میں چھپ گئے۔تھوڑی دیر بعد روانہ ہو کر اپنی منزل سوکھے تالاب ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔وہاں ہمیں دن بھر جھاڑیوں وغیرہ میں چھپ کر قیام کرنا تھا۔چنانچہ اسی کیفیت میں کھانا دیا گیا اور رات کو بکسر محاذ کی طرف روانہ ہو گئے۔ہمارا راہبر راستہ بھول گیا اور ہمیں راستہ میں ہی ادھر ادھر چھپ کر رات گزارنا پڑی۔وہاں سے آگے سفر شروع ہوا راستے میں بھمبر نالہ تھا جس میں بعض اوقات اچانک کثیر مقدار میں پانی آجاتا تھا اور گزرنے والوں کا اس میں بہہ جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔خدا خدا کر کے تھکے ہارے

بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ کھانا وغیرہ کھایا اور آرام کیا۔ رات کو جتنے لوگ گئے تھے ان سب کو مختلف کمپنیوں میں بھیج دیا گیا۔ مجھے اور عزیزم مسعود کو شوکت کمپنی میں بھیج دیا گیا۔اب ہم مکمل طور پر ایک فوجی سپاہی کے طور پر زندگی بسر کرنے لگے۔ ہماری پوزیشن باغ سرجھیل سے اگلی پہاڑی کے اوپر تھی۔

محاذ جنگ کی صورتحال

بٹالین کا نام فرقان بٹالین تھا اور ہمارا راشن وغیرہ پاکستان گورنمنٹ کے ذمہ تھا جس کی کیفیت یہ تھی کہ ایک سو پچیس آدمی کی چائے میں صرف ایک کلو دودھ ہوتا تھا اور سڑے ہوئے پرانے گڑ سے چائے کو میٹھا کیا جاتا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں ایسی دال ملتی تھی جس کے دانے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے۔ ہمارا علاقہ دفاعی تھا۔ ہمیں قریباً دو میل کا محاذ حفاظت کے لیے دیا گیا تھا جس کی حفاظت کے لیے فرقان فورس کے مجاہدین رات دن مستعد رہتے تھے۔ ہمارے دائیں طرف قلعہ بکسر تھا جہاں پاکستان کی باقاعدہ فوج متعین تھی اور بائیں طرف قبائلی پٹھان حفاظت علاقہ پر مامور تھے۔فرقان فورس کے سپاہیوں کے پاس تھری ناٹ تھری اور مارک فور رائفلیں تھیں اور پوری بٹالین کے پاس صرف تین عدد تین انچ مارٹر توپیں تھیں جن کا گولہ صرف پچیس سو گز کے قریب تک جاتا تھا۔ جب کہ ہندوستان کے پاس 25 پونڈز گنیں تھیں جن سے وہ ہمارے اوپر شیلنگ کرتا تھا اور ہندوستان کے بمبار ہوائی جہاز بھی گولہ باری کرتے تھے۔ یہاں رہ کر کوئی خوف نہیں آتا تھا۔شیلنگ کی آواز سے لطف اندوز ہوتے تھے۔مچھر کی اس قدر بہتات تھی کہ اس کا کوئی علاج ہمارے پاس نہ تھا۔ ڈبل جراب اور ڈبل پتلون میں بھی کاٹ لیتا تھا۔بعض دوستوں کی ٹانگیں مچھر کے کاٹنے سے سخت زخمی ہوگئی تھیں۔رات دن مورچوں میں بسر ہوتی تھی۔محاذ پر بارش

بھی کثرت سے ہوتی جس کا اثر مورچوں کے اندر تک چلا جاتا تھا۔ اسی دوران حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب رحمہ اللہ بھی محاذ جنگ کے دورہ کے لیے ہمارے پاس تشریف لائے اورانہوں نے تصاویر بھی بنائیں۔ بہر حال اسی طرح شب و روز گزر رہے تھے کہ مجھے اکلوتا ہونے کے ناطے واپس بھیج دیا گیا۔

11 ستمبر 1948ء کو محاذ سے واپس بھمبر فوجی ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس دن بانی پاکستان قائداعظم کی وفات ہوگئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یو۔این۔او کے فیصلہ کے مطابق پاکستان اور ہندوستان کشمیر میں جنگ بندی پر رضا مند ہوگئے اور جنگ بند ہوگئی۔ لیکن افواج اپنی اپنی جگہ پر رہیں۔ فرقان بٹالین بھی اپنے محاذ پر رہی۔ جنگ بندی کے بعد سپاہیوں کو راشن بہت عمدہ اور فراخی سے ملنا شروع ہو گیا۔ فرقان بٹالین کے سپاہیوں کو بھی وافر بکرے کا گوشت اور دودھ وغیرہ ملنا شروع ہوگیا۔ اسی اثنا میں ہندوستان میں محصور فوجی بھی پہنچ گئے جن کو محاذوں پر مامور کر دیا گیا اور سپاہیوں کی کمی کسی حد تک پوری ہوگئی۔

بٹالین کب محاذ سے واپس آئی یہ تاریخ احمدیت میں ملاحظہ فرمائیں۔ جب بٹالین واپس آئی ہے میں اس کے استقبال میں شامل تھا۔ بہت خوبصورت اور پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں جنرل گریسی کا تعریفی پیغام سنایا گیا۔ صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب کرنل کی صاف ستھری خاکی وردی میں ملبوس بالکل شاہی شاہزادے لگ رہے تھے۔ بہر حال نہایت کامیابی و کامرانی کے ساتھ سارے سپاہی جنرل گریسی کمانڈر انچیف افواجِ پاکستان کے تعریفی کلمات کی سند لیے واپس ربوہ پہنچ گئے۔ یہاں ریلوے سٹیشن پر بٹالین کی استقبالیہ تقریب منعقد ہوئی۔ اور یہاں سے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

جامعہ احمدیہ اور ربوہ کے نوجوانوں کو مستقبل میں بھی فوجی ٹریننگ ملتی رہی اور

ربوہ، چنیوٹ اور جھنگ میں ہمارے جوانوں نے مصنوعی جنگ کے مظاہرے کر کے گورنمنٹ کے افسران کے دل جیت لیے اوران کامیابیوں کا سہرا جمعدار شیر احمد خان کے سر تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار ڈپٹی کمشنر جھنگ کی موجودگی میں اسی طرح کا فوجی مظاہرہ کیا گیا اس پر ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا

''میں صدر انجمن احمدیہ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں شیر احمد کی خدمات کچھ عرصہ کے لیے ادھار دے دی جائیں تا کہ ہم دوسرے لوگوں کو ٹریننگ دے سکیں۔''

اس فوجی مظاہرہ میں مَیں بھی شامل تھا۔ فرقان بٹالین میں شمولیت بھی زندگی کا ایک ورق تھا۔ اب واپس تعلیم کی طرف لوٹتا ہوں۔ فرقان فورس سے واپسی پہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ربوہ کی افتتاحی تقریب میں شمولیت کی سعادت بخشی۔ ہسپتال میں موجود (بیت) یادگار کی جگہ کو ہموار کر کے دریاں بچھائی گئی تھیں اوراوپر شامیانہ لگایا گیا تھا۔ قریب ہی ایک نلکا لگایا گیا تھا۔ میں نے اس سے چلو بھر پانی لے کر منہ میں ڈالا تو نہ صرف سخت کڑوا تھا بلکہ منہ سے خود بخود باہر گر گیا۔ حضور نے ربوہ کی زمین کے چاروں کونوں پر چار بکرے اور یہاں مرکزی جگہ پر بھی ایک بکرا بطور صدقہ ذبح کروایا اور نماز ظہر وعصر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام والی دعائیں تقریر میں دہرائیں۔ اس طرح ربوہ کی سرزمین کا افتتاح عمل میں آیا۔ کسی وجہ سے میرا نام تاریخ احمدیت میں نہیں آسکا۔

فرقان فورس سے واپسی اور جامعہ احمدیہ میں حاضری

فرقان فورس سے واپسی پر گاؤں میں تپ محرقہ سے بیمار ہو گیا۔ اس سے نجات ملی تو ملیریا نے آلیا۔ دسمبر کے شروع تک یہ کیفیت رہی آخر بخار سے نجات ملی تو جامعہ کھل چکا تھا۔ حاضر ہو گیا۔ جاتے ہی چند روز میں نوماہی امتحان ہونے والا تھا۔ سخت

گھبراہٹ تھی کہ کیا بنے گا مگر اللہ نے کرم کیا کہ میں تمام مضامین میں پاس ہو گیا بلکہ ترجمۃ القرآن میں تو خواب میں دکھائے گئے نمبر یعنی 75/100 آئے اور میں اس مضمون میں دوم آیا۔ پڑھائی پھر زور وشور سے شروع ہوگئی۔ اساتذہ کرام کی پرشفقت راہنمائی اور ہمت افزائی اس غربت کی حالت میں شامل حال تھی۔ چنانچہ جامعہ میں تعلیم کے دوران کی صورت حال پر کبھی بھی کسی غریب یا امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والے کسی بھی طالبعلم کی زبان سے کوئی شکوہ نہیں سنا بلکہ سب ان حالات میں خوش و خرم اپنی اپنی استعداد کے مطابق تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے اور بہتر مستقبل کے لیے پرعزم تھے۔

تاریخ تو یاد نہیں مگر یہ یاد ہے کہ کسی اہم موقع پر حضرت مصلح موعود بھی جامعہ احمدیہ احمد نگر تشریف لائے تھے اور مجھے حضور کے کھانے کی ٹیبل پر خدمت کی سعادت بھی ملی تھی۔

ایک بار بیرونی ممالک میں فریضۂ (دعوت الی اللہ) ادا کر کے واپس آنے والے مربیان کرام (مکرم محمد اسحاق ساقی صاحب، مکرم غلام رسول احمدی صاحب، مکرم غلام احمد بشیر صاحب اور ایک کا نام یاد نہیں رہا) کو جامعہ کی طرف سے دعوت دی گئی۔ چاروں مربیان کرام شلوار قمیض، شیروانی اور سبز کلے دار پگڑی میں ملبوس تشریف لائے۔ ان کے چہروں پر عجب روحانی مسرت وسکون محسوس ہو رہا تھا۔

میرے والد صاحب نے بھی جب مجھے وقف کیا ہے تو بوسکی کی پگڑی خرید کر اسے سبز رنگ دلوا کر رکھا ہوا تھا کہ جب میں مربی بنوں گا تو پہنوں گا۔ مگر وائے قسمت کہ وہ بکس جس میں یہ تحفہ موجود تھا نقل مکانی کے وقت ہندوستان میں ہی رہ گیا اور والد صاحب بھی میری تکمیل تعلیم سے پہلے وفات پا گئے۔

احمد نگر میں احمدی آبادی تقسیم ملک کے بعد ہوئی۔ اس سے قبل مقامی آبادی میں

کچھ سنی العقیدہ اور کچھ شیعہ مسلمان تھے۔شیعوں نے ایک بار جلسہ کیا جس میں مکرم محمد بشیر صاحب ٹیکسلا والے اور محمد اسماعیل صاحب گوجرے والوں کو بلایا گیا۔ یہ دونوں چوٹی کے شیعہ عالم تھے۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلباء کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ ہم شوق سے شامل ہوئے۔شیعوں نے مناظرے کی دعوت دے ڈالی جسے مولانا ابوالعطاء صاحب نے وہاں کھڑے کھڑے منظور کر لیا۔اب شیعہ علماء گھبرا گئے اور مناظرہ مقامی لوگوں کے ذریعہ ٹال دیا گیا۔

ہماری طرف سے علماء کو رات کو ہمارے جلسے میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ مولانا محمد بشیر صاحب تو واپس چلے گئے لیکن مولانا محمد اسماعیل صاحب رات کو ہمارے جلسے میں آئے۔محترم مولانا ابوالعطاء صاحب صدر جلسہ تھے اور محترم قاضی محمد نذیر صاحب مقرر تھے۔انہوں نے خلفاء ثلاثہ کے شیعہ عقیدہ کی تردید میں کہا کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ خلیفہ برحق نہیں تھے تو ان کے زمانہ میں جو اسلامی جنگیں ہوئیں وہ جہاد نہیں اور ان جنگوں میں جو اموال آئے وہ بھی ناجائز اموال ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران فتح ہوا جس میں شہزادی شہر بانو قید ہو کر آئیں جن سے حضرت امام حسینؓ نے نکاح کیا۔اس نکاح اور ان کے بطن سے ہونے والی اولاد کے بارہ میں مولانا کا کیا فتویٰ ہے۔اس پر مولوی اسماعیل صاحب تلملا اٹھے اور یہ کہتے ہوئے جلدی سے جلسہ سے چلے گئے کہ میں اپنی کل کی تقریر میں اس کا جواب دوں گا اور قاضی صاحب کی تقریر کے پرخچے اڑا دوں گا۔ میں بڑے شوق سے اگلے روز جلسہ میں شمولیت کے لیے گیا کہ دیکھیں اس کا کیا جواب دیا جاتا ہے لیکن مولوی صاحب نے اس سوال کے جواب کو چھوا تک نہیں اور بکلی گول کر گئے اور میں نے احمدیہ علم کلام کی فتح اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔پھر زندگی بھر دیکھا ہے کہ اس سوال کا شیعہ احباب کے پاس کوئی جواب نہیں۔

احمد نگر میں سیلاب اور خدمت خلق کی توفیق

غالباً ستمبر 1950ء کی بات ہے کہ دریائے چناب میں پانی کا بہت بڑا سیلابی ریلا آیا۔ جب پانی آ رہا تھا تو مقامی لوگوں کو آگاہ کیا گیا لیکن وہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ پانی ان کے گھروں تک پہنچ جائے گا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے احمد نگر کے گلی کوچوں میں پانی بہنے لگا۔ مکانات جو اکثر کچے تھے گرتے جا رہے تھے۔ سامان اور برتن وغیرہ پانی میں تیرتے پھرتے تھے۔ ان حالات میں جامعہ کے طلباء نے مقامی لوگوں کی خوب مدد کی۔ ان کے گھروں کے سامان جہاں انہوں نے چاہا وہاں محفوظ کیے۔ ہمارے ہوسٹل میں بھی، حالانکہ وہ کافی اونچی جگہ پر واقع تھا، پانی آ گیا۔ ہوسٹل کے جنوب مغربی طرف نیچی جگہ میں تو چار چار فٹ کے قریب پانی تھا۔ سارا گاؤں محصور تھا لیکن مقامی لوگوں کا کافی مالی نقصان ہوا البتہ جانی نقصان سے اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو بچا لیا۔ مجھے چونکہ تیرنا آتا تھا اس لیے بے خوف وخطر پانی میں گھوم رہا تھا۔ ہوسٹل سے باہر تا حدنگاہ پانی ہی پانی تھا۔ ریلوے لائن میں بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔ مہینوں ریل بند رہی۔ سرگودھا جانے والی سڑک بھی ربوہ اور احمد نگر کے درمیان سے بہہ گئی اور راستہ میں گہرے گڑھے پڑ گئے۔ اس وقت ربوہ اور احمد نگر کے درمیان سڑک پر پل نہیں تھا اور ریل پر بھی غالباً پل نہیں تھا۔ سیلاب کے بعد ربوہ اور جامعہ کے خدام نے مل کر ہفتہ بھر ریل کی پٹڑی کی درستی کے لیے کئی فٹ اونچی مٹی ڈالی۔

جامعہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ابتداء سے ہی خدام الاحمدیہ کا کوئی نہ کوئی خدمت کا عہدہ مجھے ملتا رہا۔ پہلے پہلے نائب سیکریٹری ایثار واستقلال بنا۔ آج کل یہ عہدہ مدت سے ختم کر دیا گیا ہے۔ جامعہ احمدیہ میں ایک سال زعیم خدام الاحمدیہ کے طور پر بھی خدمت کی توفیق پائی۔ ایک بار مجھے مقامی احمد نگر گاؤں کی مجلس اطفال

الاحمدیہ کا مربی بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے خوب خدمت کی توفیق دی۔ اطفال کی کل تعداد 68 تھی جس میں سے 66 تک اطفال کی نمازوں میں حاضری شروع ہوگئی۔ ان کے مقابلے انعامات وغیرہ سے ان کو تنظیم سے اچھی طرح منسلک کرنے کی توفیق ملی۔ چنانچہ ناظر اصلاح وارشاد سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب دورہ پر آئے۔ ان کی خدمت میں تربیت اطفال کی مقامی جماعت کی طرف سے رپورٹ پیش کی گئی تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا اور ملاقات کا شرف عطا فرمایا اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

احمد نگر میں بعض احمدی بچوں کو انگریزی اردو کی بلا معاوضہ ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا جس سے طلباء میرے ساتھ مانوس ہوگئے تھے۔

ایک دلچسپ واقعہ

گاؤں میں جامعہ کے ایک طالبعلم نظام الدین مہمان اور دکاندار رحمت اللہ صاحب کے درمیان دھات کے گلاسوں میں گرم گرم چائے پینے کا مقابلہ ٹھہر گیا اور ہارنے والے کی مونچھیں استرے سے مونڈ دینے کی شرط طے پا گئی نیز یہ کہ ہارنے والا ایک سیر مٹھائی بھی کھلائے گا۔

گرم گرم چائے لائی گئی۔ نظام الدین مہمان بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر چائے میں تر کر کے گلاس کے کنارے سے چپکا لیا جس سے ہونٹ نہیں جلتا تھا۔ یہ پی گیا اور رحمت اللہ ہار گیا۔ چنانچہ اس کی مونچھیں مونڈ دی گئیں۔ بیوی کو پتہ لگا تو اس نے گھر میں شور مچا دیا کہ تم دوسری شادی کر رہے ہو۔ کیونکہ مونچھیں منڈوانا دوسری شادی کرنے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ رحمت اللہ کو اپنے اہل خانہ کو شادی نہ کرنے کا یقین دلانا مشکل ہوگیا۔

اب سلسلہ کی مالی مشکلات میں کمی سے طلباء جامعہ کی مشکلات میں بھی کمی ہوتی

گئی۔ وظیفے بھی بڑھ گئے۔ کھانے کے انتظام کے لیے ہوسٹل میں کا پی کیپر جسے میس مینیجر بھی کہا جا سکتا ہے، مقرر کیا جانے لگا۔ جو لڑکوں میں کھانا تقسیم کرتا تھا اور کھانے کی حاضری کا ریکارڈ بھی رکھتا اور فی حاضری خرچ نکال کر، ہر لڑکے کا ماہوار خرچ نکال کر منشی عبدالخالق صاحب کو دیتا جو اسے ہر لڑکے کے کھاتے میں ڈال کر حساب رکھتے۔ مجھے بھی دوران تعلیم قریباً دو سال یہ فریضہ ادا کرنا پڑا تھا اور اللہ کے فضل سے میرے زیر انتظام عموماً دوسروں سے خرچ کم آتا تھا۔

ابتدائی جلسہ سالانہ پاکستان میں شمولیت

اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار کو 1948ء کے جلسہ لاہور میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور پھر 1949ء کے ربوہ کے پہلے جلسہ سالانہ میں نہ صرف شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ مہمان نوازی کے شعبہ میں ڈیوٹی بھی دی۔ جبکہ پہلے سال انتظامات کے لحاظ سے شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ عقب ہسپتال والی پہاڑی کے پاس لنگر خانہ تھا اور مہمانوں کے ٹھہرنے کی جگہیں جلسہ گاہ کے قریب تھیں جو اس وقت آج کے گرلز ہائی سکول کی جگہ تھی۔ ٹرک پر کھانا آتا تھا جس پر مٹی پڑ جاتی تھی۔ ایک دن رات گئے تک مہمانوں کو کھانا نہ مل سکا اور نہ میں نے خود کھایا کہ جب تک مہمانوں کو نہیں ملے گا میں بھی نہیں کھاؤں گا حالانکہ میں اپنے کھانے کا انتظام کر سکتا تھا۔ اس سال پینے کے پانی کی بھی بڑی دقت تھی کیونکہ ربوہ کا پانی پینے کے قابل نہ تھا۔ حضور نے جلسہ سالانہ کے آغاز میں ایک بار پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کعبہ کے وقت کی پر سوز دعائیں نہایت رقت آمیز رنگ میں پڑھیں۔ یہ جلسہ 15 تا 17 اپریل 1949ء ہوا تھا۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا لیکن عشاق ایسی مشکلات کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ کھانے پینے، سونے اور آرام کی پرواہ کیے

بغیر عشاق احمدیت جلسے کی برکات سے مستفیض ہوئے اور اپنی جھولیاں ان روحانی زر و جواہر سے بھرتے رہے۔ تفصیلات تاریخ احمدیت میں مطالعہ کی جاسکتی ہیں۔

کسی بھی فرد کی زبان سے کسی تکلیف پر کوئی شکوہ نہیں سنا۔ بلکہ سب شاداں و فرحان نئے مرکز میں ہونے والے پہلے جلسہ میں شمولیت کی سعادت ملنے پر بے حد مسرور تھے۔ میں خود بھی ایسے احباب میں شامل تھا۔

ہاں یہاں ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ ربوہ کی زمین کی فروخت کے وقت عشاق نے تو صرف نئے مرکز میں جگہ کے حصول کے جذبہ سے اپنی پونجی خرچ کرنے میں خوش بختی محسوس کی۔ ان ہی میں میرے والد محترم بھی تھے۔ لاہور میں شاید کچھ زیور معمول کے اخراجات کے لیے فروخت کیا۔ اتنے میں کچھ واقف ملے تو انہوں نے بتایا کہ نئے مرکز میں زمین فروخت ہورہی ہے۔ والد صاحب بھی بھاگم بھاگ گئے اور ایک سو روپیہ دے کر ایک کنال زمین خرید لی۔ چنانچہ والد صاحب کا اخبار میں 209 نمبر خریداری تھا لیکن بعض لوگ زمین کے کلر اور پھولے ہوئے شور کو دیکھ کر پکار اٹھے کہ یہ کون سی رہنے کی جگہ ہے۔ مجھے اس پر یہ شعر یاد آرہا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

مرکز میں وسائل کے لحاظ سے تیزی سے آبادکاری کا کام جاری تھا۔ کچے دفاتر اور قصرِ خلافت تعمیر ہوا اور ریلوے لائن کے قریب ایک کچی جائے نماز بھی تیار کی گئی۔ (بیت الذکر) سے کچھ فاصلہ پر کچا نور ہسپتال جو غالباً دو کمروں پر مشتمل تھا، بنایا گیا اور اس میں علاج معالجہ کی سہولت مہیا کی گئی۔ حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب، محترم صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب، مکرم ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور اغلباً ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب بھی نئے مرکز کے اس نور ہسپتال میں مریضوں کا علاج کرتے

تھے۔ اردگرد سے غیراز جماعت مردوزن بھی علاج کے لیے آنے شروع ہو گئے اور وہ ڈاکٹروں کے حسن سلوک اور طرزِ گفتگو سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ کا ربوہ میں ورود مسعود

ربوہ میں کچھ عارضی تعمیرات ہو چکی تھیں۔ چنانچہ پیارے آقا خاندان مسیح موعودؑ کی معزز و مبارک خواتین کے ہمراہ قیام کے لیے مؤرخہ 19 ستمبر 1949ء کو تشریف لے آئے۔ اس طرح یہ نیا مرکز اپنے نئے شاندار دور میں داخل ہو گیا۔

حضور کی تشریف آوری کے وقت ربوہ میں بجلی نہیں تھی۔ قیامت خیز گرمی پڑتی تھی۔ گرمیوں میں آنے والی آندھیاں سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیتی تھیں۔ اس سب کچھ کے باوجود اللہ کا یہ اولوالعزم خلیفہ صرف ساری مشکلات ہی برداشت نہیں کر رہا تھا بلکہ جماعت کی ہمہ گیر ترقی کے لیے رات دن عہدیداران جماعت اور کارکنان کی رہنمائی میں ہمہ تن مصروف تھا۔ جب کہ ربوہ میں اس وقت مختلف قسم کی مشکلات تھیں۔ بجلی تو تھی نہیں درختوں کا سایہ بھی میسر نہیں تھا۔ پینے کے پانی کی نایابی بہت مشکل کا باعث تھی۔

ان تمام تر حالات میں یہ پیکر عزم و استقلال سلسلہ کے امور کی انجام دہی میں ہر دم مصروف و منہمک تھا۔ دوسری طرف اردگرد کے مقامی لوگ ربوہ میں رہنے والوں کے متعلق کہتے کہ یہ یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ ہزار سال سے تو یہاں کوئی آبادی نہیں۔ پانی یہاں نہیں ملتا۔ کھیتی یہاں نہیں ہوتی۔ درخت یہاں نہیں ہوتے۔ کلر اور تھور اڑ کر سر تک جاتا ہے۔ بہرحال حیرت زدہ آنکھوں سے اہل ربوہ کو تکتے تھے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے دن بدن اہل ربوہ کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

بہرحال اسی طرح مرچ مصالحہ اور دال وغیرہ کھاتے کھاتے ہنسی خوشی وقت گزر

رہا تھا اور تمام طلباء اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے۔ سیدنا حضرت مصلح موعودکی ربوہ تشریف آوری سے طلباء جامعہ احمدیہ کی ذمہ داری میں قدرے اضافہ ہوگیا۔ (بیت) مبارک کی تعمیر کے بعد جمعہ کی ادائیگی کے لیے ربوہ جانا ہوتا تھا۔ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے قریبا ہر جمعہ میں (بیت) مبارک میں پہرہ کی ڈیوٹی کی سعادت ملتی رہی۔ ساتھ ساتھ حضور کے خطبات بھی قلب و روح کی سیرابی کا باعث بنتے رہے۔ ابتداء میں چونکہ ربوہ میں بجلی نہیں تھی اس لیے نماز جمعہ پر آنے والے احباب کو بعض خدام ایک بڑے سے ہاتھ والے پنکھے کے ساتھ ہوا دیتے تھے۔ احباب کو تو قدرے ہوا مل جاتی تھی لیکن پنکھا جھلنے والا پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔

جلسہ سالانہ اور تنظیمی اجتماعات میں خدمت کی توفیق

جلسہ سالانہ میں بھی ہمیشہ ڈیوٹی کی سعادت ملتی رہی۔ ایک دفعہ جبکہ کچا لنگر خانہ تھا اور بالکل ریلوے سٹیشن کے سامنے تھا اس میں ہم تین طلباء جامعہ احمدیہ کی تقسیم سالن پر ڈیوٹی تھی۔ مزدور دیگ لا کر کھڑکی کے سامنے کمرے کے اندر رکھ دیتے اور تقسیم سالن کا منتظم باہر کھڑے کھانا لینے والے احباب سے پرچی لے کر مطلوبہ تعداد کے مہمانوں کا سالن ڈال دیتا۔ میری، مولانا نورالحق صاحب تنویر اور محترم مولانا منیر احمد عارف صاحب کی تقسیم پر ڈیوٹی تھی۔ اچانک مزدوروں نے دیگیں اٹھانے سے انکار کر دیا کہ مزدوری بڑھاؤ تو اٹھائیں گے۔ چند لمحوں کی پریشانی کے بعد میں نے اور محترم نورالحق تنویر صاحب مرحوم نے معروف طریق کے مطابق ڈبل دیگ کندھوں پر اٹھا کر لا کر کھڑکی کے سامنے رکھ لی۔ اسی طرح تین کھڑکیوں کے سامنے دو دو دیگیں رکھ لیں تو مزدوروں نے سابقہ مزدوری پر دیگیں اٹھانی شروع کر دیں۔

ابتداءً ربوہ میں جلسہ سالانہ کے وقت عارضی انتظام کیے جاتے تھے۔ کچی اینٹوں

سے بنائی گئی بیرکوں کی چھت پر سرکنڈا وغیرہ ڈال کر معمولی طور پر ان کو ڈھانک دیا جاتا تھا۔ مہمان ان بیرکوں میں قیام کرتے۔ مردوں کے لیے الگ بیرکیں تھیں اور خواتین کے لیے الگ۔ ایک دفعہ زنانہ بیرکوں میں کسی وجہ سے آگ بھڑک اٹھی جس سے جانی نقصان تو نہ ہوا لیکن عورتوں کے کپڑے اور جوتے وغیرہ جل گئے۔ عورتیں تو بیرکوں سے نکل کر ادھر ادھر ہوگئیں۔ سامان کچھ جل گیا اور کچھ بیرکوں میں رہ گیا۔ بیرکوں میں رہا ہوا سامان دفتر معلومات میں جمع ہونا شروع ہوگیا۔ میری ڈیوٹی بھی اس وقت دفتر معلومات میں تھی۔ ساری رات ہم سامان جمع کر کے مالکان تک پہنچاتے رہے۔ اسی طرح گمشدہ اشیاء ملنے پر اسی دفتر میں جمع ہوتی تھیں جو لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر کے مالکوں کو واپس کی جاتی تھیں۔ جن اشیاء کے مالک نہیں ملتے تھے وہ دفتر جلسہ سالانہ میں جمع رکھی جاتی تھیں اور دورانِ سال اخبار الفضل میں ان کا اعلان کیا جاتا۔

جلسہ سالانہ کے علاوہ خدام الاحمدیہ اور اطفال الاحمدیہ کا بھی ربوہ میں ہر سال اجتماع ہوتا۔ 1950ء میں جب پہلا اجتماع ہوا تو میں احمد نگر میں مربی اطفال تھا۔ اجتماع کے مقام پر جب میں اطفال کے ہمراہ داخل ہو رہا تھا اور اس وقت نوعمر بھی تھا۔ سامنے سے مکرم اعجاز نصر اللہ صاحب ابن چوہدری محمد اسد اللہ خان صاحب مجھے جھک کر دیکھ کر کہنے لگے بھائی آپ طفل ہیں کہ خادم؟ بہرحال میں نے بحیثیت مربی اطفال اس اجتماع میں شمولیت کی سعادت پائی۔ اجتماع میں تین دن تک حدود اجتماع کے اندر رہنا ہوتا تھا۔ صبح بھنے ہوئے چنوں سے ناشتہ کرتے تھے اور سارا دن علمی و ورزشی مقابلہ جات میں یا حصہ لیتے یا ان سے محظوظ ہوتے۔ اجتماع میں صبح نماز فجر کے بعد اجتماعی ورزش بھی کروائی جاتی تھی۔ اجتماعات میں علمی مقابلہ جات میں رات کے وقت معلومات عامہ کا بھی ایک دلچسپ مقابلہ ہوتا تھا۔ اس میں مکرم بشیر احمد خان رفیق اور مکرم حسام الدین خاں بھی حصہ لیتے تھے جن کے دلچسپ جوابات پر حاضرین ہنس

ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک دفعہ مقابلہ میں سوالات کے لیے چھ جج صاحبان تشریف فرما تھے۔ بشیر احمد صاحب رفیق جوابات کے لیے کھڑے تھے۔ ایک جج صاحب نے سوال کیا کہ بشیر صاحب دنیا کے سات عجائبات بتائیے۔ بشیر صاحب نے بے ساختہ جواب دیا چھ آپ اور ساتواں میں۔ اس پر سب حاضرین خوب ہنسے اور داد دی۔ بہرحال یہ اجتماعات روحانی، علمی اور جسمانی تربیت کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتے تھے اور شاملین کے جذبۂ مسابقت کو جلاء دینے کا ذریعہ تھے۔

ورزشی مقابلہ جات میں ضلع سرگودھا اور ضلع لائلپور کے خدام جب کبڈی میں حصہ لیتے تھے تو دونوں طرف سے بڑے خوبصورت احمدی نوجوان مقابلہ کرتے اور یہ مقابلہ بڑا کانٹے دار ہوتا تھا۔ اس وقت کے کبڈی کے اچھے کھلاڑیوں میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں۔

سرگودھا سے چوہدری رفیق اور ان کا بھائی بشیر بہت عمدہ کھلاڑی تھے۔ اسی طرح تعلیم الاسلام کالج کی طرف سے نثار احمد جسیم بھی تھا اور طاقتور بھی تھا اور اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ لائلپور گوکھووال والے احمدیوں میں ایک نوجوان فتح محمد بہت طاقتور کھلاڑی تھا اور اس کا بھائی شیر محمد بھی اس کا خوب ساتھ دیتا تھا۔ جامعہ احمدیہ میں سید نثار احمد سرگودھا سے تھے۔ عبدالحمید ڈاہڈا اور چوہدری محمد حسین وغیرہ نہایت اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے۔

1953ء کے حالات

یونہی وقت گزرتے ہوئے 1953ء آن پہنچا جس میں جماعت کے خلاف بہت بڑی شورش بپا کی گئی تھی۔ جماعت احرار جن کا عمومی وقار قیام پاکستان کی مخالفت کے باعث گر چکا تھا، اس میں پیش پیش تھے اور پنجاب گورنمنٹ کی انہیں آشیرباد حاصل

تھی جبکہ ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ پنجاب تھے۔انہوں نے تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر کے ذریعہ مولویوں کو اکسایا اور نوازا۔دوسری طرف پنجاب بھر کے اخبارات کو بھی احمدیوں کے خلاف ایڈیٹوریل اور مضامین لکھنے کی ترغیب دی گئی۔ چنانچہ چند دنوں میں ملک کے اکثر حصوں میں مخالفت کی آگ بھڑکا کر احمدیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ان کے گھر جلائے گئے،اموال لوٹ لیے گئے،بعض افراد (راہِ مولا میں قربان) کیے گئے۔ دیہات تک بھی اس آگ کو پھیلا کر اکا دکا احمدیوں کو منحرف کرنے کی کوشش کی گئی۔لیکن یہ مخالفت کی آگ شمع احمدیت کے پروانوں کا بال بھی بیکا نہ کرسکی۔حضرت مصلح موعود کی تقریر وتحریر پر گورنر پنجاب آئی آئی چندریگر نے پابندی عائد کر دی اور کہا کہ اب مرزا محمود کی گردن میرے ہاتھ میں ہے دیکھیں کس طرح چھڑاتا ہے۔اس پر حضور رحمہ اللہ نے گورنر پنجاب کا نوٹس لانے والے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کو نہایت پرشوکت اور پر جلال جواب دیا جس کا ذکر حضور رحمہ اللہ نے بعد کے ایک خطبہ جمعہ میں فرمایا۔آپ نے اس کو فرمایا کہ

”بے شک میری گردن آپ کے گورنر کے ہاتھ میں ہے لیکن آپ کے گورنر کی گردن میرے خدا کے ہاتھ میں ہے۔آپ کے گورنر نے میرے ساتھ جو کچھ کرنا تھا وہ کرلیا اب میرا خدا اپنا ہاتھ دکھائے گا۔“

(خطبہ جمعہ فرمودہ 15/اگست 1958ء۔الفضل 5 ستمبر 1958ء)

اس پرُشوکت ارشاد کے چند روز بعد ہی امین الدین خان کو گورنر بنا دیا گیا اور چندریگر صاحب کو گھر بھیج دیا گیا۔الغرض احباب جماعت نے

جو خدا کا ہے اسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبہِ زار و نزار

کا نظارہ دیکھا۔

پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ

شورش زوروں پر تھی اور دولتانہ حکومت بظاہر بے بس نظر آرہی تھی اور وزیراعلیٰ وزیراعظم خواجہ ناظم الدین صاحب کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد مولویوں کے مطالبات تسلیم کرنے کے لیے فون کررہے تھے اور خواجہ صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنی گورنمنٹ کے وزراء سے مشورہ تو کر لینے دو۔ لیکن دولتانہ صاحب یہی کہہ رہے تھے کہ حالات قابو سے باہر ہوتے جارہے ہیں فوراً مطالبات تسلیم کیے جائیں۔

سکندر مرزا جو اس وقت سیکرٹری دفاع کے عہدے پر فائز تھے انہوں نے جنرل اعظم کو فون کر کے کہا کہ لاہور میں فوراً فوجیں داخل کردو اور آکر خواجہ صاحب کو کہا کہ میں نے اعظم خاں کو جو اس وقت لاہور میں کمانڈنگ آفیسر تھے، لاہور میں مارشل لاء لگانے کے لیے فون کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب کہنے لگے کہ میں وزیراعظم ہوں اور وزیر دفاع بھی، میری اجازت کے بغیر آپ نے یہ کام کیوں کیا؟ تو سکندر مرزا نے کہا کہ دستور میں مارشل لاء لگانا سیکرٹری دفاع کا کام ہے۔ چنانچہ اعظم خان نے لاہور میں دو گھنٹے کے اندر اندر امن قائم کر دیا اور علماء گرفتاریوں سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں تلاش کرتے پھرتے تھے۔

مارشل لاء کے بعد حالات معمول پر آنے شروع ہو گئے۔ گورنر صاحب کی طرف سے وجوہِ فسادات جاننے کے لیے ایک کمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا جو مسٹر جسٹس محمد منیر اور مسٹر جسٹس محمد رستم کیانی پر مشتمل تھا۔ اس تحقیقاتی عدالت میں علماء کی جو پردہ دری ہوئی اس کی تفصیل کے لیے فساداتِ پنجاب کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ شائع کردہ حکومت پنجاب کا مطالعہ از حد مفید ہوسکتا ہے۔ یہاں صرف یہ عرض ہے کہ احمدیوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دلوانے کا مطالبہ کرنے والے عدالت

میں کوئی دو عالم بھی مسلمان کی تعریف پر متفق نہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ فسادات بالکل ختم ہو گئے اور قافلۂ احمدیت خلافت کی رہنمائی میں پہلے سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔

عدالت کے سامنے ہمارے علماء کرام بھی پیش ہوئے، غیر از جماعت علماء بھی پیش ہوئے۔ ہماری طرف سے مکرم ملک عبدالرحمٰن خادم صاحب وکیل کا تو عدالت نے خاص طور پر شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے عدالت کی خوب مدد کی ہے مگر کسی غیر احمدی وکیل کی معاونت کا ذکر تک نہیں کیا۔

حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ کا عدالت میں بیان

عدالت میں حضور نوراللہ مرقدہٗ کا بھی بیان ہوا۔ تفصیل کے لیے تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کا یا تاریخ احمدیت جلد 16 کا مطالعہ کیجیے۔ حضور جب اس غرض کے لیے لاہور گئے تو اور خدام کے ساتھ حفاظتی ڈیوٹی کے لیے مجھے بھی ساتھ جانے کی سعادت ملی۔ چنانچہ جس راستہ سے حضور عدالت میں جاتے اور آتے اس راستہ پر ہم خدام کا پہرہ ہوتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ یہ سعادت ملی۔

احمد نگر میں بھی بعض اوقات رات کو گاؤں کے گرد پہرہ کی توفیق ملی۔ ایک بار جامعہ احمدیہ میں ہمارے اساتذہ کو خبر ملی کے احمد نگر کے اردگرد کے لوگ احمد نگر اور ربوہ پر حملہ کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ جامعہ میں چھٹی کر دی گئی اور طلباء کو اردگرد جا کر دیکھنے کے لیے طلب کر لیا گیا۔ خاکسار اور میرے کلاس فیلو نصیر احمد خاں صاحب دونوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ چنانچہ میں نے ڈاڑھی پر باریک مشین پھیر کر مقامی دیہاتیوں والی پگڑی باندھ لی اور نصیر خان صاحب نے پٹھانوں والی ریشمی لنگی سر پر باندھ لی اور شمالی جانب کے دو دیہات میں گھی لینے کے بہانے سے گئے لیکن ان

دیہات میں مخالفانہ اجتماع کے کسی قسم کے کوئی آثار نہ تھے جن کی رپورٹ پیش کر دی گئی۔اسی طرح خدام الاحمدیہ والوں کو اطلاع ملی کہ سیال موڑ کو جانے والے راستے پر مل سپرا گاؤں کے پاس کچھ لوگ ہیں ان کا پتہ کیا جائے۔چنانچہ مکرم مولانا عبدالمنان صاحب مرحوم اور میں سائیکل پر چاندنی رات میں وہاں پہنچے تو پاکستان ایئرفورس کے لوگ تھے جو سو رہے تھے اور ہم قریب سے آگے گزر کر موضع مل سپرا میں ایک احمدی سے ملنے چلے گئے۔

حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کا ربوہ میں درسِ قرآن

باوجود موسم کی سختی اور گرمی کے جس سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تھا حضور نے اغلباً ظہر کے وقت (بیت) مبارک میں درس قرآن شروع فرمایا اور سورہ مریم سے درس کا آغاز کیا۔میں احمد نگر سے آکر درس میں شریک ہوتا تھا۔حضور نے سورہ مریم کی آیت وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا سے حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے متعلق بتایا کہ فلسطین میں کھجور کا موسم جولائی اگست میں ہوتا ہے اس لیے قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش دسمبر کی بجائے جولائی اگست میں ہوئی جبکہ درختوں پر تازہ کھجوریں موجود تھیں اور یہ عیسائی دنیا کے لیے ایک چیلنج تھا۔آپ نے اپنے مؤقف کو بائبل کے حوالوں سے بھی ثابت کیا ہے۔تفصیل کے لیے تفسیر کبیر سورۂ مریم دیکھیں۔

احمد نگر کے بعض احمدی

احمد نگر میں احمدی تو مہاجر ہی تھے۔کچھ غوث گڑھ ہندوستان سے تھے اور زمیندار تھے۔ان میں چوہدری علی شیر صاحب، چوہدری وزیر علی صاحب، عبدالغفور

صاحب ٹانڈے والے، عبدالرحمٰن صاحب نمبردار نمایاں تھے۔ان کے علاوہ ضلع گورداسپور کے مہاجرین میں میاں محمد عبداللہ کشمیری صاحب اوران کے دوتین بھائی تھے۔قادیان سے میاں محمد بخش صاحب تھے جنہوں نے احمد نگر میں دودھ دہی کی دکان کھول لی۔ان کا ایک بیٹا محمد شفیع بھی تھا۔ان کے علاوہ مستری ناظر دین صاحب۔ باباما لی صاحب جو قادیان کے رہنے والے تھے۔اسی طرح محلّہ قادرآباد قادیان کے مستری نورالٰہی صاحب، احسان الٰہی صاحب، مولوی عبدالمنان شاہد صاحب، مولانا صدرالدین صاحب (مربی) ایران۔اسی طرح خیردین صاحب، سلیمان صاحب، غفور ستار صاحب اور یٰسین صاحب بھی احمدی مہاجر تھے۔

علاوہ ازیں مکرم محمد الطاف خان صاحب جو دہلی سے تعلق رکھتے تھے ان کا ایک بیٹا سخاوت حسین خان اور ان کے عزیز محمد امجد خان صاحب کریانے کی دکانیں چلاتے تھے۔سخاوت خان سے تو خاکسار کی خاصی دوستی تھی۔ 1953ء کے ایام میں سخاوت خان اور میں مل کر پہرے کی ڈیوٹی بھی دیتے رہے ہیں۔اب تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی اولادیں پروان چڑھ چکی ہیں بلکہ اولادوں کی اولادیں بھی احمدیت کے سپوتوں کی شکل میں مختلف دیاروامصار میں پھیلی ہوئی ہیں۔

میرا ایک خواب

1951ء میں مَیں نے خواب میں دیکھا کہ کسی فوجی خدمت پر مامور ہوں اور میری شادی ہوچکی ہے اور ابھی تک میں نے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا نہ ملا۔سامنے ایک کھلا سرسبز میدان ہے۔اچانک میں دیکھتا ہوں کہ میری بڑی ہمشیرہ اور سوتیلی والدہ دائیں بائیں ہیں اور درمیان میں ایک خاتون پرانی طرز کا لٹھے کا سفید رنگ کا برقعہ پہنے سامنے آئی ہے۔اس نے سرخ جوڑا پہنا ہوا ہے،اس کا رنگ بھی گورا ہے اور مجھے

بتایا گیا کہ یہ تیری بیوی ہے۔ چنانچہ میں ایک طرف کو چل پڑا ہوں اور وہ بھی میرے ساتھ چل پڑی ہے اور دیکھا کہ وہ میری بڑی فرمانبردار ہے۔

اسی طرح والد صاحب کی وفات سے ایک دو سال پہلے ہی مجھے ان کی وفات کے متعلق خیالات آنے شروع ہو گئے۔ ایک بار خیال آیا کہ اگر تیرے والد فوت ہو جائیں تو کیا ہوگا۔ بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس صدمے کے برداشت کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

امتحان مولوی فاضل

1953ء کا سال ایک طرف تو جماعت پر ابتلاء کا سال تھا دوسری طرف میرے مولوی فاضل کے امتحان کا بھی سال تھا۔ حالات کے قدرے پر سکون ہونے کے بعد میں امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ رات دن درسی کتب کے مطالعہ اور ان کو یاد کرنے میں محو ہو گیا۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کا امتحان تھا۔ میں اور میرے کلاس فیلو مئی 1953ء میں امتحان دینے کے لیے لائلپور جا کر بیت احمدیہ میں مقیم ہو گئے۔ روزانہ امتحانی سنٹر میں جاتے اور اس دن کا پرچہ حل کر کے دے آتے۔

حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کی سیرت طیبہ کا ایک اہم واقعہ

امتحان کے بعد کے حالات سے قبل ایک اہم واقعہ سپرد قلم کرنا ضروری ہے جس سے حضرت مصلح موعود کی سیرت طیبہ پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جامعہ محمدیہ بھوانہ ضلع جھنگ کا ایک طالبعلم جامعہ احمدیہ احمد نگر دیکھنے کے لیے آیا۔ جامعہ دیکھنے کے بعد حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ نے اس مہمان کی حضور سے ملاقات کے لیے میری ڈیوٹی لگائی۔ جب احمد نگر سے دفتر پرائیویٹ سیکرٹری

پہنچے اور ملاقات کے لیے نام لکھوایا۔ وقت سے قدرے پہلے برآمدہ میں انتظار کر رہے تھے کہ ہماری ملاقات کا وقت آ گیا۔ جیسے ہی میں اور وہ مہمان اندر داخل ہوئے حضور کھڑے ہو گئے، ہمیں شرفِ مصافحہ بخشا اور بیٹھ جانے کا ارشاد فرمایا۔ ہمارے بیٹھ جانے کے بعد حضور بھی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ اس مہمان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ملاقات پر مامور کارکن نے وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجائی۔ حضور گفتگو فرماتے رہے۔ اتنے میں دوسری گھنٹی بجی تو حضور نے بلند آواز سے فرمایا ٹھہرو۔ حضور گفتگو فرماتے رہے۔ جب حضور نے گفتگو ختم کی تو پھر کرسی سے اٹھ کر مصافحہ کا شرف بخشا اور رخصت ہوتے ہوئے میں مہمان کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضور ہمارے کمرے سے نکلنے تک کھڑے رہے۔ اس واقعہ کا اس مہمان پر تو عمدہ اثر ہونا ہی تھا جس کا اس نے اظہار بھی کیا۔ خود میں بھی حیران تھا کہ ہماری حیثیت کیا اور خلیفۂ وقت نے ہمیں کس قدر عزت و تکریم سے ملاقات کی سعادت بخشی۔ میرے لیے یہ واقعہ زندگی بھر کے لیے سبق کا موجب بن گیا کہ مہمان خواہ کوئی بھی ہو اس سے کھڑے ہو کر ملنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر عمل کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائی۔

والد صاحب کی علالت اور وفات

ملاقات والے واقعہ سے قبل مولوی فاضل کا امتحان دینے کا ذکر آ چکا ہے۔ امتحان کے بعد نتیجہ تک چھٹیاں تھیں۔ گھر پہنچا تو مصائب و مشکلات جیسے میری انتظار میں تھیں۔ والد صاحب کو بخار ہو رہا تھا ان کو ایک سرکاری ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بازار سے ایک دوائی لانے کو کہا۔ وہ لے کر آیا تو پھر بھی مطلوبہ دوائی ڈاکٹر صاحب سے نہ مل سکی۔ اسی اثناء میں والد صاحب کا بخار تپ محرقہ میں تبدیل ہو گیا اور مسلسل رہنے لگا۔ قریب کے گاؤں میں ایک طبیب تھے ان کو بلایا گیا۔ طبیب صاحب نے

کچھ دیسی ادویہ دیں۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد بخار اتر گیا۔لیکن پھر دوبارہ شروع ہوگیا اور پھر دو اڑھائی ماہ تک ہر طرح کے میسر علاج معالجہ کے باوجود بخار نہ اترا۔ دوسری طرف گاؤں میں زبردست سیلاب آ گیا۔ گاؤں ایک جزیرہ بن گیا۔ ماموں جو کاشتکاری کا کام کرتے تھے وہ بھی بیمار ہو گئے اور کام کے قابل نہ رہے۔مزید برآں نانی اماں بھی بیمار ہو گئیں۔ایک غربت دوسری بیماری اور تیسرا سیلاب ، پانی گھر کی دیواروں تک آ گیا۔گھر سے کنواں جس پر زمین تھی قریبا ایک کلومیٹر تھا۔گھر سے پانی میں قدم رکھنا ہوتا تھا اور کنویں کی زمین پر جا نکلتا تھا۔ پانچ مویشی تھے جن کو صبح شام چارہ ڈالنا ہوتا تھا۔ وہ بھی کمر تک پانی میں سے کاٹ کر اکٹھا کر کے سکھا کر جانوروں کو دینا ہوتا تھا۔ چنانچہ کنویں پر جاتا، پانی میں چارہ کاٹتا، اسے سکھاتا اور مویشیوں کو ڈالتا۔ دوپہر کو آ کر مریضوں کی ادویہ کے لیے اطباء کے پاس جاتا۔شام کو پھر کنویں پر۔ پانی بدستور تھا لیکن آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔قریبا دو ماہ تک میری یہی صورتحال برقرار رہی۔ دوسری طرف ابا جان دن بدن کمزور ہو رہے تھے۔ بخار اتر نہیں رہا تھا۔ میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہ رہا۔ اتنے میں مولوی فاضل کے امتحان کا نتیجہ اخبار میں آ گیا۔ میں اس میں پاس ہو گیا۔ والد صاحب کی وفات سے چھ روز قبل نتیجہ آیا۔ والد صاحب جو کمزور تھے نتیجہ سننے کے بعد یکدم اٹھ کر بیٹھ گئے اور والدہ کو کہا کہ عزیزوں میں گُڑ تقسیم کرو۔ ان ایام میں خوشیوں کے مواقع پر دیہاتی لوگ گڑ تقسیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ گڑ تقسیم کیا گیا۔ اس خیال سے کہ اب نتیجہ نکل آیا ہے اور تحریک جدید سابقہ ایام کا وظیفہ دے دے گی میں ربوہ گیا۔بعض دفتری مشکلات سے گزرنے کے بعد مجھے اغلبا تین چار ماہ کا وظیفہ جو 160 روپے سے کچھ زیادہ تھا مل گیا اور میں لے کر واپس چل پڑا۔ راستہ میں رات سخت بارش ہوئی۔ رات لاہور دہلی دروازہ کی (بیت الذکر) میں بسر کی اور صبح نارووال کو جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر بدوملہی سٹیشن پر

اترا۔ وہاں سے گاؤں جانے کے لیے کمر تک پانی میں سے گزرنا پڑا۔ کہیں پانی اور کہیں خشک راستہ۔ گھر پہنچا تو ابا جان کی طبیعت سخت خراب تھی۔ ان کو مل کر ان کے قریب بیٹھا تو یکدم اپنا ہاتھ اٹھا کر میرے سر پر رکھ دیا اور پھر انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ آپ کی آواز اس وقت نہیں نکلتی تھی۔ میری تایا زاد بہن جو میری بھاوج بھی تھیں، نے پوچھا کہ چچا جان کیا نذیر احمد کو اللہ کے سپرد کر رہے ہیں۔ انہوں نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ طبیعت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، والی صورتحال پیدا ہوگئی۔

آخر 13 اگست 1953ء کی وہ شام آ گئی جس سے بچنے کے لیے دو اڑھائی ماہ سے کوشاں تھا اور دعائیں بھی کر رہا تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ جانکندن کی حالت وارد ہو گئی۔ میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا روتے ہوئے عرض کیا میں آپ کی یہ حالت دیکھنے کی سکت نہیں پاتا۔ اشارہ سے فرمایا جاؤ پرے چلے جاؤ۔ (بیت) قریب تھی جا کر سجدہ ریز ہو گیا اور منہ سے یہ نکل گیا یا اللہ تیری رضا پوری ہو۔ میں اس میں راضی ہوں۔ واپس آیا تو ابا جان اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر چکے تھے۔ بھائی کمال الدین والد صاحب کی آنکھیں بند کر رہے تھے اور کھلے منہ کو بند کر رہے تھے۔ تمام عزیز رو رہے تھے۔ مسعود احمد کو بھی ابا جان سے شدید محبت تھی، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آپا عالم کی بیٹی اختری جو ہمارے ہاں پرورش پا رہی تھی، بڑے دردناک انداز میں کہہ رہی تھی ’’ہائے اللہ ساڈے میاں جی فوت ہو گئے، ہُن اسی کی کراں گے۔‘‘ میں نے اسے اٹھایا اور تسلی دی۔ میری آنکھوں کے آگے بھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ مستقبل کے تصور سے دل بیٹھ رہا تھا۔ بہرحال ابا جان کے سفر آخرت کی تیاری کی گئی اور رات کو ہی جنازہ پڑھ کے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا اور دعا کے بعد اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے گھر آ گئے۔ تعزیت کے لیے دوست احباب آتے رہے اللہ تعالیٰ ان سب کو

جزائے خیر دے۔ والد صاحب کی وفات کی خبر استاذی المکرّم مولانا ابوالعطاء صاحب کو جیسے ہی پہنچی آپ نے میرے نام تعزیت نامہ سپرد قلم فرمایا جو غالباً ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

والد صاحب کی وفات کو چند روز گزرے ہوں گے کہ ایک دن میرے دو بھائی، ماسٹر کمال الدین صاحب اور بھائی جلال الدین صاحب میری شادی کے بارہ میں مشورہ کرنے لگے اور رشتہ وہ تجویز کیا جو میری بڑی بہن والد صاحب کی بیماری کے دوران ایک خط میں مجھے تجویز کر چکی تھی۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ رشتہ کر لیا جائے تو یہ لوگ بہت امیر ہیں۔ بہت کچھ جہیز اور اشیاء دیں گے۔ اس کے جواب میں مَیں نے آپا کو لکھا تھا کہ آپا آپ کسی بھوکے کی بیٹی نہیں ہو۔ آپ کی دو بار والد صاحب نے شادی کی تو آپ کو کیا نہیں دیا تھا۔ اگر آج ہم پاکستان بننے کے بعد غربت کی زد میں آگئے ہیں تو کیا ہمیں دوسروں کی دولت کی طرف دیکھنا زیب دیتا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ لڑکی ناخواندہ ہے۔ میں زندگی کی دوڑ میں ایسے ساتھی کو شریک کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ مساوی دوڑ سکے۔ اگر مجھے کسی سے کچھ ملنا ہوتا تو یہ پاکستان نہ بنتا۔ میرے والد نے میرے لیے اتنا کچھ بنایا ہوا تھا کہ میری اگلی نسل بھی استعمال کرتی تو ان کے لیے بھی کافی ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہت دے گا لیکن کسی کا احسان مند نہیں کرے گا۔ اس لیے مجھے معاف کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے تو والد صاحب کی زندگی کی فکر لاحق ہے اور آپ کو میری شادی کی فکر ہے۔ پس اس کو رہنے دیں۔ بھائیوں نے نہ جانے کس موزونیت کے تحت مجھے اس رشتہ کی پیشکش کی۔ میں نے مہذبانہ طور پر جواب دیا کہ اس لڑکی کے حالات اور میرے حالات کو دیکھیں، میری تعلیم کو دیکھیں، میرے مستقبل کو دیکھیں، اگر کوئی مناسبت ہے تو ٹھیک ہے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ اگر ہم مناسب خیال کریں

اور تم مناسب نہ سمجھو تو پھر؟ میں نے مہذبانہ طور پر کہا کہ پھر سمجھو کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کے سامنے ذبح کر لیا ہے۔اس جواب کو انہوں نے رضا مندی قرار دے لیا۔ میری والدہ بھی اس رشتے کے حق میں تھیں۔ چنانچہ بھائیوں نے لڑکی کے والد سے بات کی تو انہیں بے حد خوشی ہوئی۔ بہرحال رشتہ طے ہو گیا اور خدا کی تقدیر اس طرح ظاہر ہوئی کہ میرے سسرال والوں کے سترہ آدمیوں پر مخالفین نے ایک خوفناک فوجداری مقدمہ بنا دیا۔ چنانچہ سترہ آدمی جیل چلے گئے۔ تمام کاروبار بند ہو گئے۔ مقدمہ پر بے شمار اخراجات اٹھنے لگے حتی کے ان کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی۔

والد صاحب کی وفات کے بعد میرا جامعۃ المبشرین میں داخلہ

والد صاحب کی وفات کے بعد ان کی نصیحت و ہدایت کے مطابق مجھے چونکہ وقف میں رہنا تھا اس لیے میں ربوہ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے چلتے وقت میرے عزیزوں میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ مجھ سے پوچھتے کہ تمہارے پاس کرایہ بھی ہے یا نہیں۔اور میری غیرت نے بھی کسی سے اس بارہ میں ذکر کرنا گوارا نہ کیا۔ایک پیسہ بھی پاس نہ تھا۔ چھوٹی ہمشیرہ سے پانچ روپے ادھار لیے اور ربوہ کو چل پڑا۔ میڈیکل تو ہو ہی چکا تھا۔ مکرم ناظر صاحب تعلیم حضرت مولوی محمد الدین صاحب اور اصلاح و ارشاد کے نمائندہ ایک اور بزرگ نے میرا انٹرویو کیا اور مجھے داخل کیے جانے کا فیصلہ فرما دیا۔ ہاں شاید یہ بھی پوچھا گیا کہ اگر ہم آپ کو وقف سے فارغ کر دیں تو کیا کرو گے۔ میں نے کہا مزدوری کر سکتا ہوں۔ تھوڑی سی محنت سے کوئی دستکاری سیکھ سکتا ہوں۔ اس پر انہوں نے مجھے داخلہ دینے کا فیصلہ فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

جامعۃ المبشرین ان دنوں تحریک جدید کے خالی کردہ کچے دفاتر میں تھا۔ یہیں

ہوسٹل بھی تھا جو اغلباً بعد میں دارالصدر کے آخر میں ریلوے لائن کے قریب ریلوے پھاٹک سے پہلے بڑے لنگر خانہ میں منتقل ہو گیا جہاں ایک کھلے شیڈ کے نیچے تنور لگے ہوتے تھے اور تقسیم خوراک کے لیے جو چھوٹے مختلف کمرے بنے ہوتے تھے ان میں رہائش اختیار کی گئی۔ جامعۃ المبشرین کے پرنسپل جناب مولانا ابوالعطاء صاحب تھے۔ آپ کے علاوہ دیگر سٹاف کا بھی آئندہ صفحات میں ذکر آجائے گا۔ انشاءاللہ

اب مجھے ساڑھے 32 روپے وظیفہ ملتا تھا۔ ہوسٹل میں صرف کھانے کا خرچ پچیس روپے ماہوار تھا۔ اس لیے میں نے ہوسٹل سے باہر اپنے بہنوئی کے ساتھ رہائش اختیار کی جن کو امور عامہ میں مددگار کارکن ہونے کے باعث رہائش ملی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اپنا کھانا خود پکاتے۔ بھائی گاؤں سے گھی کا کنستر لاتے جو ہم فروخت کر کے کھانے کے لیے گھی بچا لیتے۔ اس طرح میرا کھانے کا خرچ صرف گیارہ روپے ماہوار تھا۔ باقی پیسے دیگر اخراجات کے لیے بچ جاتے جس سے میں نہایت عمدگی کے ساتھ اپنے سارے اخراجات پورے کر لیتا، لیکن نہایت سادگی سے۔ اسی عرصہ میں مولانا عبدالباسط صاحب کے ساتھ مجھے قادیان جلسہ سالانہ پر جانے کا شرف حاصل ہوا۔ صرف سات روپے میں دفتر خدمت درویشاں نے پاسپورٹ بنوایا اور اس پر لاہور سے ویزہ بھی آسانی سے مل گیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں لنگر خانہ میں اس سال تقسیم سالن کی ڈیوٹی دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس وقت قادیان میں صرف درویش تھے اور بیرون سے بہت کم لوگ آتے تھے اس لیے بیت الدعا میں خوب دعائیں کرنے کا موقع مل جاتا جس سے جی بھر کر استفادہ کیا۔ وہاں اس وقت پہننے کے لیے بہت عمدہ کپڑے سستے مل جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی وہاں سے کپڑے خریدے۔ واہگہ بارڈر سے آنا جانا تھا۔ لاہور سے واہگہ تک بس پر اور بارڈر پار کر کے وہاں سے امرتسر بس پر جانا ہوتا۔

اب ربوہ جامعۃ المبشرین میں داخلہ مل چکا تھا۔ جامعۃ المبشرین کا کورس بہت بڑا تھا۔ دس مضامین تھے جن میں سے ہر مضمون کے دو حصے تھے۔ اس طرح کل بیس پرچے امتحان میں حل کرنے تھے اور کم از کم پچاس فیصدی نمبر لینے پاس ہونے کے لیے ضروری تھے۔ ایک طرف اتنا بڑا امتحان کا کورس دوسری طرف والد صاحب کی وفات کا تازہ تازہ صدمہ تیسری طرف گھر والوں کی غربت کی فکر۔

رات دن پریشانی میں بسر ہونے لگے۔ ایک دن رات کو والد صاحب کی وفات اور ان دنوں کے حالات لکھ رہا تھا کہ اچانک آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو کاغذ پر گرنے لگے۔ یکدم اللہ تعالیٰ نے توجہ اس طرف پھیری کہ آخر مَیں روتا کیوں ہوں۔ اس لیے کہ والد صاحب زندہ ہوتے تو مجھے دنیاوی طور پر بہت سارے فوائد ہوتے؟ اتنا خیال آنا تھا کہ یکدم دل میں آیا کہ اب جتنا چاہو رولو والد صاحب تو واپس نہیں آئیں گے۔ اس لیے رونے کی بجائے ان کے لیے دعا کیا کرو۔ اس خیال کے ساتھ ہی آئندہ رونا بند ہو گیا اور والد صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی توفیق ملنے لگی۔ انہی پریشانیوں کی حالت میں جلسہ سالانہ آ گیا۔

جلسہ سالانہ 1953ء

جلسہ کی ڈیوٹیوں میں حفاظت کی ڈیوٹی کے لیے منتخب ہوا۔ 1953ء مخالفت اور شورش کا سال تھا۔ حفاظتی طور پر بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جامعہ کے نوجوان اور دوسرے خدام باحسن وجوہ اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ مجھے رات اور دن میں تین تین گھنٹہ کے لیے قصرِ خلافت کے گرد حفاظت کی ڈیوٹی دینے کا بھی شرف حاصل ہوا اور حضور کے آمد و رفت کے راستہ پر بھی پہرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ حفاظت کے انچارج اس وقت غالباً جمعدار شیر احمد خان صاحب تھے۔ اسی جلسہ سالانہ میں

حضرت مصلح موعودؓ نے وہ معرکۃ الآراء خطاب فرمایا جو نوبت خانہ کے عنوان سے معروف ہے۔ خطاب کے آخر پر حضور نے پر شوکت الفاظ میں فرمایا

''اب خدا کی نوبت جوش میں آئی ہے اور تم کو، ہاں تم کو، ہاں تم کو، خدا تعالیٰ نے پھر اس نوبت خانہ کی ضرب سپرد کی ہے۔ اے آسمانی بادشاہت کے موسیقارو! اے آسمانی بادشاہت کے موسیقارو! اے آسمانی بادشاہت کے موسیقارو!!! ایک دفعہ پھر اس نوبت کو اس زور سے بجاؤ کہ دنیا کے کان پھٹ جائیں۔......''

میں نے حضور کی یہ تقریر اور یہ پر جلال الفاظ اپنے کانوں سے سنے تھے اور اس جلسہ میں حاضری کی سعادت سے بہرہ ور ہوں۔ حضور کا یہ آخری دن کا خطاب تھا۔ اس کے بعد جلسہ کے بخیر و خوبی ختم ہونے کی خوشی میں شیر احمد خاں صاحب نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کے سر کے اوپر سے رائفل کے فائر بھی کیے تھے جو میرے سامنے کی بات ہے۔ اس وقت ربوہ میں بے حساب گرد و غبار ہوتا تھا۔ کچھ لوگ جو اپنی گاڑیوں پر آئے تھے ان کی گاڑیوں سے بہت گرد اڑتی تھی جس سے عام لوگ متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو بھی حضور نے آہستہ گاڑیاں چلانے کی طرف توجہ دلائی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور کچھ منتظمین نے بھی چھڑکاؤ کا انتظام کیا جس سے لوگوں کو اس مشکل سے آرام مل سکا۔

1953ء کے جلسہ سالانہ ربوہ میں مَیں والد صاحب مرحوم کے دو دوستوں چوہدری شیر محمد صاحب چٹھہ اور چوہدری محمد شفیع صاحب نمبر دار چک نمبر 145/RB سے ملنے ان کی قیام گاہ پر گیا۔ وہ نہایت بشاشت اور محبت سے پیش آئے۔ والد صاحب کی وفات پر تعزیت کی اور فرمایا دیکھو بھائی صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ ہم آپ کے سر پر زندہ موجود ہیں کسی بھی قسم کی کوئی مشکل یا ضرورت ہو تو ہم ہر طرح مدد کے لیے تیار ہیں اور عملی زندگی میں انہوں نے اپنا یہ قول سچا بھی کر کے دکھایا۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ دل میں ان کے لیے بے حد جذبات تشکر پیدا ہوئے اور دعائیں نکلیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

میرے ربوہ آنے کے بعد میرے بھائیوں نے میرے رشتے کی بات پکی کر لی۔ جلسہ سالانہ پر میرے سسرال میں سے بھی کچھ افراد آئے تھے جن کو واپس سندھ بھیجنے کے لیے خانیوال تک ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ تو اس رشتہ پر بے حد خوش تھے۔

امتحان کی تیاری اور بعض دلچسپ واقعات

اب امتحان بالکل قریب تھا اور دل نے کہا کہ چلو امتحان کی تیاری کرو اور امتحان تو دو۔ چنانچہ زور شور سے پڑھائی شروع کر دی۔ لنگر خانہ میں ایک کمرہ ملا ہوا تھا جس میں مَیں اکیلا رہتا تھا۔ ایک چارپائی، ایک میز کرسی اور ایک مصلّٰی بچھایا ہوا تھا۔ بازار سے کچھ دودھ لے آتا تھا۔ دیسی ساختہ شکر بھی میسر تھی۔ صبح ناشتہ کے بعد میز کرسی پر بیٹھ کر پڑھائی کرتا، وہاں اگر تھک جاتا تو چارپائی پر لیٹ کر پڑھ لیتا اور اگر وہاں اونگھ آنے لگتی تو چٹائی پر بیٹھ کر پڑھنے لگ جاتا۔ عصر کے بعد ہوسٹل سے باہر کتاب لے کر نکل جاتا اور نماز مغرب کے بعد واپس آتا۔ شام کے کھانے اور نمازوں کے بعد پھر لیمپ جلا کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ رات گئے تک پڑھتا جب نیند آتی تو چائے کا کپ بنا کر پی لیتا۔ اس چائے کے لیے نہ چولہا نہ سٹوو۔ صرف وہ لیمپ جس کے نیچے شیشے کی بڑی ٹنکی جس میں مٹی کا تیل اور اوپر شیشے کی چمنی ہوتی تھی۔ لوہے کا ایک سٹینڈ بنا کر جو نیچے سے بھی گول ہوتا تھا اور دائرہ ذرہ بڑا ہوتا تھا اور اوپر سے بھی گول ہوتا تھا۔ تین لوہے کے سریے اس میں لگے ہوتے تھے۔ اس کو لیمپ کے اوپر رکھ کر اوپر والے چھوٹے رِنگ پر پانی کسی سلور کے برتن میں رکھ دیا جاتا۔ اس میں چائے کی پتی ڈال دی جاتی اور کچھ پکنے پر اس میں شکر اور دودھ ملا کر پی کر پھر پڑھائی شروع کر دی

جاتی۔ بلا مبالغہ رات دن میں سونے اور کھانے اور نمازوں کے لیے چھ گھنٹے وقت ملتا، اٹھارہ گھنٹے تک سٹڈی کرتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے 1954ء میں امتحان دیا تو 55 فیصد نمبر لے کر پہلے سال میں پاس ہو گیا۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

میں چائے کے لیے دیسی شکر میز پر رکھ چھوڑتا تھا اور میرے کلاس فیلو عبدالحکیم اکمل صاحب کمرے میں آتے ہی شکر کھانا شروع کر دیتے۔ ایک دن میں نے وہاں میگسلف رکھا ہوا تھا اور شکر وہاں نہیں تھی۔ عبدالحکیم صاحب اندر آتے ہی بڑی خوشی سے کہنے لگے آج تو ولایتی چینی پڑی ہوئی ہے اور ایک پوسٹ کارڈ دوہرا کر کے میگسلف کا بھرا، ادھر انہیں دیکھ کر میری ہنسی ضبط نہ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ضبط کیا اور اکمل صاحب نے وہ میگسلف منہ میں ڈال لیا۔ ظاہر ہے وہ سخت کڑوا تھا۔ تھوتھو کرتے باہر بھاگے اور میری ہنسی ضبط نہیں ہو رہی تھی۔

اسی طرح مکرم محمد عمر صاحب بی اے مرحوم ہمارے کلاس فیلو تھے۔ ایک دن ان کے کمرے میں ایک دولڑکے گئے۔ دیکھا کہ عمر صاحب سردیوں کے موسم میں اوور کوٹ سمیت لحاف میں پڑے ہیں۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا عمر صاحب یہ کیا آپ کوٹ پہن کر سو رہے ہیں جواباً فرمایا کیا آپ کوٹ اتار کے سوتے ہیں؟

امتحان کے بعد کی تعطیلات میں مَیں گھر گیا تو بھائیوں نے رشتہ تو طے کر ہی لیا تھا اب اصرار کرنے لگے کہ شادی کرتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ جب تک تعلیم مکمل نہیں ہوتی میں نے شادی نہیں کرنی۔

تعارف اساتذہ کرام جامعۃ المبشرین ربوہ

میں کدھر نکل گیا۔ مجھے تو جامعۃ المبشرین کے معزز و محترم اساتذہ کا تذکرہ کرنا تھا۔ جامعۃ المبشرین میں جن معزز اساتذہ سے فیض کے حصول کا موقع نصیب ہوا ان

کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔ساتھ کچھ تعارف کی بھی کوشش ہوگی۔

حضرت مولانا ابوالعطا صاحب فاضل

ان کا تعارف تو جامعہ احمدیہ کے اساتذہ کرام میں گزر چکا ہے۔ عالم باعمل اعلیٰ درجہ کے تقویٰ شعار، نہایت شفیق اور ہمدرد۔ میرے ساتھ تو ان کا اس وقت سے خصوصی تعلق تھا جب تقسیم ملک کے اعلان کے بعد خاکسار آپ کے مکان پر خبریں سننے جایا کرتا تھا۔قادیان میں ہمارا مکان حضرت مولانا کے مکان کے بالکل قریب تھا۔

پاکستان آنے کے بعد میں گوناگوں مشکلات سے دوچار تھا۔مولوی فاضل کے امتحان کے بعد جامعۃ المبشرین میں داخلہ سے تھوڑا عرصہ قبل والد صاحب کی وفات ہوگئی تھی اور ان کا اصرار تھا کہ میں نے وقف میں رہنا ہے۔اس لیے داخلہ لے لیا۔ لیکن گھریلو حالات کی ابتری کے باعث بہت پریشان تھا۔تعلیم جاری رکھنا بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ان حالات میں حضرت مولانا کی شفقت و محبت اور دعاؤں کے طفیل پڑھائی جاری رکھنا میرے لیے ممکن ہوا اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ میں نے شاہد سال اول کا امتحان محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاس کرلیا۔

مکرم ومحترم ملک سیف الرحمان صاحب فاضل۔مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ

محترم ملک سیف الرحمان صاحب کے آباءواجداد کھتکہ ضلع خوشاب کے رہنے والے تھے۔آپ کے والد صاحب کا اسم گرامی مولوی امام الدین صاحب تھا جو علم و فضل اور بزرگی میں علاقہ بھر میں مشہور تھے۔جناب ملک صاحب اسی گاؤں میں 11 نومبر 1914ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔بعدازاں تمن ضلع کیمل پور میں صرف ونحو اور فقہ کی تعلیم ایک فاضل دیوبند استاد سے حاصل کی۔اسی

طرح دارالعلوم نعیمیہ نیلا گنبد لاہور میں بھی علمی تشنگی دور کرتے رہے۔ گویا احمدیت قبول کرنے سے پہلے آپ پختہ عالم دین بن چکے تھے اور احمدیت کے سخت مخالف تھے۔ مجلس احرار کی مجلس سیف الاسلام کے ممبر تھے۔ احمدیوں کے جلسے درہم برہم کرنے میں بہت سرگرم ہوا کرتے تھے۔ 1934ء کی قادیان میں احرار کانفرنس میں شریک تھے۔ قادیان کا اندرونی پاکیزہ ماحول دیکھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قبر پر دعا کرنے کی توفیق ملی اور اندر ہی اندر احمدیت دل میں گھر کرنے لگی۔ آخر 1935ء کے جلسہ سالانہ قادیان میں شریک ہو کے دل کی گرہیں کھل گئیں۔ اس جلسہ میں جناب ملک صلاح الدین صاحب کے اصرار پر محترم ملک سیف الرحمٰن صاحب تشریف لائے تھے۔ حضرت مصلح موعود کی پر معارف تقاریر سننے کے بعد یکم جنوری 1936ء کو حضرت مصلح موعود کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کی۔

1938ء میں حضرت مصلح موعود نے احمدی علماء کے علم میں وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے فیصلہ فرمایا کہ علوم متداولہ۔ منطق، حدیث، فقہ وغیرہ کی مزید تحصیل کے لیے کچھ واقفین کو دہلی اور دوسرے شہروں میں بھیجا جائے۔ ان میں مکرم و محترم ملک سیف الرحمان صاحب بھی شامل تھے اور پھر ایک وقت آیا کہ جامعۃ المبشرین کے وائس پرنسپل، فقہ کے پروفیسر، جامعہ احمدیہ کے پرنسپل اور بالآخر مفتی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے معزز منصب پر سرفراز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین

محترم مولانا محمد احمد صاحب جلیل

آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب حلال پوری رفیق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ آپ کے والد ماجد جماعت احمدیہ کے صف اول کے متبحر علماء کرام میں سے تھے۔ مکرم مولانا محمد احمد صاحب جلیل نے حضرت مصلح موعود کی

زیر ہدایت علم حدیث میں تخصص کیا تھا اور آپ دہلی سے علم حدیث حاصل کر کے آئے تھے مجھے بھی آپ سے دورانِ تعلیم شاہد کلاس میں بخاری پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔آپ کی سرکردگی میں ایک دلچسپ تفریحی سفر بھی کیا جس میں عبدالباسط صاحب، عبدالحکیم اکمل صاحب، محمد طفیل منیر صاحب، عبدالرشید رازی صاحب، مکرم خان بشیر احمد رفیق صاحب، عبدالعزیز جمن بخش صاحب (شاید برٹش گیانا کے تھے)، خاکسار نذیر احمد رہان شامل تھے۔مولانا غلام باری سیف صاحب بھی ہمراہ تھے۔ یہ سفر ایبٹ آباد، بالاکوٹ، ناران، بٹہ کنڈی سے لے کر جھیل لولوسر تک تھا جس کی تفصیل کسی دوسری جگہ انشاءاللہ تحریر ہوگی۔امیر قافلہ ہونے کے لحاظ سے مولانا نے ہر طرح سے اپنے ماتحتوں کا خیال رکھا۔آپ نہایت درجہ زندہ دل، شفیق اور ہمدرد اور معاملہ فہم بزرگ تھے۔آپ جامعۃ المبشرین کے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔

مولانا غلام باری سیف صاحب

قادیان سے تھوڑے فاصلہ پر کاہنواں گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی احمدی تھے۔قادیان میں ہی تعلیم حاصل کی۔ اغلباً حدیث کے متخصص تھے۔ہمیں علم کلام پڑھاتے تھے۔ بڑے اعلیٰ پایہ کے مقرر تھے۔ایک بار قادیان کے جلسہ سالانہ میں بھی میں نے ان کی تقریر سنی ہے۔سیرت النبیؐ کی تقاریر خاص طور پر بہت مؤثر ہوتی تھیں۔ وادی کاغان کی سیر میں ہمارے ساتھ تھے۔ کھانے پینے میں بھی خوش خور تھے۔زندگی کی آخری سانس تک خدمت دین کی توفیق پائی ہے۔

مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب

مولانا کے والد محترم کا اسم گرامی حضرت منشی عبدالحق صاحب تھا۔بہترین کاتب

تھے۔حضرت مصلح موعود نے مولانا ابوالمنیر صاحب کو اپنی خصوصی تربیت میں لے لیا تھا۔میں جب پہلی بار مڈل کا امتحان دے کر قادیان گیا اور والد صاحب نے مجھے حضور کی خدمت میں پیش کیا تو مولانا ابوالمنیر کے توسط سے ہی پیش کیا گیا۔حضور نے فرمایا نتیجہ نکلنے پر لے کر آئیں۔نتیجہ کے بعد جب پھر حضور کی خدمت میں والد صاحب کے ہمراہ (بیت) مبارک میں پیش ہوا تو پیشکار مولانا ابوالمنیر نورالحق ہی تھے۔جب ہجرت کے بعد میں قادیان سے لاہور آیا ہوں اس وقت بھی مولانا ابوالمنیر صاحب اہم امور سرانجام دے رہے تھے۔بہر حال یہ ہمارے تفسیر کے استاد تھے اور عربی تفسیر کشاف درسًا پڑھاتے تھے۔تفسیر کبیر کی تصنیف میں حضور کے معاون خصوصی تھے۔ آخری دم تک خدمت دین کی توفیق پائی ہے۔مجھے بھی ان کی زندگی کے آخری سالوں میں ان کے ساتھ مل کر بخاری شریف کے 16 تا 19 پارہ تک کے ترجمہ اور تشریح کو قابل اشاعت بنانے میں معاونت کی سعادت حاصل ہے۔انتہائی محنت سے کام کرتے تھے۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنے ترجمۃ القرآن کی نظر ثانی کے لیے سید عبدالحی صاحب مرحوم کے ساتھ ان کو بھی اس بورڈ میں شامل کیا ہوا تھا۔ربوہ میں ایک وقت میں یہ قائد خدام الاحمدیہ بھی منتخب ہوئے۔مجھے بھی ان کے ایام قیادت میں خدمت کی توفیق ملی ہے اور مولانا عبدالباسط صاحب بھی ان کی مجلس عاملہ کے اہم رکن تھے۔

مکرم مولانا محمد احمد صاحب ثاقب

ان کے والد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے (رفیق) تھے۔یہ فقہ کے متخصص تھے اور فقہ پڑھاتے تھے۔اپنے مضمون کے ماہر تھے۔نہایت شریف النفس اور کم گو تھے۔بہت لمبی عمر پائی ہے۔18 مئی 2015ء کو وفات پائی۔اناللہ وانا الیہ راجعون

یہ تھے ہمارے اساتذہ کرام۔اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنہوں نے ہماری روحانی اور علمی تربیت کی اوراعلیٰ انسانی اقدار سے آگاہی بخشی۔ نیز ہمیں وقف زندگی کے حقیقی تقاضوں سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ وقف کی حقیقی روح کوٹ کوٹ کر ہمارے دلوں میں بھر دی۔اللہ تعالیٰ ان سب کو اجرِعظیم عطا فرمائے اور اعلیٰ علیین میں شامل فرمائے۔آمین

درجہ شاہد

شاہد سال اول کے امتحان میں کامیابی کے بعد سال دوم کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔حسبِ سابق وظیفے کے اندر گزر بسر کرنے کے لیے اپنے بہنوئی کے ہاں رہتا تھا اور دونوں مل کر کھانا پکاتے تھے۔ اس سے مجھے اچھی طرح کھانا پکانا آ گیا۔اور ہوسٹل کی نسبت زیادہ سادہ غذا کے استعمال کے باعث اخراجات بھی بہت کم ہوتے تھے۔حضرت مصلح موعودنوراللہ مرقدہٗ ربوہ میں قیام فرما ہو چکے تھے۔ چنانچہ ہر جمعہ حضور کے خطبہ کی سماعت سے روحانی بالیدگی حاصل ہوتی تھی۔خدام الاحمدیہ میں بھی مختلف ڈیوٹیوں کی توفیق ملتی تھی۔

سفر کاغان

غالباً1954ء کی گرمیوں کی تعطیلات میں جامعۃ المبشرین کی طرف سے طلباء کے لیے کاغان کے تفریحی سفر کا اہتمام کیا گیا۔سفر میں مکرم مولانا محمد احمد صاحب جلیل انچارج،مولانا غلام باری صاحب سیف نائب تھےاور دیگر شرکاء کے اسماء کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔شام کو چناب ایکسپریس کے ذریعہ سفر شروع ہوا۔اگلے روز ٹیکسلا ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ وہاں ٹیکسلا کے بدھ مت کے زمانہ کے آثار قدیمہ دیکھے اور بعض

تصاویر بھی لیں۔ٹیکسلا سے بذریعہ ویگن حویلیاں گئے۔حویلیاں سے غالباً سرحد گورنمنٹ کی بس سے ایبٹ آباد پہنچے۔ایک دوروز تک ایبٹ آباد کی سیر کی۔سخت گرمی سے گئے تھے۔ایبٹ آباد کا موسم ربوہ کی نسبت کافی ٹھنڈا تھا۔ایبٹ آباد سے بذریعہ بس براستہ مانسہرہ بالاکوٹ روانہ ہوئے۔پہاڑی سفر تھا اور موڑ بہت زیادہ تھے۔اکثر مسافروں کو قے اور متلی شروع ہوگئی۔ڈرائیور نے ایک جگہ بس روک کر ایک پودے سے اس کے گول گول اور سبز سبز پھل توڑ کر منہ میں رکھنے کے لیے دیے تو الٹی غائب ہوگئی۔گویا اللہ تعالیٰ نے جہاں کا مرض تھا وہاں اس کی دوائی بھی پیدا کی ہوئی تھی۔چند لمحے رکنے کے بعد سفر شروع ہوگیا اور بالاکوٹ پہنچ گئے۔یہاں اس وقت خان غلام ربانی صاحب اور خان غلام سرور خان صاحب کا گھرانہ احمدی تھا۔ان سے رابطہ ہوا۔شام کو ان کے ہاں مہمان تھے۔شام کا کھانا فرش پر کپڑا اچھا کر اوپر دستر خوان بچھا کر کھایا بڑے بڑے طاس بھر کر پکا ہوا گوشت لایا گیا۔اب تو صرف اتنا ہی یاد رہ گیا۔روٹی کی کیا صورت تھی وہ اب یاد نہیں۔بالاکوٹ میں دریائے کنہار کے کنارے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر دعا کی توفیق ملی لیکن میں حضرت شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر نہ جاسکا۔

اس وقت بالاکوٹ سے ناران جانے والی کچی پہاڑی سڑک تھی جس پر ایک وقت میں صرف ایک جیپ چل سکتی تھی۔بالاکوٹ سے ناران دن میں دوتین سروسز جاتی تھیں۔بہرحال صبح جانے والی جیپ سروس میں جگہ مل گئی۔سڑک تنگ تھی وادی سے ایبٹ آباد کی طرف آنے والے لوگ اپنے مویشیوں کے ہمراہ محوِ سفر تھے۔جیپ اونچے نیچے پہاڑوں سے گزرتی ہوئی منزلوں کی طرف رواں تھی۔بعض جگہ سڑک پر برف کے بڑے بڑے تودے تھے جن کو کاٹ کر راستہ بنایا ہوا تھا اور جیپ سے اتر کر گزرنا پڑتا تھا۔راستہ کے دونوں طرف برف کی چھ چھ سات فٹ دیوار بنی ہوئی تھی۔

ایک جگہ جا کر جیپ بھی کھڑی ہوگئی تا کہ ناران سے آنے والی جیپ کو جس نے بالا کوٹ جانا تھا راستہ دے سکے۔ سڑک دریائے کنہار کے کنارے کنارے جا رہی تھی لیکن دریا سے کافی بلندی پر۔ مگر دریا کا شفاف پانی بہتا ہوا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی عمارتی لکڑی بھی بہتی نظر آ جاتی تھی۔ پہاڑیوں پر بلند و بالا بہت موٹے موٹے چیل اور دیودار کے درخت تھے۔ دور دراز پہاڑیوں پر رہنے والے لوگ بھی قافلوں کی صورت میں اپنے گدھوں اور بکریوں پر تھوڑا سا سامان ضرورت لادے محو سفر تھے۔ تا حد نگاہ بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ بالآخر جیپ خراماں خراماں ناران پہنچ گئی۔ یہاں ہوٹل میں رہائش تھی۔ کھانا اپنا تھا۔ چنانچہ غلام محمد صاحب نے گوشت پکایا اور سب نے خوب کھایا۔

اگلے دن ناران سے جھیل سیف الملوک کی سیر کا پروگرام تھا۔ ایک گائیڈ لیا جس کی عمر دس بارہ سال ہوگی۔ چنانچہ اس کی رہنمائی میں جھیل کے لیے پہاڑوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ راستہ میں ایک نالہ تھا جس پر کوئی پل تو نہیں تھا مگر ایک موٹی سی لکڑی رکھ کر پل بنایا گیا تھا جس پر چلتے مجھے تو بہت ڈر لگ رہا تھا تاہم نالہ پار کیا تو آگے ایک بہت لمبا چوڑا برف کا گلیشیر تھا جس پر پگڈنڈی بنی ہوئی تھی اس کو عبور کر کے جھیل سیف الملوک پہنچے تو سخت بادل آ گئے۔ خوب سردی ہوگئی کچھ ٹھنڈی ہوا بھی چل پڑی۔ ادھر بھائی غلام محمد باورچی پلاؤ پکانے میں مصروف تھا۔ سٹوو جل رہا تھا دیگچے میں پانی بمع چاول ابلے جا رہا تھا لیکن چاول ہیں کہ گلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پریشر ککر ہمارے پاس نہیں تھا۔ بلندی پر ہوا کے کم دباؤ کے باعث چاول درست طور پر پک نہیں رہے تھے۔ آخر اسی طرح کے کچے پکے کھا لیے اور وہاں کا پانی پیا تو سب کچے پکے چاول ہضم ہو گئے۔ سیف الملوک بہت خوبصورت لگ رہی تھی چاروں طرف بلند پہاڑ اور درمیان میں جھیل قدرت کا عجیب تحفہ اور دیدنی منظر تھا۔ خصوصاً

ہمارے لیے جنہوں نے زندگی میں اس سے قبل ایسے مناظر نہیں دیکھے تھے۔ شام ہونے سے قبل وہاں سے چل کر واپس ناران آ گئے۔ راستہ میں رہنما لڑکے سے ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا کہ آپ کتنے روز بعد نہاتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ پچھلے سال بالاکوٹ گیا تھا وہاں نہایا تھا۔

دو روز ناران قیام کے بعد وہاں سے اگلے سفر کے لیے سامان خچروں پر لدوایا اور خود پیدل چلنا شروع کیا۔ بٹہ کنڈی بارہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ سڑک وہی کچی تھی۔ وہاں ایک یوتھ ہوسٹل بن رہا تھا اس میں رات بھر کے لیے رہائش مل گئی۔ غلام محمد صاحب نے کھانا پکایا اور سب نے مل کر کھایا۔ بٹہ کنڈی کے پاس سڑک کے کنارے ایک بلند پہاڑ تھا جسے لالہ زار کہا جاتا تھا۔ اس کی بھی سیر کی لیکن لالہ زار کے نام پر یہی مثل صادق آتی تھی کہ آنکھوں کی اندھی نام نور بھری۔ پھول نام کی اس وقت وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ البتہ سڑک سے کافی بلندی پر تھا۔

اگلے روز ناشتہ وغیرہ کے بعد رخت سفر باندھا اور پیدل اگلی منزل کی طرف چل پڑے۔ پہاڑی سڑک تھی کبھی اوپر کبھی نیچے لیکن جوانی تھی کوئی پرواہ کیے بغیر سفر جاری رہتا۔ اگلی منزل کا نام تو یاد نہیں بہرحال میں اور مولانا عبدالباسط صاحب سب سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ رات کو مولانا غلام باری صاحب سیف واپس چلنے کو کہنے لگے لیکن نوجوانوں کی خواہش تھی کہ جھیل لولوسر تک سفر کیا جائے۔ مولانا محمد احمد صاحب جلیل نے ووٹنگ کروائی تو آگے سفر جاری رکھنے والوں کی اکثریت تھی۔ چنانچہ اگلی صبح ناران سے چلنے کے تیسرے دن ہم جھیل لولوسر کے لیے روانہ ہوئے جو ہماری آخری منزل تھی۔ منزل کے آخر پر سرحد پولیس کی چوکی تھی۔ جناب بشیر احمد خان رفیق صاحب کے تعاون سے ہمیں وہاں رہائش کے لیے ایک خیمہ مل گیا۔ لیکن جیسے ہی وہاں پہنچے موٹے موٹے اولے گرنے شروع ہو گئے مگر دوسرے ہی لمحے دھوپ نکل آئی۔ سامان

وہاں رکھ کر جھیل دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ وہاں سے چار میل کا فاصلہ تھا۔ جھیل کا نظارہ آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ قدرت کا شاہکار تھی۔ جھیل کے چاروں طرف پانی سے لے کر اوپر بلندی تک ہزار ہا رنگ کے پھول ایک تختے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ لیکن اب سورج غروب ہونے کو تھا اس لیے زیادہ دیر اس نظارے سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور واپس قیام گاہ آ گئے۔

کھانے کے بعد ہر روز کی طرح نمازوں کی ادائیگی کی طرف توجہ ہوئی تو پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ سوائے میرے کسی نے بھی اس روز نماز عشاء کے لیے وضو نہ کیا اور میں نے بھی پانی کو ہاتھ لگا کر اعضاء پر پھیر لیا۔ چلو بھر کر پانی منہ پر ڈالنے کی مجھے بھی ہمت نہ ہوئی اور نماز کی امامت بھی خاکسار نے کروائی۔ یہاں رات بخیر و خوبی گزری۔ رات کو جو آرام میسر آیا وہ سرحد پولیس کی مہربانی اور جناب بشیر احمد خان رفیق صاحب کی کوشش کے نتیجہ میں تھا۔

اگلی صبح ناشتہ کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا اور چلتے چلتے تین دن کا سفر واپسی پر دو دن میں طے کر کے ناران پہنچ گئے۔ یہاں سے حسب سابق جیپ کا سفر کر کے بالا کوٹ پہنچے اور بالا کوٹ سے ایبٹ آباد۔ ایبٹ آباد آ کر فیصلہ ہوا کہ اب کوہ مری بھی دیکھتے جائیں۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر نے کوہ مری نہیں دیکھی تھی۔ ایبٹ آباد سے بذریعہ بس براستہ نتھیا گلی کوہ مری آ گئے اور خیبر لاج بھی اس وقت حضرت مصلح موعود کو الاٹ ہوئی تھی۔ ہمیں بھی وہاں قیام کا موقع مل گیا۔

مری کی سیر اور بعض دیگر واقعات

ایبٹ آباد سے آ کر کچھ آرام کے بعد میں سیر کے لیے نکلنے لگا تو بھائی غلام محمد صاحب جو باورچی تھے کہنے لگے میں نے بھی سیر کو جانا ہے۔ مجھے خود کسی سیر گاہ یا

راستہ کا علم نہ تھا آخر بھولتے بھلاتے ہم دونوں مال روڈ پر پہنچ گئے وہاں یکدم جو عورتوں اور مردوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھا جو مقدور بھر قیمتی ملبوسات زیب تن کیے ہوئے تھے تو حیرانی کی انتہا نہ تھی۔ وہاں سے واپس قیام گاہ آ گئے۔ اگلے روز وہاں سے راولپنڈی آئے اور وہاں سے بذریعہ چناب ایکسپریس ربوہ آ گئے۔

جب ربوہ سے ایبٹ آباد پہنچے تو وہاں سے دو آنے کا نان، دو آنے کا چپل کباب اور دو آنے کی چائے ملتی تھی۔ گویا آدمی اتنے پیسوں میں ایک وقت کا کھانا کھا لیتا تھا اور یہ ایک روپے کے لحاظ سے صرف 37 پیسے بنتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے امور میں بھی صوبہ سرحد میں اخراجات کم ہوتے تھے۔ قیام ایبٹ آباد کے دوران میں نے اور عبدالباسط صاحب نے ایک جگہ سے ناشپاتیاں خریدیں جو بظاہر چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور سرخ رنگ کی تھیں۔ کھانے کے لیے جیسے ہی اسے منہ میں ڈالا اس کا گودا منہ میں خود بخود حل ہو کر حلق سے اتر جاتا تھا اور چھلکا منہ میں رہ جاتا تھا۔ واپسی پر جب کوہ مری آئے یہاں سے ایبٹ آباد والی ناشپاتیاں سمجھ کر ناشپاتیاں خریدیں۔ کھانے لگے تو وہ سخت تھیں اور کھائی نہ جا سکیں۔

صوبہ سرحد میں تو اچھا خاصا کباب دو آنے میں ملتا تھا۔ واپسی پر راولپنڈی آئے تو مری روڈ جو اس وقت غیر آبادسی تھی وہاں ہم دو تین دوست جا رہے تھے تو ایک صفوں کی چار دیواری والی کبابوں کی دوکان پر کباب کھانے بیٹھ گئے۔ ہم نے راولپنڈی کو بھی ایبٹ آباد سمجھ لیا لیکن جب بل دینے لگے تو اس نے اتنے پیسے مانگے کہ ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگ گئے اور مشکل سے سب نے پیسے اکٹھے کر کے دیے۔ بہر حال اس سفر میں قدرت کے بے شمار مناظر سے شب و روز لطف اندوز ہونے کا بھرپور موقع ملا اور اپنے ادارہ جامعہ احمدیہ اور اس کے منتظمین کے تہِ دل سے ممنون ہیں جنہوں نے ہمیں یہ موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

1954ء میں حضرت مصلح موعود پر قاتلانہ حملہ کا المناک واقعہ

10 مارچ کو پچھلے پہر خاکسار اپنے کمرے میں سٹڈی میں مصروف تھا اور کچھ طلباء باہر والی بال کھیل رہے تھے کہ اچانک ان کی آواز آنا بند ہوگئی۔ میں باہر نکلا تو وہاں کوئی بھی لڑکا نہ تھا۔ ہوسٹل سے باہر نکلا تو لوگ دیوانہ وار (بیت) مبارک کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی انہی کی طرف جا رہا تھا کہ راستہ میں حضور پر حملہ کی خبر مل گئی۔ ایسے ہوا جیسے تن بدن سے جان نکل گئی ہے۔ سانس پھولنے لگا اور دعائیں کرتا جا رہا تھا کہ اللہ میری زندگی بھی حضور کو عطا کر دے اور حضور کو شفا عطا فرمائے۔ قریباً ہر احمدی کا یہی جذبہ تھا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عبدالحمید نامی ایک شخص نے جب حضور نماز عصر پڑھا کر گھر کو روانہ ہوئے تو محراب میں حضور کی گردن پر چاقو سے وار کیا۔ دوسرا وار بھی اس نے کیا لیکن وہ آپ کے ایک پہرے دار اقبال نام نے اپنے ہاتھ پر لیا۔ کچھ اور لوگ بھی زخمی ہوئے۔ حضور کا خون بہہ رہا تھا اور سہارے سے گھر کو جا رہے تھے۔ فرمایا کہ حملہ آور کو مارنا نہیں اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ ابتدائی طور پر محترم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب اور حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب نے زخم کی مرہم پٹی کی لیکن رات کو لاہور سے ڈاکٹر ریاض قدیر صاحب جو اس وقت پاکستان میں چوٹی کے سرجن تھے نے زخم کو دوبارہ کھول کر گہرائی میں جا کر نسیں بند کر کے زخم کو ٹانکے لگائے۔

اس وقت احمدیوں کی بے چینی اور بے قراری دیدنی تھی۔ ہر شخص مجسم دعا بن کر حضور کی زندگی اور صحت کے لیے دعا گو تھا اور صدقات دے رہا تھا۔ ان حالات کا نقشہ کسی قدر تفصیل سے تاریخ احمدیت جلد 17 صفحہ 235 پر ملاحظہ فرمائیں اور دنیا بھر کے احمدیوں کے اپنے امام سے عشق و محبت کے جذبات ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مصلح موعود کے ارشادات براہِ راست سننے کی سعادت

خاکسار کو محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حضرت مصلح موعود کے متعدد ارشادات خطبات وخطابات کی صورت میں براہِ راست سننے کی سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی۔ اور حضور کی مبارک آواز اور لہجہ کی نرمی وگرمی آج بھی یاد ہے اور کئی ارشادات تو من وعن آج بھی کانوں میں اسی طرح گونجتے ہیں۔ تاہم یہاں اس کا محل نہیں کہ ان ارشادات کو لکھا جائے کیونکہ وہ معین الفاظ میں سلسلہ کی کتب میں آچکے ہیں۔

تحریک وقف زندگی

وقف زندگی کی تحریک اور آغاز وقف تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے سے ہو چکا لیکن خلافت ثانیہ میں اس کو خوب منظّم کیا گیا اور تحریک جدید کی بنیاد رکھ کر واقفین زندگی کو ایک تحفظ بھی فراہم کر دیا گیا۔ دوسری طرف حضور کی تحریک پر لوگوں نے دھڑا دھڑ اپنے بچوں کو وقف کے لیے پیش کر دیا۔ حالانکہ اس وقت سلسلہ کے مالی حالات ابتداء سے تو بہتر تھے لیکن فراوانی اموال پھر بھی نہ تھی۔ اور ان واقف زندگی احباب نے باوجود مالی مشکلات کے جس صبر، ہمت، استقلال، دلجمعی اور استقامت سے زندگی بھر خدمت سلسلہ کی توفیق پائی ہے وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ واقفین زندگی کی خدمات کی تفصیل سے آگاہی کے لیے تاریخ احمدیت کی مختلف جلدوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

کتابوں کے علاوہ افق عالم پر بھی ان قربانیوں کے نشانات ثبت ہیں اور احمدیت اب ایسے دور میں داخل ہو چکی ہے کہ افق عالم پر غلبۂ (دین حق) علی الادیان کا نقشہ قطعی اور یقینی طور پر ظاہر و باہر نظر آ رہا ہے۔ الحمدللہ رب العالمین۔

میرا نکاح

1955ء کے آغاز میں میرے سسر صاحب آئے اور نکاح کے اعلان کے لیے کہنے لگے۔ میں رضا مند ہو گیا کیونکہ 1955ء کے مئی جون میں شاہد سال دوم کے امتحان کے بعد نتیجہ تک چھٹیاں تھیں۔ لیکن میرے سسر مرحوم فوجداری مقدمہ کے باعث حضرت مولانا ابوالعطا صاحب کو اپنا وکیل بنا کر واپس چلے گئے اور میری طرف سے استاذی المکرّم مولانا محمد احمد جلیل صاحب سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل جامعۃ المبشرین نگران تھے۔ چنانچہ سیدنا حضرت مصلح موعود کی خدمت میں میرے نکاح کے اعلان کی درخواست کی گئی جو حضور انور نے ازراہِ شفقت و ذرہ نوازی منظور فرما کر بعد نماز عصر (بیت) مبارک میں میرے نکاح کا 400 روپے حق مہر پر اعلان فرمایا۔

میرے والد تو فوت ہو چکے تھے۔ تایا زاد بھائیوں میں سے بھی کوئی شریک اعلان نکاح نہ ہو سکا۔ لیکن قربان جاؤں جماعت احمدیہ اور اس کے احباب کے کہ حاضرینِ (بیت) میں سے کوئی ایک بھی نہ ہو گا جس نے مجھے گلے لگا کر مبارک باد نہ دی ہو۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ مبارک دینے والوں میں میرے اساتذہ، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعض (رفقاء) اور صدر انجمن احمدیہ کے بعض ارکان بھی شامل تھے۔ اور ان بزرگوں میں حضرت مولانا محمد الدین صاحب ایم۔اے صدر صدر انجمن احمدیہ بھی شامل تھے۔ مجھے گلے لگا کر ملنے کے بعد فرمانے لگے تمہیں ایک بات بتانی تھی اچھا پھر کبھی بتاؤں گا۔ میں نے آپ کے ارشاد کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور نکاح کے چند روز بعد آپ کے دفتر میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت میں آ گیا ہوں آپ نے کچھ بتانے کو فرمایا تھا۔ ذرہ مسکرا کر فرمایا اچھا آپ آ گئے ہیں اور پھر وہ مشہور بات بتائی کہ کسی بزرگ کا کوئی چیلا تھا وہ ایک دن بزرگ

کے پاس آیا اور کہا گرو جی! میری منگنی ہوگئی ہے تو گرو جی نے کہا (ساڈے کولوں گیوں) یعنی ہم سے گئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر گرو جی سے ملنے کے لیے وہ چیلا آیا اور کہا گرو جی میری شادی ہوگئی ہے۔اس پر گرو جی نے کہا (ماں باپ کولوں وی گیوں) یعنی ماں باپ سے بھی گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ پھر گرو جی سے ملاقات کے لیے آیا تو عرض کیا کہ میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اس پر گرو جی نے فرمایا (اپنے آپ توں وی گیوں) یعنی اپنے آپ سے بھی گئے۔ یہ بات آپ نے مجھے بتائی۔ میں اس وقت اس کی حقیقت نہ سمجھ سکا اور دل میں خیال کیا کہ انہوں نے میرے ساتھ بڑا دلچسپ مذاق کیا ہے اور دل ہی دل میں خوب ہنسا بھی۔

لیکن جب شادی کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ تمام افراد سے شدت محبت کے جذبات اب سمٹ سمٹا کر صرف اہلیہ کی محبت میں مرکوز ہو جاتے ہیں۔ باقیوں کا وجود ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو بچہ کی اچھی پرورش کے خیال سے اپنے وجود کی ضروریات کی بھی نفی ہونے لگتی ہے۔ پس کتنا سچا یہ قول ہے اور ساری محبتوں میں توازن رکھنا کتنا دشوار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ستاری فرمائے اور اگر ان محبتوں اور رشتہ داروں کے حقوق کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو بھی رشتہ داروں کی طرف سے بے اعتنائی کا الزام ضرور لگتا ہے اور اس میں قصوروار اور ذمہ وار بیوی کو ہی قرار دیا جاتا ہے جس سے بعض اوقات ہنستے بستے گھر ٹوٹنے لگتے ہیں یا اجڑ جاتے ہیں۔ پس اس پل صراط سے گزرنے کے لیے بڑے حزم واحتیاط اور جذبات کی قربانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔

سسرالی خاندان کا تعارف

میرے سسر جناب عبدالحق صاحب مرحوم قادیان کے پاس گاؤں گوت بھٹیاں

کے رہنے والے تھے۔ان کے والد صاحب گاؤں کے زمیندار تھے۔آپ کی دو والدہ اور پانچ بھائی تھے۔خاندان احمدی نہیں تھا۔آپ سکول ٹیچر تھے۔

آپ بہت ذہین تھے۔کسی قریبی گاؤں میں مدرس تھے۔وہ گاؤں سکھوں کا تھا۔ معائنہ کے لیے وہاں ایک سرکاری افسر آیا۔اس نے لڑکوں کا امتحان لیا جو بہت اچھے نمبروں میں پاس ہوئے۔افسر سکھ سردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا آپ کا ٹیچر تو بہت قابل ہے۔سردار جی نے جواب دیا یہ قابل تو ضرور ہے لیکن سال میں صرف دو ماہ سکول حاضر ہوتا ہے۔اسے کہیں سکول بھی آیا کرے۔تو یہ فوراً بول پڑے کہ سردار صاحب غلط کہتے ہیں میں سال میں صرف ایک ماہ سکول آتا ہوں۔اس پر افسر نے کہا کہ حاضر ہوا کریں تو کہنے لگے لڑکے اسی طرح پاس ہوں گے اور میں بھی ایک مہینہ ہی سکول حاضر ہوا کروں گا۔

میرے سسر صاحب کی قبول احمدیت

زمیندار گھرانہ تھا اور احمدیوں کی سخت مخالفت کرتے تھے۔(دعوت الی اللہ) کے لیے آنے والوں کو دق بھی کرتے تھے اور بعض اوقات احمدیوں سے بحث بھی کیا کرتے تھے۔اچانک انہیں احمدیت کے بعض مسائل کی سمجھ آ گئی، خصوصاً وفات مسیح کی اور انہوں نے احمدیوں کی طرف داری کرنا شروع کر دی۔گاؤں میں اب ان کی بھی مخالفت شروع ہوگئی۔آخر گاؤں والوں کے ساتھ انہوں نے وفات مسیح پر مناظرہ مقرر کر لیا اور قادیان سے علماء کرام جن میں حضرت قاضی محمد نذیر صاحب بھی شامل تھے تشریف لائے۔لیکن گاؤں والوں نے اصرار کیا کہ ہم قادیان سے آنے والے علماء سے مناظرہ نہیں کریں گے بلکہ ہم صرف عبدالحق صاحب سے وفات مسیح پر مناظرہ کریں گے۔بہتیرا ان کو سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ آپ نے بھی علماء بطور وکیل بلائے

ہیں اور میں نے بھی بطور وکیل علماء بلائے ہیں، ان کی بحث سنتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ کون جھوٹا اور کون سچا ہے۔لیکن وہ نہ مانے آخر مکرم ومحترم عبدالحق صاحب نے اپنے علماء کے حضور عرض کیا کہ میں ہی مناظرہ کرتا ہوں۔

چنانچہ پہلی باری ان کی تھی انہوں نے ایک بلیک بورڈ منگوایا اس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف قال اللہ لکھ کر سورہ مائدہ کی آخری آیت جس سے وفات مسیح پر استدلال ہوتا ہے لکھ دی اور دوسری طرف بخاری کتاب التفسیر والی حضرت ابن عباس کی روایت لکھ کر استدلال کیا کہ ایک لفظ کے تو کئی معنی ہو سکتے ہیں اور خود پنجابی لفظ ''وٹ'' کے بارہ معنی بیان کیے اور کہا کہ دیکھو جب ایک لفظ ایک فقرے میں آ جاتا ہے تو وہ صرف ایک معنی میں محدود ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بے شک توفیتنی کے جتنے بھی معنے کر لولیکن جب یہ ایک فقرہ میں آ جائے گا تو ایک ہی معنے ہوں گے۔از راہِ کرم مولوی صاحب بتائیے کہ توفیتنی کے جو معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لیتے ہیں وہی معنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ہیں؟ اگر اس کے معنی زندہ آسمان پر جانا ہے اور یہ معنی عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہیں تو پھر یہی فقرہ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے بھی فرمایا ہے، وہاں بھی آسمان پر جانے کے ہی معنے ہیں۔اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وفات کے معنے ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی وفات کے ہی معنے ہوں گے۔

بقول حضرت قاضی محمد نذیر صاحب فاضل مدمقابل مناظرہ ختم کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد احمدیت کی صداقت تو ان کی سمجھ میں آ گئی مگر اپنی کمزوریوں اور عیوب کے باعث بیعت نہیں کرتے تھے اور حضرت مصلح موعود کی خدمت میں بیعت نہ کرنے کی وجہ اپنی کمزوریوں کو بتایا حضور نے فرمایا کمزوریاں انشاءاللہ دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ 1930 یا 1931ء میں بیعت کر کے داخل سلسلہ عالیہ احمدیہ ہو گئے۔

سندھ میں سکھر بیراج کی تعمیر اور آپ کا سندھ آنا

سندھ میں سکھر بیراج 1932ء میں جاری ہوا۔ حضرت مصلح موعود، صدر انجمن احمدیہ، تحریک جدید اور کئی صاحب حیثیت احباب نے ضلع تھرپارکر میں غیر آباد زمینیں خرید لیں۔ حضور نے مولوی عبدالحق صاحب کو سندھ چلے جانے کا ارشاد فرمایا۔ چنانچہ 32-1931ء میں حضور کی زمینوں کی آبادی کے لیے یہ خاندان سندھ آ گیا۔ پھر 1942ء میں کرونڈی ضلع خیر پور جو اس وقت ریاست خیر پور میں واقع تھی، کے راجپر قوم کے زمینداروں سے تین چار صد ایکڑ زمین ٹھیکہ پر لے کر کاشت کرنے لگے۔ یہ پانچ بھائی تھے۔ عبدالحق صاحب، عبدالعزیز صاحب، عبدالرحیم صاحب، عبدالستار صاحب اور عبدالمجید صاحب۔ ایک عبدالغنی صاحب بھی تھے لیکن وہ میرے ساتھ تعلق سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ یہاں کاشتکاری سے انہوں نے خوب دولت کمائی۔

میرے سسر مولوی عبدالحق صاحب کی راہِ مولا میں قربانی

مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے راہِ مولا میں جان قربان کرنے کے عظیم انعام سے سرفراز فرمایا۔ مولوی صاحب جب سے احمدیت کی آغوش میں آئے بے پناہ جوشیلے احمدی تھے۔ متعدد رشتہ داران کے ذریعہ حلقہ بگوش احمدیت ہوئے۔ دعوت الی اللہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ دورانِ سفر مخالفین سے کئی بار مار بھی کھائی۔ پاکستان بننے کے وقت امرتسر میں اپنے گاؤں کے ایک مولوی صاحب سے مباہلہ بھی کیا جس میں وہ اور اس کا لڑکا ہلاک ہو گئے اور مولوی صاحب کا اغلباً ایک چچا زاد بھائی منشی نور محمد احمدی ہو گیا۔ اس کا بیٹا محمد یوسف بھی احمدی ہو گیا۔ کرونڈی میں زمین کا ٹھیکہ تو مزید نہ مل سکا۔ پاکستان بن گیا۔ کرونڈی سے ہندو نقل مکانی کر گئے۔

مولوی صاحب کے بیٹوں نے دکانیں شروع کر دیں اور مولوی صاحب نے وہاں آٹھ ایکڑ سرکاری زمین لے کر اس میں باغ لگوالیا۔ ان کی بہت زیادہ جوشیلی طبیعت کے باعث مخالفت بہت بڑھ گئی۔ بڑے بڑے زمیندار بھی جو سندھی تھے مخالف تھے۔

ایک دن شر قوم کا ایک فرد حاجی مانک نامی ایک اور فرد کے ہمراہ احمدیت کے بارہ میں معلومات کے حصول کے بہانہ سے آیا۔ رات بھر دونوں مہمان رہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اگلے روز باغ میں گئے تو کہنے لگے مولوی صاحب ہمیں کچھ پودے لینے ہیں ذرہ نرسری دکھا دیں۔ وہاں لے جا کر ان کو ذبح کر دیا اور بھاگ گئے۔ اصل قاتل تو کرائے کا قاتل تھا وہ تو ہاتھ نہ آیا مانک شر کا چالان ہوا لیکن اسے بھی صرف تین سال سزا ملی۔ یہ دسمبر 1966ء کا واقعہ ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کے راہِ مولا میں قربان ہونے کے واقعہ اور ان کے حالات کی کسی قدر تفصیل سلسلہ عالیہ احمدیہ کے لٹریچر میں آچکی ہے اس لیے یہاں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

نکاح کے بعد سسرال کے گاؤں کے چند واقعات

بات تو میرے نکاح کی ہو رہی تھی اور دور نکل گئی۔ نکاح کے بعد پھر حصول تعلیم میں مشغول ہو گیا۔ خدام الاحمدیہ کی طرف سے بھی بعض ڈیوٹیاں دینی ہوتی تھیں۔ نکاح کے بعد فروری 1955ء میں سسرال کی طرف سے اطلاع ملی کہ ماتحت عدالت نے ابتدائی سماعت کے بعد کیس سیشن کے سپرد کر دیا ہے اور سترہ افراد دوبارہ جیل میں ڈال دیے گئے ہیں۔ میرے سسر مولوی عبدالحق صاحب تو مقدمہ کی پیروی کے لیے اکثر خیر پور رہتے تھے گھر میں ضروریات زندگی لا کر دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔

ذریعہ آمد اب زراعت کی بجائے تجارت تھا اور دکانیں بند تھیں۔ مقدمہ کے باعث اخراجات بہت بڑھ گئے تھے ساری صورتحال پر مشتمل میری درمیانی نسبتی ہمشیرہ

کا خط ملا تو دل میں سندھ جانے کا خیال پیدا ہوا۔اس پر استاذی المکرّم جناب مولانا ابوالعطاء صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ کی خدمت میں حالات پیش کر کے مشورہ کا ملتجی ہوا۔آپ نے جانے کے حق میں رائے دی اور کچھ دنوں کی چھٹی دے کرفرمایا اگر مزید ضرورت ہوتو وہاں سے لکھ دینا۔ چنانچہ میں بذریعہ چناب ایکسپریس سندھ روانہ ہوا۔بھریا روڈ سٹیشن سے سسرال آباد نو میل کے قریب کرونڈی نام کا قصبہ تھا جو 1947ءنومبر میں دیکھ چکا تھا۔

بھریا روڈ سے اونٹ پرسوار ہوکر جانا ہوتا تھا جو دو گھنٹہ میں وہاں پہنچاتا تھا۔گویا دوگھنٹہ تک نہ زمین پر نہ آسمان پر انسان درمیان میں ہی لٹکا رہتا تھا۔اس کلیہ کے تحت میں بھی قصبہ کرونڈی ہمشیرہ کے سسر چوہدری حبیب اللہ صاحب کی دکان پر پہنچ گیا۔ ایک دن ان کے گھر ٹھہرااور پھر مجھے سسرال کے ہاں ان کے گاؤں جسے وہاں کی زبان میں گوٹھ کہتے ہیں پہنچایا گیا۔وہاں پہنچ کر مجھے ایک نا قابل فراموش واقعہ پیش آیا۔

پہلے دن سسرال میں آیا دوپہر کے کھانے میں پورے مرغ کا گوشت بھون کر پلیٹ بھرکر روٹی کے ہمراہ میرے سامنے رکھا گیا۔گوشت کا رنگ بہت سرخ معلوم ہو رہا تھا۔جیسے ہی ایک نوالے کے ہمراہ گوشت کی بوٹی منہ میں ڈالی تیز مرچ کی وجہ سے مجھے تو دن میں تارے نظر آ گئے۔اب میرے لیے اسے کھانا سخت مشکل اور اہل خانہ سمجھ رہے ہیں کہ مہمان بہت شرما رہا ہے۔ایک دو روز تو میں نے اسی شرم وحیا میں اپنے آپ کو اسی مشکل میں ڈالے رکھا بالآخر اپنی نسبتی والدہ سے علیحدگی میں عرض کر دیا کہ مجھے اس قدر مرچ کھانے کی عادت نہیں تو میرے لیے علیحدہ طور پر سالن پکنے لگا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

ہمارے دیہاتی تمدن میں عام طور پر نئے داماد کی آمد پر اسے طرح طرح سے تنگ کر کے مزہ لیا جاتا ہے اگر چہ اب احمدیت کی تربیت کے باعث یہ معاملہ ترک ہو

چکا ہے۔ میں دوپہر کو لیٹا ہوا تھا کہ بیوی کی ایک سہیلی نے جو شادی شدہ تھی اور اس کا رنگ بہت کالا تھا، پسا ہوا آٹا لاکر میرے منہ پر ڈال دیا۔ میں نے بڑے تحمل سے اسے مخاطب کر کے کہا کہ بہن اس جگہ تو پوڈر کی کوئی ضرورت نہ تھی جہاں اللہ تعالیٰ نے سرخ وسفید رنگ دیا ہوا ہے۔ پوڈر کی تو وہاں ضرورت تھی جہاں کالا نور خداداد گھٹاں بن کے آیا ہے۔ اس پر وہ بہت نادم ہوئی اور آئندہ کبھی بھی مذاق نہ کرنے کا وعدہ کر کے اس کو عمر بھر نبھایا۔ باقی پھر کسی کو مذاق کرنے کی ہمت وجرأت نہ ہوئی۔

ایام قیام سندھ میں گھر والوں کی ہر طرح مدد کی۔ ضروریات زندگی بازار سے لاکر دیں۔ باغ سے بھینسوں کو دوہ کر دودھ بھی بروقت گھر لاکر دیتا رہا کیونکہ تین نسبتی بھائی تھے تینوں ہی جیل میں تھے۔ محترم مولوی عبدالحق صاحب کا خاندان تو تقسیم ملک سے قبل یہاں کرونڈی سندھ میں آباد ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد مولوی صاحب کے کافی رشتہ دار بھی یہاں کرونڈی آ گئے تھے اس لیے سارے ہی عزیزوں نے میری باری باری نہ صرف دعوت کی بلکہ شگن کے طور پر نقدی بھی دی اور بعض قریبیوں نے تو کپڑے بھی دیے۔ لہٰذا ایک ماہ بعد جب واپس آیا تو میرے پاس اس زمانہ کے لحاظ سے سو روپے کے قریب روپیہ بھی تھا اور کپڑے بھی تھے۔ میرے آنے سے قبل میرے ایک نسبتی بھائی کے سوا باقی سولہ افراد کی ضمانت پر رہائی ہوگئی تھی۔

میرے گھر میں چوری

ابھی سندھ سے آئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن میں اور بھائی محمد شریف صاحب کچے کوارٹر کے صحن میں سو رہے تھے۔ کوارٹر کے ایک طرف گلی تھی۔ گلی کی طرف کھڑکی تھی اور اوپر کھڑکی سے متصل روشن دان تھا۔ چور آیا اس نے روشن دان سے ہاتھ ڈال کر کھڑکی کی کنڈی کھولی اور اندر آ کر آرام سے بکس میں سے سارے

کپڑے، سویٹر اور اُووَر کوٹ گرم پتلون وغیرہ نکال کر لے کر چلتا بنا۔ ان ایام میں ربوہ میں بکثرت چوریاں شروع ہوگئی تھیں۔ روزانہ ہی کوئی نہ کوئی چوری عمل میں آتی تھی۔

میری چوری کے پندرہ روز بعد ایک دوست راجہ صوبہ خان صاحب کی دکان سے گھی کے دو تین کنستر چوری ہو گئے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب بھانبڑی محتسب امور عامہ سخت پریشان تھے۔ کہنے لگے یہ نعمت اللہ کے سوا اور کوئی چوریاں نہیں کر رہا جوان دنوں فیصل آباد میں ایک پریس میں کام کر رہا تھا۔ میں بھی مولوی صاحب کے ہمراہ فیصل آباد چلا گیا۔ نعمت اللہ نے نہایت ہوشیاری سے پریس مالکان کو کہہ دیا کہ چار بجے سے پہلے مجھے چھٹی نہ دیں۔

دوسری طرف اپنے دوسرے ساتھی محمد اسلم کو کہ دونوں مشترکہ طور پر چوریاں کرتے تھے اور اکٹھے رہتے تھے اور ایک ہی جگہ کام کرتے تھے وہاں سے کھسکا دیا کہ چوری کا مال رہائشگاہ سے غائب کر دو۔ شام کو مولوی صاحب، نعمت اللہ اور میں جھال خانوآنہ اس کے کمرے میں پہنچے تو مجھے اپنے چوری شدہ کپڑے وغیرہ نظر آ گئے۔ ان کو اسلم غائب نہ کر سکا۔ چنانچہ میں نے مولوی صاحب محترم کو بتایا کہ یہ میرے کپڑے وغیرہ پڑے ہیں۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ بس ربوہ کی تمام چوریاں یہی کرتا ہے۔ مجھے مولوی صاحب نے لالیاں سے پولیس لانے کے لیے ربوہ بھیج دیا کہ امور عامہ سے مل کر لالیاں سے پولیس کا انتظام کیا جائے۔ پولیس ابھی وہاں پہنچی نہیں تھی کہ نعمت اللہ مولوی صاحب کو جل دے کر وہاں سے بھاگ گیا۔ لیکن بہت سی چوریوں کا کچھ سامان اور نعمت اللہ کا ساتھی اسلم ہاتھ آ گیا۔ میرا بھی کافی سامان مل گیا۔ تین سال سے یہ دونوں ربوہ میں چوریاں کر رہے تھے۔

طریقۂ واردات یہ تھا کہ اس وقت لائلپور سے رات کو بارہ بجے ماڑی انڈس گاڑی آتی تھی اس میں یہ آتے تھے اور اڑھائی بجے لائلپور سے ہو کر لاہور جانے والی

گاڑی میں واردات کر کے اور مال واردات لے کر لائلپور چلے جاتے تھے۔

نعمت اللہ تو بھاگ گیا تھا اسلم کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور نعمت اللہ مسلسل ربوہ میں چوری کرتا رہا۔حتی کہ ایک بار تعلیم الاسلام ہائی سکول کی چھت سے پنکھے اتارنے کی کوشش میں فرزند نامی چوکیدار نے پکڑ لیا اور آہستہ آہستہ یہ بہت بڑا ڈکیت بن گیا۔آخر سکھر جیل سے رہا ہو کر کچھ دنوں بعد سکھر میں ہی فوت ہو گیا۔

جس رات میری چوری ہوئی اس سے اگلی صبح کو حضرت مصلح موعود نے بغرض علاج سفر یورپ کے لیے روانہ ہونا تھا اور یہ 23 مارچ 1955ء کا دن تھا۔احباب جماعت کو حضور سے شدید محبت تھی۔صبح ہی صبح احباب جماعت (بیت) مبارک کی سامنے والی سڑک پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔میں بھی پھٹے کپڑوں میں ان لوگوں میں شامل تھا۔احباب کو حضور کی ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہ تھی لیکن مجبوری تھی۔حضور کی روانگی کا منظر بہت اندوہناک تھا۔ہر دل مغموم ہر زبان پر تسبیح وتحمید اور حضور کے بخیریت جانے اور آنے کے لیے پرسوز دعا تھی۔آنکھوں میں آنسو تھے۔اس روانگی کا منظر تاریخ احمدیت میں بہت عمدگی سے اور مؤثر طور پر تحریر ہے۔مطالعہ کے لیے تاریخ احمدیت جلد 17 ملاحظہ ہو۔

جامعہ میں تفریح کے بعض واقعات

یہ مارچ تھا۔سالانہ امتحانات قریب آرہے تھے۔اس لیے پھر پڑھائی کی طرف توجہ کی۔لیکن پڑھائی کے ساتھ بعض اوقات جزوی طور پر تفریح کا پروگرام بھی بنا لیا جاتا اور تفریح کے لیے دریائے چناب میں کشتی رانی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

ایک دن چند دوستوں نے دریا پر جانے کا پروگرام بنایا اور عموماً چاندنی راتوں میں ایسا کرتے تھے۔دریا پر خدام الاحمدیہ مرکزیہ نے تین چار کشتیاں رکھی ہوئی تھیں

اور نواب دین نامی ملاح نگران ہوا کرتا تھا۔ کشتی رانی کی اجازت کے کارڈ خدام الاحمدیہ مرکزیہ سے حاصل کیے ہوتے تھے۔ ایک دن چند دوستوں نے دریا پر حلوہ بنایا اور کشتی میں رکھ کر کشتی کو پانی میں ایک دوست نے دھکیلنے کی کوشش کی۔ ہمارے دوستوں میں مکرم محمد اسلم فاروقی صاحب کسی حد تک ایک ٹانگ سے معذور تھے۔ دوست ان کو کشتی سے باہر رکھ کر ان کا مذاق بنانا چاہتے تھے۔ وہ بھی ہوشیار تھے جیسے ہی کشتی کو پانی کی طرف دھکیلا گیا انہوں نے بھاگ کر کشتی سے حلوے والی دیگچی اٹھا کر کشتی کو آگے دھکا دیا جس پر خوب خوب سب ان کی اس ہوشیاری پر ہنسے۔

بہر حال رات گئے تک کشتی چلاتے اور اسی دوران دریا میں نہا بھی لیتے اور آدھی رات کے قریب واپس آجاتے۔ ایک دفعہ دریا میں پانی کچھ زیادہ تھا۔ میں اور کچھ اور دوست دریا پر گئے۔ ہمارے درمیان کچھ غیر ملکی احمدی بھی تھے اور مکرم احمد صادق صاحب بنگالی بھی تھے جو کچھ نحیف الجثہ اور قد کے بھی چھوٹے تھے۔ کہنے لگے میں بنگالی ہوں میں کشتی چلاؤں گا اور چپو سنبھالے۔ اب جیسے ہی کشتی دریا کے بہاؤ میں گئی ان سے بے قابو ہوگئی اور ان کا رنگ اڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب معاملہ خراب ہے۔ چنانچہ میں نے چپو لیے اور کشتی کو دریا کے دھارے کے رخ چلا کر آرام سے ایک کنارے پر لگا دیا اور ان سب کو اتار کر کشتی ہلکی کر کے اوپر کی طرف لے آیا جس سے ہم سب خطرے سے محفوظ ہو گئے۔

اسی طرح ایک بار طلباء اور اساتذہ تفریح کے لیے دریا پر گئے۔ شاید اٹھارہ بیس احباب تھے اور دریا کے درمیان ایک ریتلا میدان تھا اس پر جا کر ڈیرہ لگانا تھا۔ دو کشتیوں میں اٹھارہ افراد سوار تھے۔ ہمارے استاد محترم مولانا غلام باری سیف صاحب بہت اچھی صحت کے بھی مالک تھے اور زندہ دل بھی تھے۔ مجھے انہوں نے مقابلہ کا چیلنج دے دیا اور میں نے وہ قبول کرلیا۔ اب ان کی کشتی میں بھی کل نو افراد تھے

اور میری کشتی میں بھی نو ہی افراد تھے لیکن میرے پاس ریس والے بڑے چپو تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے پہلے اگلے کنارے پر کشتی لگا دی اور پھر خوب تفریح کی اور کھایا پیا بھی اور رات گئے واپس آئے۔

اس واقعہ سے یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ہمارے اساتذہ خشک ملاں نہ تھے بلکہ شاگردوں میں گھل مل کر رہتے۔ شاگردوں سے بعض اوقات والی بال وغیرہ کا مقابلہ بھی کرتے جس سے طلباء اور اساتذہ میں بُعد کی بجائے قربت پیدا ہوتی جو تعلیم کے لیے بہتر ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ مجھے کشتی رانی میں بہت حد تک مہارت حاصل ہوگئی تھی اور اکثر دریا پر جا کر اس کی مشق بھی کرتا رہتا تھا۔

تین مشاہدات

(۱) میں 1947ء میں قادیان گیا۔ وہاں سے 1947ء میں ہی پاکستان آ گیا۔ دوران تعلیم مدرسہ احمدیہ اور جامعہ احمدیہ میں امراء کے بہت کم بچوں کو وقف میں دیکھا اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہمارے معزز اساتذہ اور دیگر معزز علماء کے بیٹوں میں سے اس وقت کسی نے بھی وقف نہیں کیا۔ ہاں حضرت مولانا ابوالعطا صاحب نے اپنی ساری اولاد نرینہ کو وقف کیا۔

محترم عطاء الرحمٰن صاحب آپ کے بڑے بیٹے نے بھی مولوی فاضل تک تعلیم حاصل کی۔

محترم عطاء الکریم شاہد صاحب نے گریجوایشن کے بعد شاہد کیا اور زندگی وقف کر کے ممالک بیرون میں خدمت کی توفیق پاتے رہے۔

محترم عطاء الرحیم صاحب نے گریجوایشن کر کے تحریک جدید کے تحت ممالک بیرون میں تعلیمی میدان میں خدمت کی سعادت حاصل کی۔

محترم عطاء المجیب راشد صاحب نے بھی گریجوایشن کے بعد شاہد کیا اور سلسلہ کی بیش بہا خدمات کی سعادت حاصل کی جواب تک جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ساری اولاد کو بھی اپنی وسیع رحمتوں کے سایہ میں رکھے۔ آمین

(۲) اس زمانہ میں لوگ واقف زندگی لڑکے کو رشتہ دینے سے بھی کتراتے تھے کہ لڑکی کھائے گی کیا کیونکہ واقفین زندگی کے الاؤنس بہت کم تھے۔

(۳) لیکن ایسی صورتحال میں کچھ ایسے دیوانے بھی تھے کہ لڑکی کے رشتہ کے لیے واقف زندگی لڑکے کی تلاش کرتے تھے اور ایسے لوگوں میں سے میرے سامنے مکرم ماسٹر محمد ابراہیم صاحب شاد ساکن کوٹ رحمت خان نزد مومن سٹیشن جو ٹیچر تھے اور شاعر بھی تھے، کی مثال ہے۔ ان کی بیٹی بالغ ہوئی تو واقف زندگی لڑکے کی تلاش کر کے مکرم مولانا دوست محمد شاہد صاحب مؤرخ احمدیت کا انتخاب کیا اور اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی جو وقف زندگی کی دولت سے مالا مال ہونے کے علاوہ دنیاوی لحاظ سے کوئی اہمیت و حیثیت نہ رکھتے تھے۔

ماسٹر صاحب کی اس قربانی کو اللہ تعالیٰ نے عظیم اہمیت دی اور مولانا دوست محمد صاحب سلسلہ کی تاریخ میں عظیم الشان مقام حاصل کر گئے۔ دوسری طرف اس نیک خاتون سے اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر سلطان مبشر جیسا فرزند عطا کیا جو دینی و دنیاوی علوم کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور بلند اخلاق کا مالک ہے اور اپنوں اور بیگانوں کے دکھوں کا نہایت ہمدردی سے مداوا کر رہا ہے۔

لیکن آج یہ منظر یکسر بدل چکا ہے اور اب بے شمار امراء بھی اپنے بچوں کو وقف کر کے جامعہ احمدیہ میں داخل کروانے کی سعی کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مربی سلسلہ بھی بن چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وقف نو کی تحریک میں بھی جماعت ساٹھ ہزار کے قریب بچے پیش کر چکی ہے۔

عمری عبیدی صاحب

انہی ایام میں افریقہ سے آنے والے عمری عبیدی صاحب بھی جامعۃ المبشرین میں زیرِتعلیم تھے۔ بہت ذہین اور قابل انسان تھے۔ ایک دن خود چائے بنا رہے تھے کہ ابلتی چائے ہاتھ پر گر گئی جس سے ہاتھ کی جلد جل گئی اور وہاں سفیدی ظاہر ہو گئی۔ جب ڈاکٹر صاحب ان کے علاج کے لیے آئے تو ان کا پہلا سوال ڈاکٹر صاحب سے انگریزی میں یہ تھا کہ Will skin return کہ کیا جلد دوبارہ سیاہ ہو جائے گی۔ جس طرح ہمیں گورا رنگ پسند ہے اسی طرح افریقنوں کو بھی اپنا بے داغ سیاہ رنگ خوب پسند ہے۔ تعلیم کے بعد اپنے ملک واپس گئے اور وہاں وہ وزیر انصاف کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مختلف مما لک کے لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ **حضرت مرزا طاہر احمد صاحب رحمہ اللہ بھی اس کچے جامعہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔**

شاہد کا امتحان اور میری شادی

میرا اب شاہد سال آخر کا امتحان بھی قریب تھا۔ بہت لمبا کورس تھا اور امتحان قریباً ایک ماہ چلنا تھا۔ اس کی تیاری میں رات دن ایک کرنا پڑی۔ بہرحال امتحان دیا اور محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاس ہو گیا۔ لیکن 56-55ء طب کی تعلیم کا سال باقی تھا جو تکمیل تعلیم کے لیے ضروری تھا۔ وہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر نذیر احمد ریاض صاحب ہمارے استاد تھے۔

اسی اثناء میں ایک دن چوہدری محمد شفیع صاحب نمبر دار جو بڑے زمیندار تھے اور والد صاحب کے دوست تھے اور میرے مہربان تھے وہ آ گئے اور کہا کہ بچوں کو یہاں

داخل کروانا ہے میرے ساتھ چلو۔اسی وقت ان کے ساتھ ہولیا۔ان کوداخل کروالیا تو کہاان کے لیے مکان کرایہ پر لے لیا ہے آپ بھی ان کے ساتھ رہیں اور آپ کھانا بھی یہاں ہی کھائیں۔ چنانچہ میں نے دو بچوں کوقرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔اور میں مکمل آزادی سے گھر کے فرد کی طرح رہ رہا تھا۔اپنی پڑھائی بھی کرتا۔ یہاں رہنے سے مجھے وظیفہ کی کل رقم بچنے لگی۔ چنانچہ چند ماہ میں میرے پاس کچھ رقم جمع ہوگئی۔

ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں ان کے ارشاد پر ان کے گاؤں گزاریں۔ چچی جان مرحومہ اپنے بچوں کی طرح میری خوراک کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ دودھ اور گھی گھر میں خوب تھا اور روزانہ بغیر کسی بخل کے میرے لیے بھی مہیا تھا۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔ان کا بڑا بیٹا آفتاب احمد بھی ان کی چار بیٹیوں سے چھوٹا تھا اور اس سے چھوٹا اعجاز احمد بھی ابھی پرائمری میں پڑھتا تھا۔جس طرح انہوں نے میرا خیال رکھا اس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

ایک دفعہ چچا جان ربوہ آئے ہوئے تھے میں نے ان سے ذکر کیا کہ چچا جان اب سسرال والے شادی کے لیے بہت زور دے رہے ہیں۔ ربوہ میں میرا ایک کنال کا پلاٹ ہے۔خیال ہے کہ اس کو رہن رکھ کر کسی سے قرضہ لے لیا جائے تا کہ شادی ہو سکے۔ کہنے لگے کس قدر رقم کی ضرورت ہوگی۔ میں نے کہا یہی تین چار صد روپیہ۔ کہنے لگے پلاٹ ہرگز رہن نہیں رکھنا۔جتنی ضرورت ہوگی میں پوری کروں گا۔ میں ان کے اس جواب پر سراپا تشکر تھا اور والد صاحب کے اس دوست کے کردار کی بلندی وعظمت کے دل گُن گا رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کے بے حد احسان اور حمد کے گیت گا رہا تھا کہ اس نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔ ہاں میں نے ان کے ہاں دو چھترے لے کر پرورش کے لیے چھوڑ دیے تھے تا کہ شادی پر کام آسکیں۔

1955ء کے جلسہ سالانہ میں میرے سسر محترم بھی آئے اور بھائی بھی آئے۔

شادی کی تاریخ 14 فروری 1956ء طے پا گئی۔ جلسہ سالانہ بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا۔ کچھ روز کے لیے جامعہ میں بھی رخصتیں تھیں۔ جب جامعہ کھلا تو میں نے چھٹی کے لیے درخواست دی جو طب کے استاد صاحب نے یہ کہہ کر منظور نہ ہونے دی کہ تعلیم کا حرج ہوگا۔ یہ کاپی مکمل کرو پھر سفارش کروں گا۔ چنانچہ چند روز میں کاپی مکمل کر لی۔ رخصت مل گئی۔ حضرت مصلح موعود کی طرف سے دوصد روپے شادی کے لیے مل گئے۔ میرے پاس بھی کچھ رقم جمع تھی وہ لی اور چوہڑی چچا جان کے گاؤں ان کے پاس چلا گیا۔ انہیں شادی کی تاریخ سے آگاہ کیا۔ رات وہاں رہا۔ صبح وہاں سے چلنے کا پروگرام تھا۔ انہوں نے چوکیدار کو حکم دیا کہ دونوں چھترے صبح صبح سالاروالے سٹیشن پہنچاؤ اور خود میرے آگے بہت سارے نوٹ رکھ دیے کہ جتنے ضرورت ہو لے لو اور واپسی کے لیے کسی طرح کی کوئی یقین دہانی یا اقرار نہ مانگا۔ میں نے صرف دوصد روپیہ لیا۔ کہنے لگے اور لے لو شادی پر ضرورت پڑ جاتی ہے میں نے کہا آپ ولیمہ پر آئیں گے ضرورت ہوئی تو لے لوں گا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ اور میں وہاں سے تانگہ میں سالاروالا اور لاہور سے ہوتا ہوا تحصیل نارووال کے اس گاؤں ملہو کے نامی پہنچ گیا جہاں میرے بھائی بندر ہتے تھے۔

شادی کی تیاری مجھے خود ہی کرنی تھی۔ چنانچہ قادیان گیا۔ اہلیہ کے لیے شنیل کا ایک عمدہ جوڑا سلوایا اور ایک اور ریشمی کپڑے کا بھی۔ اپنے لیے شادی کے کپڑے بنوائے۔ نئی اچکن بھی ماسٹر ابراہیم صاحب مرحوم درویش قادیان سے سلوائی۔ عمدہ ململ کی پگڑی بھی خریدی۔ سونے کا تین تولہ زیور مجھے ہمشیرہ سے مل گیا۔ لاہور سے دیگر ضروری اشیاء جو اس وقت شادی کے کپڑوں کے ساتھ ضروری تھیں خود ہی خرید لیں اور واپس گھر آ گیا۔ میری خریداری دیکھ کر سب انگشت بدنداں تھے کہ اس کے پاس پیسے کہاں سے آ گئے۔ بہرحال 13 فروری 1956ء کو میری بارات جو کل نو افراد

پر مشتمل تھی گھر سے روانہ ہو کر لاہور سے سندھ ایکسپریس پر سوار ہو کر اگلے روز دوپہر کو بھریا روڈ پہنچی۔ وہاں سے ہمارے لیے ایک جیپ اور کار کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میں سوار ہو کر کرونڈی پہنچے۔ سفر کی وجہ سے ہمارے حلیے بہت بگڑے ہوئے تھے۔ وہاں جا کر غسل کیا کپڑے بدلے اور پھر مہمانوں والی صورت بنی۔

اب ہر روز نئے گھر بارات کی دعوت ہونے لگی اس طرح قریباً آٹھ دن گزر گئے اور سسرال والوں سے کہا گیا کہ اب واپس جانا ہے۔ اگلے روز آخری فنکشن ہوا جس میں مجھے پلنگ پر بٹھا کر سلامی وغیرہ دی گئی جو آٹھ صد روپے کے قریب ہوگئی۔ اگلے دن ایک بھائی تو کراچی چلے گئے اور باقی سواریوں پر بھریا روڈ پہنچ گئے۔ میں اور میری اہلیہ اونٹ پر سوار ہو کر بھریا روڈ روانہ ہوئے اور دو گھنٹہ میں سٹیشن پہنچ گئے۔ بھریا روڈ سے سندھ ایکسپریس میں سوار ہوئے اور اگلے روز صبح چھ بجے کے قریب لاہور پہنچے اور لاہور میں بعض ضروری اشیاء کی خریداری کے بعد دوپہر کی گاڑی سے گاؤں روانہ ہوئے۔ سٹیشن سے اتر کر تانگہ میں گاؤں جانا ہوتا تھا پھر تانگہ سے اتر کر ایک کلومیٹر پیدل جانا ہوتا تھا۔ بہن اور بھاوجوں اور بعض دیگر عزیزوں نے ہمارا استقبال کیا اور گھر پہنچ گئے۔ ابتدائی چند یوم گھر والوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ ایک بھائی ماسٹر کمال الدین صاحب سندھ سے کراچی چلے گئے تھے ان کی آمد تک ولیمہ معرض التوا میں رہا۔ بہر حال وہ آئے تو ولیمہ کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ عزیزوں اور گاؤں والوں کو دعوت دی گئی۔

دعوت کے لیے بھائیوں سے مشورہ کیا تو کہنے لگے ہر گھر کے ایک فرد کو دعوت دی جائے۔ میں نے کہا کہ نہیں جس گھر کو بھی دعوت دیں اس کے تمام افراد کو دعوت دیں۔ کیونکہ ایک فرد کو بلائیں گے وہ دو تین بچوں کو ساتھ لے آئے گا اور روک بھی نہیں سکیں گے اور کھانے میں کمی آجانے کا امکان رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ سارے

گاؤں والوں کو کھانا کھلایا گیا۔ میں نے پہلے ہی دو پلیٹ چاول علیحدہ کر کے رکھ لیے تھے۔آخر پر بھائیوں سے پوچھا کوئی رہ تو نہیں گیا۔ کہنے لگے فلاں غریب عورت رہ گئی ہے۔میں نے اپنے لیے محفوظ کی جانے والی پلیٹ اس کو بھجوا دی۔الحمد للہ اس طرح دعوت ولیمہ کی تکمیل ہوگئی۔شادی کے بعد مولانا عبدالباسط صاحب بھی گاؤں ملنے کے لیے آئے جن سے دیرینہ دوستی تھی۔گاؤں آکر بڑے خوش ہوئے۔دو تین دن قیام کے بعد ربوہ واپس چلے گئے۔اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے کہ میری شادی کی مبارکباد کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے گاؤں پہنچے۔

شادی کے بقیہ حالات

میری بارات میں میرے تینوں تایا زاد بھائی، بھائی محمد ابراہیم صاحب، بھائی کمال الدین صاحب اور بھائی جلال الدین صاحب،عزیزم خدا بخش صاحب، بڑے بھائی ابراہیم کا داماد (جو پولیس میں ملازم تھا)، سوتیلے ماموں حسن دین صاحب، میرے چھوٹے بہنوئی محمد شریف صاحب (بڑے بہنوئی تو قادیان میں درویش تھے اور ہمشیرہ بھی وہاں جا چکی تھیں)،میری سوتیلی والدہ اور پھوپھی زاد بھائی نظام الدین صاحب کی بیوہ شامل تھے۔

اس خاندان میں میری شادی ان کی امارت کی بنیاد پر تجویز کی گئی تھی۔حالانکہ میں نے اپنی بڑی ہمشیرہ کو اس رشتہ کی تجویز پر لکھا تھا کہ ہمیں کسی دوسرے کی دولت کی طرف حرص کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے۔نیز یہ کہ

مجھے کسی سے کچھ نہیں ملنا۔اگر ملنا ہوتا تو یہ پاکستان نہ بنتا۔میرے والد نے میرے لیے اتنا کچھ بنایا تھا کہ میری اگلی نسل کے لیے بھی کافی تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ مجھے خود بہت کچھ دے گا۔

چنانچہ میری شادی پر دو بستر اور چند برتن اور تین چار دلہن کے جوڑوں کے سوا اور کوئی سامان نہیں آیا تھا۔ اس طرح میری بات کا ایک حصہ پورا ہو گیا۔

میرے سسر محترم نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کے وقت آمد و رفت کا تین افراد کا کرایہ میں دوں گا۔ شادی کے وقت وہ اس حالت میں بھی نہیں تھے کہ اپنا یہ وعدہ پورا کر سکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے نہ ان کے سامنے اور نہ بھائیوں کے سامنے شرمندہ کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی کا محتاج کیا اور میرے اس یقین کا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بہت کچھ دے گا یہ پہلا اظہار ہو گیا جس کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

1951ء میں میرا اپنی شادی کے متعلق خواب

اس خواب کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ چنانچہ جس طرح خواب دیکھا اسی طرح پورا ہوا۔ خواب میں دیکھا تھا کہ میری بیوی کو میری ہمشیرہ اور سوتیلی والدہ دائیں بائیں بازو سے پکڑ کر لا رہی ہیں۔ وہ دونوں ہی اس شادی کی بڑی محرک تھیں۔ پھر دیکھا تھا کہ اہلیہ نے سفید رنگ کے لٹھے کا پرانی طرز کا برقع پہن رکھا ہے اور سرخ جوڑا ہے۔ رخصتی کے وقت بعینہٖ یہی لباس تھا۔ پھر دیکھا تھا کہ وہ اطاعت گزار ہے۔ غرض یہ تینوں باتیں جیسے دیکھی تھیں ویسے بعینہٖ پوری ہوئیں اور میری اہلیہ نے میری خدمت، اطاعت اور بچوں کی عمدگی سے جسمانی اور روحانی پرورش کا خیال رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہترین جزا سے نوازے۔

شادی کے بعد دس دن قریباً گاؤں رہنے کے بعد ربوہ آ گیا اور تعلیم میں مصروف ہو گیا۔ مگر کچھ دن بعد پھر چھٹی لے کر گاؤں گیا تو نسبتی والدہ اہلیہ کو لینے آئی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اہلیہ کو ان کے ساتھ لاہور سے گاڑی میں بٹھا کر رخصت کر دیا اور خود ربوہ آ گیا۔ اغلباً مارچ کا آخر تھا اور اپریل میں سخت گرمی بھی تھی کہ ماہِ رمضان بھی آ گیا تھا۔ ادھر

مکرم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب قائد مجلس خدام الاحمدیہ ربوہ نے قیادت سے رخصت لے لی اور مجھے قائمقام قائد کے طور خدمت کی سعادت حاصل ہوئی۔

کوہ مری میں حضرت مصلح موعود کی حفاظتی ڈیوٹی کی سعادت

ایک دن اچانک خدام الاحمدیہ مرکزیہ سے معتمد خدام الاحمدیہ کا ارشاد ملا کہ آج شام چار خدام رضا کار پہرہ دار کے طور پر چناب ایکسپریس سے کوہ مری کے لیے روانہ ہونے ضروری ہیں۔ تعمیل ارشاد میں مختلف احباب سے رابطہ کیا۔ بالآخر عبدالحکیم صاحب اکمل، سلطان محمود صاحب انور، مقبول احمد صاحب ذبیح اور خاکسار تیار ہو گئے۔ میں نے قیادت کا چارج مرزا عبدالشکور صاحب کو دیا اور شام کو ہم چاروں چناب ایکسپریس میں سوار ہو کر صبح راولپنڈی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ بس کوہ مری پہنچ گئے۔ حضرت مصلح موعود وہاں پر خیبر لاج کوٹھی میں قیام فرما تھے۔ ہمیں ایک کوارٹر رہائش کے لیے دے دیا گیا اور افسر حفاظت کے حکم کے ماتحت حفاظتی ڈیوٹی دینا شروع کر دی۔

حضور نماز کے لیے تشریف لاتے تو قریب سے حضور کی زیارت کی سعادت ملتی۔ بعض اوقات حضور سے گفتگو کا بھی شرف حاصل ہو جاتا۔ مری میں حضور کا تبرک بھی بعض اوقات مل جاتا تھا جو ہمارے لیے نعمت عظمٰی سے کم نہ تھا۔ چھ سے آٹھ گھنٹے تک حفاظتی ڈیوٹی ہوتی تھی اس کے بعد فارغ ہوتے تھے۔ شام کے وقت سیر کو نکل جاتے۔ کبھی جب حضور یا خاندان مبارک کی خواتین نے سیر کے لیے جانا ہوتا تو ان کے عقب میں کچھ فاصلہ پر حفاظتی طور پر ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ تمام مستقل اور رضا کار پہرہ داروں کے کھانے کا انتظام باقی عملہ سے علیحدہ تھا۔ حفاظتی دستہ کے انچارج مکرم کیپٹن ریٹائرڈ چوہدری محمد حسین چیمہ صاحب تھے۔

حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کا ایک خواب اور اس کا پورا ہونا

ایام قیام کوہ مری میں حضرت مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کو آپ کا 1953ء کا خواب یاد دلایا گیا جس میں آپ نے دیکھا کہ آپ کسی پہاڑی مقام پر ہیں اور مشہور مخالف احمدیت مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار زمیندار بھی وہاں ہے اور حضور نے اس کی دعوت کی ہے۔ 1956ء میں حضور بھی کوہ مری قیام فرما تھے اور مولوی ظفر علی خاں بھی کوہ مری میں تھے اور سخت بیمار تھے۔ حضور کو جب خواب یاد دلایا گیا تو اس سراپا رحمت وجود نے اپنے معالج ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کو یاد فرما کر انہیں تیس روپے عنایت فرمائے کہ جا کر مولوی ظفر علی خاں صاحب کا مناسب علاج کریں۔

اس پر ایک دن خاکسار، عبدالحکیم اکمل صاحب اور غالبا مقبول احمد ذبیح صاحب محترم ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ پنڈی پوائنٹ پر جہاں کبھی اہل پیغام کی (بیت الذکر) ہوا کرتی تھی، اس کے بالکل قریب ایک ہوٹل کے کمرے میں گئے۔ جہاں ایک چارپائی پر مولانا صاحب دائیں پہلو پر لیٹے ہوئے تھے اور بالکل بے سدھ پڑے تھے۔ ہم تینوں کے روبرو ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ان کو ٹیکا لگایا۔ ان کے پاس ایک بوڑھا شخص جس کا سر اور داڑھی سفید تھے بطور تیمار دار موجود تھا اور کوئی متنفس وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے پہلی اور آخری بار مولانا ظفر علی خاں صاحب کو وہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ وہاں سے ہم واپس آ گئے۔

فتنۂ منافقین جماعت

منافقین کی سرگرمیوں کے متعلق حضور نے مری میں ہی پہلا خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاول کے بیٹوں مولوی عبدالوہاب صاحب اور مولوی عبدالمنان

عمر صاحب اور ان کے حواریوں کو جماعت سے خارج کر دیا تھا اور اسی سال جلسہ سالانہ پر حضور نے ان کے فتنہ کی تفصیلات جماعت کے سامنے رکھی تھیں۔ پس یہ لوگ جماعت کے اتحاد میں کوئی رخنہ نہ ڈال سکے اور جماعت سے کٹ کر علیحدہ ہو گئے۔ اس معاملہ کی تفصیلات جاننے کے لیے کتاب ''خلافت حقہ آسمانی کی مخالفت اور اس کا پس منظر'' ملاحظہ فرمائیں۔

بعض اور ایمان افروز یادیں

ڈیوٹی سے فراغت کے اوقات میں حضور کی اقتداء میں نماز با جماعت کی ادائیگی کی اکثر و بیشتر توفیق مل جاتی۔ ایک دن نماز عصر کے بعد تشریف فرما ہونے پر فرمایا کہ میرے پاس ایک بہت بڑا فوجی افسر آیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ 1953ء میں تو احرار نے آپ کے خلاف تحریک چلائی تھی جو اتنی منظّم نہ تھی۔ اب آپ کے خلاف جماعت اسلامی تحریک چلانے والی ہے جو منظّم بھی ہے اور اس کا فوج میں بھی نفوذ ہے۔ آپ جو انتظام کر سکتے ہیں کر لیں۔ حضور نے جواب دیا

''ہم نے پہلے کون سا انتظام کیا تھا جو اب کریں۔ جس خدا نے پہلے انتظام کیا تھا وہ اب بھی کر لے گا۔''

اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اس ارشاد سے آپ کے احمدیت کی صداقت اور تعلق باللہ کا کتنا عظیم ثبوت ملتا ہے۔

ایام قیام مری کے دوران ایک دن حضور کو اطلاع ملی کہ بیرونی مشنوں کے اخراجات کے لیے فنڈ ختم ہو گئے ہیں۔ اس پر حضور سخت بے چین ہوئے اور خطبہ جمعہ فرمودہ 15 جون 1956ء میں فرمایا کہ **مجھے کسی چیز نے موت کے اتنا قریب نہیں کیا جتنا اس بات نے کہ بیرونی ممالک میں (دعوت الی اللہ) بند ہو گئی۔ میں نے اپنے**

بیٹے کو وہاں لگایا تھا کہ اسے میری طرح درد ہو گا۔

حضور کے اس ارشاد سے حضور کا کرب و بے چینی واضح ہے۔ جیسے ہی جماعت تک یہ آواز پہنچی جماعت کی طرف سے عطیات کی برسات شروع ہوگئی اور یہ پریشانی دور ہوگئی۔ جماعت کی طرف سے حضور کے ارشاد پر جو ردعمل ظاہر کیا گیا وہ بھی جماعت کی ہی شان ہے۔اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔

ایام قیام مری میں مجھے صاحبزادی امۃ النور صاحبہ جو بی بی امۃ الرشید صاحبہ اور میاں عبدالرحیم احمد صاحب کی صاحبزادی اور حضرت مصلح موعود کی نواسی تھیں، کو پڑھانے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔

جب حضور نماز کی ادائیگی کے بعد مجلس میں رونق افروز ہوتے تو مجھے حضور کو دبانے کی سعادت بھی حاصل ہوجاتی۔ لیکن حضور کو دبانے کا ایک خاص طریق تھا وہ یہ کہ مثلاً اگر آپ ٹانگ دبانے لگے ہیں تو پہلے ٹخنے سے اوپر مضبوطی سے پنڈلی کو پکڑیں اور پھر دبائیں لیکن جھٹکے سے نہیں۔ پھر دوسرا ہاتھ اس ہاتھ کے اوپر کی طرف مضبوطی سے ڈال کر نیچے والے ہاتھ کو پھر اوپر اسی طرح لے جائیں اور اسی طرح نیچے کی طرف دباتے ہوئے آئیں۔ سڑسٹھ سال کی عمر میں بھی حضور کی پنڈلیوں کا گوشت نہایت سخت اور مضبوط تھا۔ اسے دبانے کے لیے کثیر طاقت درکار تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضور کی صحت بہت اچھی تھی۔

مزاح

حضور کبھی کبھی اپنے خدام سے ہلکا پھلکا مزاح بھی فرما لیتے تھے۔ ایک دن عصر کی نماز کے بعد حضور رونق افروز تھے کہ برادرم مقبول احمد ذبیح صاحب نے عرض کیا حضور ہمارا ساتھی سلطان محمود بیمار ہے اس کے لیے دعا کریں۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ سنا

ہے جامعہ کے مولوی آئے ہوئے ہیں اور دو دو سیر حلوہ کھا جاتے ہیں۔ میں نے مؤدبانہ عرض کیا کہ حضور ہم تو مفت میں بدنام ہیں آپ کے پہرہ دار کھا جاتے ہیں۔ اس پر حضور مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ایک دن شیر محمد باورچی نے کڑوا کدو بطور سالن پکا لیا۔ اس پر حضور نے میاں غلام محمد صاحب اختر سے کہا کہ اب آپ کی یہ ڈیوٹی ہے کہ یہ سارا سالن اس کو کھلائیں۔ چنانچہ غلام محمد صاحب کی موجودگی میں شیر محمد نے کڑوے کدو کا سالن کھانا شروع کیا تو اسے الٹی آ گئی۔ اس پر حضور کی خدمت میں اختر صاحب نے اس کی کیفیت عرض کی تو پانچ روپے اختر صاحب کو عنایت فرمائے کہ اب اس کو کوئی اچھی چیز کھلا دو۔ اس طرح حضور ملازمین کی دلداری بھی فرمایا کرتے تھے۔

صاحبزادہ مرزا رفیع احمد صاحب کا بیٹا مرزا طیب احمد چھوٹا تھا۔ ایک پہرہ دار نے اسے گدھے پر سوار کر دیا۔ حضور نے دیکھ کر فرمایا کہ اسے گھوڑے کی سواری کراؤ۔ چنانچہ فوراً حضور کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

حضور کے ارشاد پر میرا سفر لاہور

ایک دن حضور انور نے پرائیویٹ سیکرٹری کے ذریعہ خاکسار کو لاہور جانے کے لیے طلب فرمایا اور ایک خط میاں مظفر احمد صاحب (ایم۔ایم۔احمد) کے لیے دیا اور فرمایا کہ بنیان الٹی کر کے الٹی طرف خط رکھو اور کپڑا رکھ کر سلوا لو اور بنیان سیدھی کر کے پہن لو۔ چنانچہ تعمیل ارشاد میں خاکسار خط لے کر حضرت صاحبزادہ صاحب کی کوٹھی واقعہ جیل روڈ لاہور پہنچا۔ حضرت میاں صاحب پنجاب حکومت کے سیکرٹری مالیات تھے وہ اس وقت اسمبلی کے اجلاس میں شریک تھے۔ خط حضرت بیگم صاحبہ کو دیا۔ انہوں نے ناشتہ کے لیے باورچی کو حکم دیا اور ساتھ ہی الگ کمرہ بھی دیا گیا جس

میں آرام کے لیے بستر اور پنکھا موجود تھا۔ شام کو حضرت میاں صاحب آئے۔ چٹھی کا جواب لیا اور مری روانہ ہو گیا۔ مری پہنچ کر پرائیویٹ سیکرٹری کے ذریعہ حضور کی خدمت میں جوابی خط پیش کر دیا۔

حضور کے ارشاد پر میرا سفر نخلہ

انہی ایام میں حضور نخلہ میں کوٹھی تعمیر کروا رہے تھے۔ حضور کا تاثر تھا کہ اس کی تعمیر کے متعلق درست معلومات حضور کو بہم نہیں پہنچائی جا رہیں۔ اس لیے پرائیویٹ سیکرٹری کو حضور نے ارشاد فرمایا کہ جامعہ کا کوئی طالبعلم بلاؤ۔ چنانچہ سیکرٹری صاحب نے مجھے حضور کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔

حضور نے مجھے کوٹھی کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر دکھا کر تفصیل سے سمجھایا کہ یہ یہ چیزیں آپ نے دیکھ کے آنی ہیں۔ فرمایا سمجھ گئے ہو؟ میں نے ہاں میں جواب دینے کی بجائے حضور کی ارشاد فرمودہ ساری باتیں دوہرا دیں۔ کیونکہ میرے علم میں تھا کہ حضور ہدایت دیتے وقت خوب اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں اور پوچھنے پر پھر سمجھا دیتے ہیں۔ لیکن جب رپورٹ پیش کی جائے تو بھی ٹھیک ٹھیک طور پر بتانا ہوتا ہے۔ میں مری سے براستہ پنڈی، چکوال وغیرہ نخلہ پہنچا اور حضور کی ہدایت کے مطابق کوٹھی دیکھی۔ ایک رات قیام کیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ راستہ میں بس خراب ہو گئی جس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ حضور نے دریافت فرمایا وہ آدمی آیا ہے یا نہیں۔ نفی میں جواب سن کر غصہ سے فرمایا

"کیا بے اعتبار آدمی بھیجا ہے"

تھوڑی دیر بعد پہنچ کر رپورٹ پیش کی اور عرض کیا کہ حضور بس خراب ہو گئی تھی۔ اس پر حضور نے کوئی تعرض نہ فرمایا۔

میرا نخلہ کا دوسرا سفر

حضور نے نخلہ جانا تھا اور ایک دو روز قیام کر کے ربوہ تشریف لے جانی تھی۔ روانگی سے ایک ہفتہ قبل مجھے وہاں کے انتظامات کے لیے بھیجا گیا۔ مجھے حضور کے متعلق علم تھا کہ حضور جس کو بھی کسی فرض کی ادائیگی کے لیے بھیجتے ہیں اس کے متعلق توقع رکھتے ہیں کہ وہ حضور کو روزانہ اپنی مساعی سے باخبر رکھے۔

نخلہ پہنچ کر مکرم ملک فضل عمر صاحب کے ساتھ مل کر انتظامات کیے۔ لیکن اس وقت خوشاب، نوشہرہ وغیرہ کسی بھی شہر سے ہمیں دو سیر سفید چینی نہ مل سکی اور مری میں اس وقت ڈپوؤں پر چینی عام مل رہی تھی۔ میں انتظامات کے لحاظ سے ایک دن خط کے ذریعہ اپنی مساعی سے آگاہ کرتا اور ایک دن تار دیتا۔ چنانچہ آخری تار میں نے یہ دی کہ چینی نہیں ملتی وہ تار حضور کی خدمت میں صبح پانچ بجے چلنے سے قبل ملی اور وہاں سے چینی ہمراہ لے لی گئی۔

حضور نخلہ تشریف لائے تو میں بھی حضور کا استقبال کرنے والوں میں شامل تھا۔ حضور کے ساتھ مصافحہ کا شرف بھی حاصل ہوا۔

میں نے بھی نخلہ سے ربوہ آنا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی ناظر صاحب اعلیٰ مکرم غلام محمد صاحب اختر نے اجازت دے دی کہ ربوہ سے ہو کر مری چلا جاؤں۔ حضور بھی ربوہ تشریف لے آئے اور میں بھی ربوہ آ گیا۔ یہاں غالباً عید تھی جو حضور کی اقتداء میں ادا کی اور پھر سیدھا مری روانہ ہو گیا۔ حضور واپسی پر نخلہ گئے اور وہاں منتظمین سے پوچھا ''وہ نذیر رہان کدھر ہے'' عرض کیا گیا کہ وہ ربوہ سے کوہ مری چلا گیا ہے۔ یہ عاجز اور ناچیز حضور کو یاد تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ تمام امور جو تحریر کیے ہیں لوح حافظہ پر بخوبی نقش ہیں اور آج ساٹھ سال بعد بھی من وعن یاد ہیں۔ اس وقت میری عمر بھی محض

اللہ تعالیٰ کے فضل سے چھیاسی سال ہو چکی ہے۔ ذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

اولاد کی نعمت

اب مجھے حفاظتی عملہ سے رخصت دے دی گئی۔ جامعہ میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ قریباً دو ماہ حضور انور کی خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی اور وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر ملہو کے پہنچ گیا۔ دو چار یوم کے بعد وہاں سے سندھ سسرال چلا گیا۔ اپنی اہلیہ سے ملا۔ وہ اور دیگر سب گھر والے بہت خوش ہوئے اور خوب خدمت ہونی شروع ہو گئی۔ میری اہلیہ امید سے تھیں۔ وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اہلیہ کو لے کر ربوہ آ گیا۔ بہنوئی کو ملا ہوا کوارٹر دوبارہ تعمیر کے لیے خالی کرالیا گیا تھا اور ہمشیرہ اور بچے ایک عزیز کے کرایہ کے مکان کے ایک کمرہ میں جو شمالی پہاڑ کے دامن میں تھا اور سیٹھ اللہ جوایا صاحب کی ملکیت تھا، رہتے تھے۔

ساتھ کھلا میدان تھا۔ یہاں ہی چند یوم گزر بسر کی اور اہلیہ کو ملہو کے اپنی والدہ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹی امۃ السلام سے نوازا۔ لیکن وہاں کوئی زچہ بچہ سنٹر نہ تھا۔ اس لیے دیہاتی دائیوں نے ہی زچگی کرائی جس سے اہلیہ کو سخت تکلیف پہنچی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسے ربوہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے پاس اس قدر اخراجات نہ تھے اور نہ ہی رہائش کے لیے کوئی معقول جگہ تھی۔

تبویب مسند احمد بن حنبل

قبل ازیں ذکر آ چکا ہے کہ 1956ء میں مری کے قیام کے دوران حضور نے فتنۂ منافقین پر خطبہ دیا تھا۔ کچھ لوگوں کو جماعت سے علیحدہ کیا تھا۔ ان میں مولوی

عبدالمنان صاحب خلف حضرت خلیفۃ المسیح الاول بھی شامل تھے۔انہوں نے مسند احمد بن حنبل کی کوئی تبویب کی تھی اور فخریہ کہتے تھے کہ میں نے سولہ سال کا کام تین سال میں کیا ہے۔ہم چند طلباء جامعۃ المبشرین نے اپنے طور پر حدیث کی خدمت کے لیے ایک **مجلس حدیث** قائم کی ہوئی تھی جس میں ہم حدیث کے متعلق بعض تحقیقی مضامین اپنی بساط کے مطابق پیش کیا کرتے تھے اور یہ حضرت مولانا ابوالعطا صاحب پرنسپل جامعۃ المبشرین کے علم میں تھا۔مولانا ابوالعطاء صاحب کسی امر میں حضور سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو حضور نے فرمایا کہ کیا ہمارے علماء اور طلباء تبویب کا کام نہیں کر سکتے؟ حضرت مولانا صاحب نے حضور کی خدمت میں عرض کی کہ حضور کر سکتے ہیں۔تو حضور نے فرمایا پھر کریں۔

اس پر حضرت مولانا نے ہم ممبران مجلس حدیث کو بلا کر حضور کی اس خواہش سے آگاہ کیا۔ہم سب نے بصدق دل اس پر صاد کیا۔چنانچہ 15 ستمبر 1956ء کو یہ کام تین اساتذہ اور دس طلباء جامعہ احمدیہ کے گروپ کے سپرد ہوا اور اس طرح اس کام کی ابتداء ہوئی۔مسند کی تمام احادیث کو ایک بار لکھ لیا گیا۔دوسرے مرحلہ پر غالباً پانچ یا سات طلباء اور ایک استاد تھے۔چنانچہ 15 دسمبر تک تبویب کا کام مکمل کر کے مسودوں کا ڈھیر حضور کی خدمت پیش کر دیا جس پر حضور نے خوشنودی کا اظہار بھی فرمایا اور جلسہ سالانہ پر اس کا ذکر بھی فرمایا کہ جس کام کو فخریہ طور پر یہ کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا کہ سولہ سال کا کام تین سال میں کیا ہے۔اساتذہ اور طلباء جامعہ نے تین ماہ میں کر لیا ہے۔

درج ذیل اساتذہ کرام کی معاونت اور معیت میں یہ کارنامہ سرانجام دیا گیا۔

۱۔مکرم ومحترم جناب ملک سیف الرحمٰن صاحب مفتی سلسلہ احمدیہ

۲۔مکرم ومحترم مولانا غلام باری سیف صاحب

۳۔مکرم ومحترم مولانا خورشید احمد صاحب شاد

پہلے مرحلے میں تو تینوں اساتذہ کرام کام سرانجام دے رہے تھے۔ دوسرے مرحلے میں مولانا خورشید احمد صاحب شاد کی سرکردگی میں کام انجام پذیر ہوا۔اس مرحلہ میں مولانا عبدالباسط صاحب کی کارکردگی نمایاں تھی۔اس کام کے لیے تین ماہ سخت محنت کرنا پڑی۔روزانہ دس گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا۔رات گئے تک کام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعد میں بعض کام کرنے والے بیمار بھی ہو گئے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضور کے منہ سے نکلنے والی یہ بات تین سال کی بجائے صرف تین ماہ میں پوری ہو گئی۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔

تبویب مسند احمد بن حنبل میں مولانا خورشید احمد صاحب شاد نے انتھک اور بے حساب محنت کی تھی۔ان کو نزلہ پانی کی طرح ناک سے بہتا تھا لیکن کام میں ذرہ سا وقفہ یا تساہل نہیں ہوتا تھا۔اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اوران کے درجات بلند فرمائے۔بہر حال تبویب پر ابتدائی کام خوبصورتی سے ہو گیا۔

جلسہ سالانہ قادیان 1956ء میں شمولیت

دسمبر 1956ء کے جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب مرحوم ومغفور، مولانا غلام باری صاحب سیف اور مولوی عبدالباسط صاحب کی معیت بھی حاصل تھی۔جلسہ میں استاذی المکرّم مولانا غلام باری صاحب سیف کی تقریر بہت عمدہ تھی۔

جلسہ کے بعد پاکستان واپس آکر گاؤں سے اہلیہ کو لے کر ربوہ آ گیا۔گاؤں میں زچگی وغیرہ کی حالت میں اہلیہ کو بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔بہر حال اہلیہ اور نومولودہ کو لے کر ربوہ آ گیا اور یہاں ہمشیرہ کے ہاں استطاعت کے مطابق اہلیہ کی دیکھ بھال کی اور پھر اس کو سندھ اس کے میکے بھیج دیا۔

تکمیل تعلیم شاہد اور تبویب کے بعد

یکم جنوری 1957ء کو دفتر اصلاح وارشاد میں حاضری دی اور میری خدمات سلسلہ کا باقاعدہ آغاز ہوا جسے دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انجمن میں میری سروس کا آغاز ہوا۔ اغلباً چند یوم دفتر اصلاح وارشاد میں گزارنے کے بعد صدر انجمن احمدیہ کے دیگر مختلف دفاتر میں ٹریننگ ہوتی رہی۔ اسی دوران مَیں اور مولانا عبدالباسط صاحب فجر کی نماز روزانہ (بیت) مہدی میں ادا کرنے کے بعد احمد نگر کی طرف سیر کرتے اور اکثر و بیشتر احمد نگر کے برابر سے واپس آتے۔ یہ بہار کا موسم تھا اور صبح بڑی عمدہ ہوتی تھی۔

ایک دن سیر کے لیے جا رہے تھے کہ حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب پیدل احمد نگر سے ربوہ آنے کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں سلام کرنے کے بعد مولانا کی معیت میں واپس چل پڑے۔ دورانِ سفر تھوڑی دیر بعد مولانا نے فرمایا کہ اگر باسط کو حدیث کا سپیشلسٹ کروا لیا جائے تو کیا خیال ہے۔ میں نے عرض کیا بہت اچھی بات ہے۔ استاذی المکرّم نے فرمایا کہ وہ خود بھی تو بولے۔ اس پر باسط صاحب نے جواب دیا جو خدمت بھی میرے سپرد کی جائے گی اس کو سعادت سمجھوں گا اور میں نے عرض کیا مولوی صاحب مجھے طب پڑھوا دیں۔ فرمایا کوئی خاندانی تعلق؟ میں نے عرض کیا کہ کوئی نہیں صرف ذاتی شوق ہے۔ دوسری طرف حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ کا مولانا کو ارشاد تھا کہ دولڑکے طب کی تعلیم حاصل کریں اور اس سے پہلے حضور کے اس ارشاد کی تعمیل میں میرے ایک کلاس فیلو مکرم محمد اسلم فاروقی صاحب شاہد کے امتحان کے بعد طب والے سال میں ہی لاہور طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام جو پنجاب یونیورسٹی سے الحاق شدہ تھا، میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ سیر سے واپس

آ کر میں نے سمجھا کہ حضرت مولانا کو کہاں یاد رہنا ہے۔ لیکن انہوں نے گھر پہنچتے ہی حضور کی خدمت میں لکھ دیا کہ حضور نے دو لڑکوں کو طب کی تعلیم دلوانے کا ارشاد فرمایا تھا ایک لڑکا محمد اسلم فاروقی تو پڑھ رہا ہے دوسرا میں نذیر احمد رہان کا نام پیش کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا بھجوا دیں مگر یہ خیال رکھیں کہ لڑکے کے اخلاق اچھے ہوں۔

اس پر حضرت مولانا نے حضور کی خدمت میں لکھا کہ اس نے ہمیشہ میری حسن ظنی کو قائم رکھا ہے۔ انشاء اللہ اب بھی قائم رکھے گا۔ چنانچہ حضور نے مجھے طبیہ کالج بھیجنے کا ارشاد فرما دیا۔ حضرت مولانا نے جب حضور کا یہ ارشاد نظارت اصلاح وارشاد کو بغرض تعمیل ارسال کیا تو اس وقت حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب ناظر اصلاح وارشاد تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا ابوالعطاء صاحب کو اگر حضور کا کوئی ارشاد ہے تو انہیں جامعہ سے لڑکا بھیجنا چاہیے۔ نظارت کا آدمی وہ کون ہیں بھیجنے والے۔ اس پر معاملہ سرد خانہ کی نظر ہو گیا۔

اب رمضان المبارک قریب تھا۔ سندھ کے مربی محترم مولانا غلام احمد فرخ صاحب امسال جماعت احمدیہ کرونڈی ضلع خیر پور میں درس دینے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ اس پر امیر صاحب ضلع نوابشاہ کے نمائندہ سید اکبر علی صاحب دفتر آ گئے کہ مولانا فرخ صاحب سندھی بولتے ہیں اور ہمارے درس سننے والے سندھی ہیں اس لیے جناب فرخ صاحب کو رحمان آباد باندھی میں درس دینے کی ہدایت فرمائی جائے۔ مولانا قمرالدین صاحب فاضل نے اس بارہ میں تجویز نظارت کو پیش کرنی تھی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ جناب مولانا فرخ صاحب کو باندھی کے لیے مقرر کیا جائے اور کرونڈی خاکسار کو بھیج دیا جائے اور باندھی والے ایک آدمی کا کرایہ آمد و رفت جمع کرائیں۔ اس پر عمل ہوا اور 1957ء میں اغلباً رمضان اپریل میں تھا اور کافی گرمی تھی میں درس کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ اب میرے سسرال بھی وہاں تھے لیکن میں نے

جماعتی انتظام کے تحت قیام کیا اور درس وتدریس میں مصروف ہو گیا۔آخری دس دن سسرال والوں کے ہاں رات کو رہائش ہوتی اور دن بھر جماعت کے مرکز میں قیام رہتا۔رات تراویح کے بعد سسرال والوں کے ہاں آتا۔درس دن میں دو بار ہوتا تھا۔ نماز فجر کے بعد اور نماز ظہر کے بعد۔مربی بننے کے بعد یہ میرا پہلا موقع تھا کہ ایک ماہ تک جماعت کی تربیت اور درس القرآن، نماز تراویح اور دیگر نمازوں کا اہتمام کیا۔ کھانے پینے کا انتظام بھی جماعتی تھا۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے بھرپور اعتماد کے ساتھ واپس مرکز آیا اور آکر دفتری زندگی شروع ہوگئی۔

حصول تعلیم طب کے لیے طبیہ کالج میں داخلہ

کچھ دن گزرنے کے بعد ایک دن حضرت مصلح موعود نوراللہ مرقدہٗ نے نماز پڑھانے کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ پھیر کر مولانا ابوالعطاء صاحب سے دریافت فرمایا کہ مولوی صاحب! اب تو طبیہ کالج میں ہمارے دولڑکے ہو گئے نا؟ عرض کیا نہیں حضور ایک ہی ہے۔حضور نے فرمایا کہ آپ نے ایک اور کی منظوری لی تھی اسے جلدی بھجوائیں۔اغلباً مکرم ومحترم چوہدری ظہور احمد صاحب باجوہ نائب ناظر اصلاح وارشاد نے بھی حضور کا یہ ارشاد سن لیا اس پر نظارت نے تجویز بنا کر انجمن سے منظوری لی اور میں غالباً ستمبر 1957ء کو طبیہ کالج انجمن حمایت اسلام لاہور میں داخل ہو گیا۔رہائش کی بھی کوئی دقت پیش نہ آئی کیونکہ جناب محمد اسلم فاروقی صاحب پہلے سے وہاں رہ رہے تھے،ان کے ساتھ ہی ایک کرایہ کے مکان میں رہائش مل گئی۔وہاں کھانا خود بنانا ہوتا تھا۔ہمارے ایک تیسرے ساتھی عبدالعزیز صاحب تھے جو احمدی نہ تھے۔سالن بناتے تھے اور روٹی تنور سے لے کے آتے تھے۔حلقہ میں احمدی احباب بھی موجود تھے اور سلطان پورہ کے نام سے جماعت کا حلقہ قائم تھا۔وہاں (بیت الذکر) بھی تھی اس

میں مغرب وعشاء کی نمازیں با جماعت ادا کرنے کا موقع مل جاتا۔

کالج برانڈرتھ روڈ پر تھا جو میری قیام گاہ سے قریباً دو میل تھا۔ پیدل ہی جانا پڑتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ مکرم اسلم فاروقی صاحب جو شاہد کا امتحان دے کر گئے تھے اور میں کالج کے تمام لڑکوں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور داخلہ کے وقت میں نے اپنا گارڈین بھی ناظر صاحب اصلاح وارشاد کو لکھوایا تھا۔ فاروقی صاحب بھی وہاں احمدیت کے لحاظ سے کافی جانے پہچانے جاتے تھے اور میں نے بھی عمداً فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھ لی تا کہ کسی کو غلط فہمی نہ رہے کہ میں احمدی نہیں ہوں۔ (اس زمانہ میں بعض احمدی نوجوان فرنچ کٹ ڈاڑھی رکھا کرتے تھے) میرے اور محترم محمد اسلم صاحب فاروقی کے علاوہ تین چار احمدی لڑکے پڑھتے تھے لیکن ہماری طرح کھل کر احمدی نہیں کہلاتے تھے آہستہ آہستہ ہمیں انکا علم ہو گیا۔

طبیہ کالج کے اساتذہ کرام

پہلے سال میں حکیم محمد شریف صاحب جگرانوالی معالجات پڑھاتے تھے۔

۱۔ ملک عطاء اللہ صاحب علیگ۔ اناٹومی کی تعلیم دیتے تھے۔

۲۔ ڈاکٹر محمد شریف صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ فزیالوجی اور علم الادویہ پڑھاتے تھے۔

۳۔ حکیم فقیر محمد صاحب

۴۔ حکیم فضل الٰہی صاحب۔ مختلف مواد کو ٹیسٹ کرنا سکھاتے تھے۔

۵۔ حکیم مرزا محمود احمد صاحب اجمیری۔ دوسرے سال کو معالجات پڑھاتے تھے۔

۶۔ حافظ جلیل احمد صاحب تکمیل الطب لکھنؤ۔ سال سوم کو معالجات پڑھاتے تھے۔

۷۔ محترم حکیم قاضی عظیم اللہ صاحب۔ علم زچگی کی تعلیم دیتے تھے۔

سارے ہی اساتذہ کرام اپنے اپنے مضمون میں بہت وسیع علم رکھتے تھے اور سارے ہی اساتذہ احترام سے پیش آتے تھے۔صرف قاضی عظیم اللہ صاحب (یہ گوجرانوالہ سے روزانہ آتے تھے) مخالفانہ ذہن رکھتے تھے۔لیکن حکیم فضل الٰہی صاحب وائس پرنسپل فاروقی صاحب کے ساتھ بھی اور میرے ساتھ بھی بہت نرمی اور ملاطفت سے پیش آتے تھے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین

ایک عجیب واقعہ اور احمدی علم کلام کی عظمت

دوران تعلیم میرے ساتھ ایک نہایت خوبصورت حافظ قرآن نوجوان مکرم محمد خالد صاحب میرے سیٹ فیلو بن گئے چند دن میں کافی مانوس ہو گئے چنانچہ ہم دونوں روزانہ وقفہ میں ایک ٹی سٹال سے اکٹھے چائے پیتے ۔ ہمارا یہ تعلق اساتذہ کو بالکل نہ بھایا اور ایک استاد نے خالد کو کہا کہ تمہارا اس مرزائی لڑکے کے ساتھ کیا جوڑ جبکہ تمہارے والد بہت بڑے عالم دین اور مرزائیوں کے سخت مخالف ہیں۔خالد نے استاد کو جواب دیا کہ جہاں تک عقیدہ کا تعلق ہے وہ مجھے کافر سمجھتا ہے اور میں اسے کافر سمجھتا ہوں مگر جہاں تک اخلاق کا تعلق اس جیسا کوئی لڑکا دکھا دو تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔اس پر استاد محترم خاموش ہو گئے۔

خالد کے والد مکرم مولانا غلام احمد ترنم امرتسری کٹر احراری تھے ان دنوں وہ مسجد مائی لاڈو میں درس القرآن دیتے تھے اسکی بہت شہرت تھی۔اتفاق سے خالد نے مجھے کہا کہ آپ کی ایک کتاب ہمارے گھر بھی ہے مجھے اشتیاق پیدا ہوا۔اس کے ہمراہ گیا دیکھا تو تفسیر سورہ یونس تا کہف ہے اور اس میں سے مولانا نے نوٹس لیے ہوئے ہیں۔جو ان کے درس القرآن کی شہرت کا باعث بن رہے تھے ان کا گھرانہ بیڈن روڈ لاہور میں رہتا تھا۔کبھی کبھار ان کے ہاں میں چلا بھی جاتا تھا اور وہاں مجھے کبھی بھی کوئی

دشواری پیش نہیں آئی بلکہ چائے وغیرہ سے تواضع بھی کی گئی۔ بہر حال خالد وفادار، نڈر دوست کے طور پر رہا۔ مگر دو سال بعد کالج چھوڑ گیا۔

پہلے سال کالج کے طلباء اور اساتذہ کی شاہدرہ باغ پکنک

داخلہ کے کچھ عرصہ بعد کالج کی طرف سے پکنک کا انتظام کیا گیا۔ ہمارے پرنسپل جناب حکیم حافظ جلیل احمد صاحب فاضل تکمیل الطب کالج لکھنؤ بھی پکنک میں موجود تھے۔ بیت بازی کا مقابلہ سال اول کے طلباء اور باقی تینوں سالوں کے طلباء کے درمیان قرار پایا۔ چنانچہ خاکسار کو وہاں خوب مقابلہ کرنے کی توفیق ملی اور جس سے میں کالج میں بخوبی نمایاں ہو گیا۔ محترم فاروقی صاحب بھی قریباً شاہد کر کے گئے تھے اور میں بھی شاہد کے بعد طب کی تعلیم کے لیے گیا تھا۔ لیکن کالج کے باقی طلباء کا معیار تعلیم ہمارے برابر نہ تھا اکثر میٹرک کر کے اور بعض دینی مدرسوں کے سند یافتہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم دونوں کالج کے نمایاں طلباء میں سے تھے۔

کالج مباحثہ میں حصہ لینا

اسی سال سردیوں میں گوجرانوالہ کالج کی طرف سے مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے طبیہ کالج کو بھی دعوت دی گئی۔ قرار پایا کہ زیر بحث آنے والی قرارداد پر پہلے اپنے کالج میں مباحثہ کیا جائے۔ خاکسار نے بھی حصہ لیا۔ موضوع تھا ''اس ایوان کی رائے میں تعلیم انسان کو گمراہ کر دیتی ہے''۔ میں نے مخالفت میں تقریر کی۔ کالج میں میری پہلی پوزیشن آ گئی۔ اس پر مجھے گوجرانوالہ کالج کے مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ پس پہلے سال ہی کالج کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہوا۔ بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور اور چک جھمرہ کالج کے مباحثات میں بھی نمائندگی کی توفیق ملی۔ اگرچہ پوزیشن تو

نہیں آئی مگر کالج کی نمائندگی ہوگئی اور تقریر کی مشق بھی ہوئی۔ چک جھمرہ مباحثہ میں میرے ساتھ مکرم عبدالحمید اعوان ابن حکیم نظام جان صاحب تھے۔

مجلس مذاکرہ اور سیکرٹری کا الیکشن

علمی ذوق کی تسکین کے لیے ایک مجلس مذاکرہ قائم تھی جس کے سربراہ حکیم مرزا محموداحمد صاحب اجمیری اور بعد میں حکیم فقیر محمد صاحب پروفیسر علم الادویہ ومعالجات مقرر ہوئے۔ ہر ہفتہ اجلاس ہوتا تھا اور طلباء مختلف طبی موضوعات پر تقاریر کرتے تھے۔ جنرل سیکرٹری طلباء سال سوم میں سے بذریعہ انتخاب ہوتا تھا۔ طلباء میں اکثریت ضلع میانوالی سے تعلق رکھنے والے متعلمین کی تھی۔ دوران اجلاس مقررین سے طلباء کو تقریر کے بعد سوال کرنے کی بھی اجازت تھی۔ ہر اجلاس کی سیکرٹری مجلس مذاکرہ باقاعدہ رپورٹ مرتب کر کے اگلے اجلاس میں پیش کرتا تھا جس کی شاملین اجلاس سے توثیق کروانا ہوتی تھی ۔ اور ان تقاریر کی بناء پر سالانہ اجلاس میں انعامات بھی ملتے تھے۔ مجھے بھی ڈیبیٹ والی تقریر پر پہلے سال انعام ملا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب خاکسار کالج کے تیسرے سال میں تھا اور تمام طلباء اور اساتذہ یہ جانتے تھے کہ خاکسار احمدی ہے۔ اگرچہ بعض مولوی طلباء پوشیدہ مخالفت بھی کرتے تھے۔ لیکن میری حمایت کرنے والوں کی تعداد کالج میں زیادہ ہوگئی افسوس کہ حافظ محمد خالد تعلیم چھوڑ گیا اور ایک اچھا نڈر ساتھی بچھڑ گیا۔ تیسرے سال کا سیکرٹری مجلس مذاکرہ کا الیکشن آ گیا۔ ایک گروپ کی میں رہنمائی کر رہا تھا اور ایک خوبصورت نوجوان قاضی محمد یحییٰ کو بطور سیکرٹری الیکشن لڑنے کے لیے تیار کیا۔ اس کے ساتھ میرے دو کلاس فیلو محمد کفیل سرحدی اور محمد حسن میانوالی بھی امیدوار تھے۔

میں نے اپنے امیدوار کو منشور کی تقریر لکھوا دی اور تین چار دن اسے حفظ کروائی

اور دوستوں کی محفل میں اسے مشق بھی کرائی اور تقریر کے مندرجات کے باعث اس کی تقریر بھی پہلے نمبر پر رکھوائی۔ اس نوجوان نے نہایت خوبصورت انداز میں کسی کہنہ مشق مقرر کی طرح یہ تقریر کی اور حاضرین کے دل جیت لیے بعد والے دونوں امیدوار اپنی تقاریر کا کوئی اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ رائے شماری مخفی تھی ۔ چنانچہ گنتی پر پچاس فیصدی ووٹ محمد یحییٰ لے گیا اور پچاس فیصدی باقی دونوں نے لیے۔

طبیہ کالج میگزین کی ادارت

قبل ازیں پروفیسر قاضی عظیم اللہ صاحب ایڈیٹر اور مکرم محمد اسلم صاحب فاروقی جوائنٹ ایڈیٹر تھے ۔ اب فیصلہ ہوا کہ ادارت کے فرائض طلباء میں سے کوئی ادا کرے۔ چنانچہ احباب نے قائمقام پرنسپل صاحب کی خدمت میں رسالہ کی ادارت کے لیے میرا نام پیش کیا۔ لیکن بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کیونکہ میں سال دوم میں تھا اور ایڈیٹر سال چہارم میں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ عبدالوحید خان پشاوری کا نام بطور ایڈیٹر منظور کیا گیا۔ مگر کام بکلی میرے سپرد تھا۔ رسالہ ماہوار نکلتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق بھی عطا فرمائی کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس فرض سے بخوبی عہدہ براء ہوسکا۔ دوران سال کالج کی طرف سے یوم حکیم محمد اجمل صاحب دہلوی جو علم طب میں ایک بہت بڑا اور معروف نام ہے منانے کا فیصلہ ہوا۔

اطباء کی دو تنظیمیں

میرے زمانہ طالبعلمی میں اطباء دو پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے ۔ ایک پارٹی کے لیڈر حکیم محمد حسن قرشی تھے اور حکیم عبدالمجید عتیقی ان کے ساتھ ایک مشہور طبیب اور مقرر سیکرٹری تھے۔ دوسری پارٹی کی راہنمائی حکیم علی احمد نیر واسطی کر رہے تھے۔ یہ اس

وقت کے بہت بڑے معالج اور نباض مشہور تھے۔طبیہ کالج کی انتظامی کمیٹی میں دونوں پارٹیوں کے حکماء شامل تھے۔

یوم اجمل کی تاریخ طے کر کے تمام بڑے بڑے حکماء کو شمولیت کی دعوت دی گئی۔ مکرم جناب حکیم علی احمد نیر واسطی اور حکیم فرید احمد عباسی سابق پرنسپل طبیہ کالج دہلی۔ حکیم سعید احمد پھلوری مدعو تھے۔ان مدعووین میں میانوالی کے طلباء کے باعث مولوی عبدالستار نیازی کو بھی بلایا گیا۔طبیہ کالج کمیٹی میں بعض وکیل بھی شامل تھے وہ بھی آئے اجلاس شروع ہوا۔تلاوت ونعت کے بعد تقاریر شروع ہوئیں چند تقاریر کے بعد میرا نام پکار دیا گیا۔میں نے حکیم محمد اجمل خاں اور ان کے رفقاء نے 1910ء سے 1920ء تک اس وقت کی حکومت کی اس کوشش کے خلاف کہ طب یونانی اور آیوویدک کو ختم کر دیا جائے، جو بڑی بہادرانہ اور کامیاب جدوجہد کی تھی وہ بیان کی۔اور کہا کہ آج بھی طب کے مخالفین وحاسدین نہ صرف موجود ہیں بلکہ اسے ختم کرنے کے لیے پوارزور صرف کر رہے ہیں۔

آج ہم میں جناب شفاء الملک محمد حسن قرشی صاحب جیسے عظیم طبیب اور جناب حکیم علی احمد نیر واسطی جیسے علامہ راہنما موجود ہیں۔اس صورت حال پر جب میں غور کرتا ہوں کہ آخر اسی قسم کے نامساعد حالات میں جناب حکیم محمد اجمل خان صاحب اور ان کے رفقاء کیوں کامیاب ہوئے اور ہم کیوں ناکامی سے دوچار ہیں تو لازماً میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ وہ اتفاق واتحاد کی نعمت سے سرفراز تھے اور ہم میں انفرادیت کی لعنت کارفرما ہے اگر آج ہم نے حالات کی نزاکت کا احساس نہ کیا تو مستقبل کا مؤرخ بڑے افسوس سے یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے بعد چند ناخلف لوگ پیدا ہوئے جن کی کوتاہی اور غفلت کے باعث طب جیسا عظیم اور مفید فن موت کی آغوش میں ابدی نیند سو گیا اور میں نے اسی پر تقریر ختم کر دی۔

میرے بعد علامہ نیر واسطی صاحب کی تقریر تھی وہ بالکل حواس باختہ ہو گئے کبھی سٹیج پر مفلر اتار کر رکھتے تو کبھی ٹوپی اور بار بار یہ فقرہ دوہرا رہے تھے ''میں ہسٹری کا طالبعلم ہوں میں تاریخ کا طالبعلم ہوں'' اور یاد نہیں کہ وہ مزید کچھ کہہ سکے یا نہیں اور تقریر ختم ہو گئی۔

علامہ نیر واسطی کے بعد مولانا عبدالستار صاحب نیازی کی تقریر تھی انہوں نے سٹیج پر آتے ہی کہا اگر آپ نے ترقی کرنی ہے تو اس نوجوان نے جو کہا میں اس کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں اور چند جملے اور کہہ کر بیٹھ گئے ازاں بعد ایک دوست نے بتایا کہ مولوی صاحب نے کہا تمہارا ساتھی ہے تو مرزائی مگر اس نے تمہاری نمائندگی کا حق خوب ادا کر دیا ہے۔

اجلاس کے اختتام پر مدعووین کی خدمت میں چائے پیش کی جانی تھی میں بھی اس میں شامل تھا۔عبدالستار صاحب نیازی نے مجھے اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھایا اور ترقی طب کے متعلق میرے خیالات دریافت کرتے رہے۔اسی طرح حکیم فرید احمد صاحب عباسی سابق پرنسپل طبیہ کالج دہلی نے تھپکی دیتے ہوئے کہا ''شاباش بیٹا آج آپ نے خوب تقریر کی۔اور میری تقریر من وعن طبیہ کالج میگزین کے اجمل نمبر میں چھپ گئی اسی طرح طبیہ کالج میگزین میں میرے اداریے پڑھ کر حکیم سعید احمد صاحب پھلوری نے اپنے رسالہ کی ادارت کی پیشکش کی۔ علاوہ ازیں ہمارے پروفیسر حکیم فقیر محمد صاحب نے ایک دن پرنسپل صاحب کو کہا کہ اسے یعنی مجھے یہاں پروفیسر لگا لو تو آپ کو بنا بنایا ایڈیٹر بھی مل جائیگا۔ پرنسپل صاحب نے فرمایا کہ ہاں کر لے تو میں تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا میں یہاں نوکری کے لیے نہیں آیا میں نے زندگی وقف کی ہوئی ہے میں تو صرف علم طب سے بہرہ ور ہونے کو آیا ہوں کسی نوکری کی تلاش کے لیے نہیں آیا۔

انجمن فروغ طب یونانی کا رجسٹرڈ کرانا اور ایک پریس کانفرنس

کالج میں ایک نوجوان محمد اسلم جنونی قسم کا طالبعلم تھا اس نے چند ساتھیوں کے نام سے ایک انجمن فروغ طب یونانی رجسٹرڈ کروائی۔ جس میں مجھے سیکرٹری بنایا گیا۔ ہم نے یونانی علاج کی افادیت اور ارزاں ترین طریق علاج ثابت کرنے کے لیے ایک پریس کانفرنس کرنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس میں مَیں نے پریس نمائندگان کو دینے کے لیے مواد تحریر کرتے ہوئے بتایا کہ یونانی طریق علاج میں ایک دوائی ہڑتال گاؤدنتی کے نام سے معروف ہے جسے آگ میں جلا کر کشتہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایک سیر ہڑتال کو کشتہ کیا جائے تو اس سے تین پاؤ دوائی میسر آئیگی اس دوائی کی مقدار خوراک ایک رتی ہے تین پاؤ دوائی کے 60 تولے اور 5660 پانچ ہزار چھ صد ساٹھ رتی دوائی ہوگی جس کا مطلب ہے کہ ایک مریض ایک خوراک ایک رتی کے حساب سے پانچ ہزار چھ صد ساٹھ مریضوں کو دوائی دی جائے گی جبکہ ایک سیر ہڑتال کی قیمت ایک روپیہ کے قریب تھی۔ گویا ایک روپیہ کے خرچ سے 5660 مریضوں کو ایک ایک خوراک دی جاسکتی ہے اس سے سستا طریق علاج اور کون سا ہوسکتا ہے۔

پرنسپل صاحب اندرون خانہ ہماری معاونت کر رہے تھے۔ انہوں نے پریس کانفرنس کا لاہور ہوٹل میں انتظام کروایا اور صاحبزادہ فاروق صاحب جو لیڈر قسم کے آدمی تھے ان سے میرا لکھا ہوا مضمون پریس کانفرنس میں پڑھوا دیا چنانچہ اگلے دن اخباروں نے وہ مواد من وعن شائع کر دیا۔ اس سے بڑے بڑے اطباء میں کھلبلی مچ گئی اور ان کو اپنی کرسیوں کی فکر پڑ گئی۔ انجمن کے مقاصد میں سے یونانی علاج کے لیے ایک اقامتی ہسپتال بنانا اور دیگر رفاہی مقاصد تھے چنانچہ بڑی ہلچل مچی۔ طبیہ کالج کمیٹی کے ممبران نے پرنسپل صاحب سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے تو انہوں نے کہا لڑکوں

نے ایسا کام کیا ہے ان سے پوچھ لیں۔ پریس میں تشہیر ہوگئی مگر اس پر عمل نہ ہوسکا۔

انعامات کا حصول

اللہ تعالیٰ کے فضل سے سال سوم کے امتحان میں دوم آیا اور سلور میڈل کا حقدار ٹھہرا۔ دریائے راوی پر کشتی رانی کے مقابلہ میں مَیں نے اور میرے ساتھیوں نے مقابلہ جیت لیا۔ دوران سال زیادہ تقاریر کرنے کا انعام بھی پایا۔ اب حکیم حاذق بن گیا۔ سال سوم کے بعد سال چہارم زبدۃ الحکماء کے امتحان کے لیے داخلہ لیا۔ اب رسالہ کا بھی ایڈیٹر تھا۔ پرنسپل صاحب بہت مہربان تھے ایک دن انہوں نے کوئی کام کرنے کو کہا۔ میں نے سستی کی۔ دوسرے روز بھی ایسے ہی ہوا۔ تو فرمانے لگے بات کیا ہے؟ میں نے جواب نہیں دیا تھا کہ میرے قریب کھڑے میرے نائب نے کہا یہ اداس ہیں ان کے بچے سندھ ہیں یہ سنتے ہی فرمانے لگے تمہیں آج سے ایک ماہ کی چھٹی ہے بے شک آج ہی چلے جاؤ چنانچہ میں رات کو گاڑی میں سوار ہوا اور اگلے روز اہلیہ اور بچی کے پاس پہنچ گیا۔ ایک ماہ بعد واپس آ کر سپرد شدہ کاموں کو انجام دیا۔

ایک ایمان افروز واقعہ

ایک دن پیدل کالج جا رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا عید قریب تھی راستہ میں خیال آیا کہ میرے پاس سولہ روپے ہیں آٹھ روپے تو لاہور ربوہ آمد و رفت کا کرایہ ہوگا۔ بیوی بچی کے ساتھ پہلی عید آ رہی ہے اتنے پیسوں میں عید کیا ہوگی۔ ادھر یہ خیال اُدھر دوسرے لمحے میرے ضمیر نے میرے منہ پر زور دار تھپڑ مارا کہ تمہارے پاس سولہ روپے ہیں تم خدا تعالیٰ کا شکر نہیں کرتے جن کو عید کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوگا ان کا حشر تمہیں کیوں یاد نہیں۔ بس پھر اس وقت ندامت سے میری جو

کیفیت ہوئی اس کو الفاظ میں بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ استغفار کرتا کرتا کالج کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا سامنے روشن نامی قاصد کھڑا تھا وہ کہنے لگا رہان صاحب تمہارا وظیفہ آیا ہوا ہے۔ میں نے کہا میرا وظیفہ نہیں کسی اور کا ہوگا۔ کیونکہ میں تو صدر انجمن احمدیہ سے اپنا خرچ براہ راست وصول کرتا ہوں وہ پھر بھی مصر رہا اور کہا ایک بار پرنسپل صاحب کے پاس جاؤ تو سہی مجھے پھر بھی اعتبار نہ آرہا تھا آخر پرنسپل صاحب نے بلایا اور فرمایا بارہ آنے کے رسیدی ٹکٹ لاؤ اور روشن سے منگوا کر ٹکٹ پیش کیے ایک فارم پر لگا کر مجھے ٹکٹ پر دستخط کرنے کو فرمایا۔ میں نے دستخط کر دیئے اور پرنسپل صاحب نے دوصد چھہتر روپے گن کر میرے ہاتھ پر رکھ دیئے جو اس وقت خاصی بڑی رقم تھی میں خدا تعالیٰ کی قدرت پر حیران تھا۔ اب مجھے **لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ** کی تفسیر سمجھ آ گئی۔ چنانچہ عید کے لیے بہت کچھ خریدا۔ دس روپے روشن کو اور پانچ روپے ایک سائیکلوں کے محافظ کو بھی دیئے۔ اور بڑی شان سے عید پر گھر آ گیا۔ اہلیہ نے سوال کیا یہ پیسے کہاں سے آئے؟ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے دیئے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ **من حیث لا یحتسب** کی صداقت بھی عملی طور پر واضح ہوگئی۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ 1958ء میں مارشل لاء لگا تو ایوب گورنمنٹ نے زیر تعلیم مہاجر طلباء کو وظیفہ دینے کی ٹھانی۔ میں بھی مہاجر تھا۔ کالج کی طرف سے میرا نام بھی گیا۔ لیکن مجھے ہرگز یاد نہیں کہ نام کہیں گیا ہے۔ کب گیا ہے اور کیوں گیا ہے۔ یہ اللہ کے فضل کے سوا کچھ نہیں۔

سیکرٹری مجلس مذاکرہ کے انتخاب کی دلچسپ صورتحال

سال چہارم کے آغاز پر میں سندھ سے آیا تو معلوم ہوا کہ آئندہ سیکرٹری مجلس مذاکرہ کے انتخاب کے لیے جوڑ توڑ شروع ہو گیا ہے اور مولوی عبدالفتاح سرحدی

انتخاب میں حصہ لینے کے لیے پر تول رہا ہے مجھ پر مولوی کی بد دیانتی پہلے ہی ظاہر تھی سابق سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ سال گزشتہ آپ کی تیرہ تقاریر کو اس نے گیارہ بنایا اور اپنی گیارہ تقاریر کو انعام لینے کی خاطر تیرہ بنایا جسے میں نے درست کیا۔ یہ مولوی معیار دیانت سے گرا ہوا اپنے اندر کی مخالفت بھی جاری رکھتا تھا میں سلام کرتا تو صرف ہاتھ اٹھا کر جواب دیتا وعلیکم السلام نہیں کہتا تھا۔ میں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ میرے دوست غضنفر علی نے مجھے بتایا کہ میں تو مولوی صاحب کو ووٹ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ میں نے اس کی دیانت داری کا معیار بتایا تو اس نے کہا میں وعدہ توڑ دیتا ہوں میں نے اسے کہا کہ تم میرے دوست ہو میں وعدہ خلافی پسند نہیں کرتا تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو میرے پاس اس کی مخالفت کے لیے کافی ووٹر ہیں۔ جب مولوی صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو بے اختیار کہنے لگا میں اس کا مخالف ہوں وہ میرا مخالف ہے لیکن اس کے کردار کی بلندی کی کوئی حد نہیں۔ میرے پاس مولوی صاحب اپنے دوستوں کا وفد لے کر آیا اور ووٹ دینے کی خواہش کی۔ میں نے کہا مولوی صاحب ووٹ مخفی ہوتا ہے میں آپ کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ آپ فکر نہ کریں اور جھوٹے طور پر آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلانے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک یہ طریق درست نہیں بلکہ اگر میرا اور میرے دوستوں کا ووٹ آپ کو ملنا ہے تو اس سے زیادہ یقینی ووٹ نہ ہونا چاہیے اور اگر مخالفت میں ووٹ جاتا ہے تو بھی آپ کے علم میں ہو تو بہتر ہوگا۔ اس لیے میں واضح طور پر کہتا ہوں کہ اگر ضیاء الرحمان نے الیکشن لڑنا چاہا تو میں اس کی بھرپور مدد کرونگا یا اس کے بعد اگر فیاض کھڑا ہو تو بھی اسکی مدد کرونگا اور آپ کو ووٹ نہیں دونگا۔ البتہ اگر انہوں نے الیکشن نہ لڑنا چاہا تو آپ کے معاملہ میں غور کرونگا۔ مولوی صاحب کو یقین تھا کہ جو میں نے کہا بعینہٖ اسی طرح ہو گا میرے پاس آنے سے قبل ان کے ساتھیوں میں جب میرے پاس آنے کا مشورہ

ہوا تو مولوی صاحب کے دوستوں نے کہا جو جواب نذیر رہان دے وہ سن کر واپس آجاؤ۔اس سے مزید بات نہ کرو۔ وہ وہی کرے گا جو اس نے کہہ دیا۔

طبیہ کالج کمیٹی نے ایک بار حاذق کا کورس چار سالہ کرنے کے لیے کالج پراسپیکٹس میں لکھا کہ سیکرٹری سال سوم میں سے یا سال چہارم میں سے ہوگا۔ چنانچہ میں نے پرنسپل صاحب کی خدمت میں اس قانون کا سہارا لے کر الیکشن لڑنے کی درخواست دے دی اور ساتھ مشہور کر دیا کہ اگر پرنسپل صاحب نے درخواست مسترد کی تو میں طبیہ کالج کمیٹی میں اپیل کر کے حکم امتناعی حاصل کرونگا اور اگر طبیہ کالج کمیٹی نے بھی اپیل مسترد کی تو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل میں اپیل کر کے حکم امتناعی حاصل کرونگا اور سال بھر الیکشن نہیں ہوگا اس پر کالج بھر میں کھلبلی مچ گئی اور مولوی صاحب اور ان کی پارٹی سخت فکر مند ہو گئی ۔ پرنسپل صاحب محترم در پردہ مولوی صاحب کے حمائتی تھے اور مجھے یہ معلوم تھا دوسری طرف میرے ساتھ ان کا حسن سلوک مثالی تھا اس لیے میں بھی ان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کچھ دنوں بعد درخواست واپس لی تو پارٹی کی جان میں جان آئی۔الیکشن ہوا مولوی صاحب کامیاب ہوگئے ۔ میرے دوست کھڑے نہیں ہوئے تھے میں نے مولوی صاحب کی حسب وعدہ مخالفت نہیں کی جس سے وہ اور بھی خوش ہوئے اور اب پوری بشاشت سے نہ صرف سلام کا جواب دیتے بلکہ مصافحہ کے لیے بھی ہاتھ بڑھانے لگے۔الیکشن کی خوشی میں جو پارٹی کی اس میں بھی مجھے وہ خود لینے آئے۔

لاہور میں جماعتی مساعی کی توفیق

لاہور طبیہ کالج میں جا کر کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ مجھ سے قبل برادرم محمد اسلم صاحب فاروقی جو کلاس فیلو بھی تھے اور دوست بھی تھے وہ وہاں موجود تھے ان کے

ساتھ ہی رہائش اختیار کر لی چونکہ جماعتی حلقہ سلطان پورہ میں رہائش پذیر تھے اس لیے احباب حلقہ سے ان کا بخوبی تعارف تھا اس وجہ سے مجھے بھی کسی قسم کی کوئی الجھن پیش نہیں آئی احباب حلقہ میں خدام الاحمدیہ کے لحاظ سے تو شیخ ریاض محمود صاحب ابن شیخ عبدالقادر صاحب تاجر چرم ۔ چوہدری رشید احمد صاحب بی ۔اے ۔ بی ایڈ، ان کے والد محترم چوہدری بشیر احمد صاحب ریلوے کے مین دفتر میں ملازم تھے، معمر تھے اور بہت نیک، متقی کم گو بزرگ تھے۔

حضرت شیخ محمد حسین صاحب بھی اسی حلقہ میں تھے ان کے تین بیٹے شیخ لطیف احمد صاحب ۔حمید احمد صاحب اور محمد نعیم احمد صاحب تھے۔اسی طرح سلطان پورہ میں شمس بلڈنگ جو شیخ شمس الدین صاحب تاجر چرم مرحوم کے ورثاء کی ملکیت تھی اس میں شیخ فیروز الدین صاحب اور شیخ عبدالحمید صاحب رہائش پذیر تھے۔(بیت الذکر) کے قریب امیر دین صاحب ۔خدا بخش صاحب اور بعض اور احمدی دوست رہتے تھے۔

مرکزی طور پر لاہور میں میاں محمد یحییٰ صاحب قائد لاہور ۔محمد صدیق شاکر صاحب معتمد۔ مبارک محمود پانی پتی صاحب ۔مبارک احمد صاحب ۔عبدالقیوم ناگی صاحب اور دیگر احباب مرکزی قیادت کے فرائض سرانجام دے رہے تھے میں چونکہ ربوہ میں بھی خدام الاحمدیہ ربوہ کی مجلس عاملہ کا رکن رہ چکا تھا مجھے بھی لاہور کی قیادت میں خدمت کا شرف بخشا گیا۔حلقہ سلطان پورہ میں زعیم حلقہ منتخب ہوا اور خدمت کی توفیق پائی ۔حلقہ میں کبھی کبھی حضرت شیخ عبدالقادر صاحب مربی سلسلہ بھی دورہ پر تشریف لایا کرتے تھے ۔نہایت قریب سے شیخ صاحب کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔نہایت بزرگ ۔متقی ۔کم گو۔ پیار کرنے والے بزرگ اور احمدیت کا سچا نمونہ تھے۔

لاہور حلقہ سلطان پورہ میں بہت مخلص عبادت گزار مالی قربانی کرنے والے اور جماعتی امور میں پیش پیش مکرم **چوہدری سلطان علی صاحب** بھی تھے جو ریلوے ہیڈ کواٹر

میں ملازم تھے۔تمام تر جماعتی چندوں میں ضرور حصہ لیتے تھے۔مہمان نوازی میں بھی بہت آگے تھے ایک بار پورا رمضان المبارک کے تمام روزے مجھے رکھوائے۔ان کی اہلیہ بھی بہت نیک تھیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو دو بیٹوں سے نوازا ایک کا نام منور علی اور دوسرے کا نام انور علی ہے۔ان میں سے منور علی صاحب کو تو قائد لاہور رہنے کا شرف حاصل ہے اور اب بھی جماعتی کاموں میں پیش پیش ہیں۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے چوہدری صاحب مرحوم بھی سیکرٹری مال حلقہ تھے۔

دارالمطالعہ

حلقہ میں احباب کے تعاون سے ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اس میں ایک بڑی میز پر جماعتی لٹریچر، الفضل، رسالہ جات اور سیاسی اخبار احباب کے مطالعہ کے لیے رکھے جاتے تھے بعض احباب بڑی باقاعدگی سے الفضل کا مطالعہ کرتے تھے پہلے کسی غیر از جماعت شخص سے کمرہ کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ پھر بوجوہ وہ خالی کیا تو شیخ عبدالحمید صاحب شمس بلڈنگ والوں سے کمرہ کرایہ پر لے کر دارالمطالعہ کا احیاء ہوا۔شیخ محمود احمد صاحب ابن شیخ فیروز دین صاحب نگران دارالمطالعہ تھے ایک رات کو انہوں نے بتایا کہ میرے پاس فنڈ ختم ہے کل دارالمطالعہ میں اخبار نہیں آئیں گے۔

ہم تین چار دوست بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا یہ تو کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ پیسوں کی کمی کے باعث اخبار بند ہوں۔آیئے اپنے سے ابتداء کرتے ہیں۔یہ میری طرف سے کچھ رقم ہے۔آپ سب بھی حسب توفیق حصہ ڈالیں پھر اسی وقت احباب کے پاس چلتے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت احباب حلقہ کے گھروں میں گئے اور اس سے مقامی فنڈ کا چندہ مل گیا اور اخبار بند ہونے کی نوبت نہ آئی اور ثابت ہوا کہ الٰہی جماعت کا کوئی کام پیسوں کی کمی سے نہیں بند ہوتا۔

معالجاتی زندگی کا آغاز

ایام قیام لاہور میں میری معالجاتی زندگی کا اللہ تعالیٰ کے فضل سے آغاز ہو گیا تھا۔ کالج میں ایک لڑکا عبدالرزاق نام داخل ہوا جس کے پیٹ میں کیڑے تھے۔ کثرت احتلام کا بھی مریض تھا۔ شدید کمی خون کا بھی شکار تھا۔ اس کا علاج کیا تو اللہ کے فضل سے تینوں بیماریوں میں اسے بہت فائدہ ہوا۔

اسی طرح میں شمس بلڈنگ میں شیخ عبدالحمید صاحب کا کرایہ دار تھا میں ایک دن دیر سے کمرے میں آیا تو شیخ صاحب آ گئے میں نے پوچھا اس وقت تک آپ سوئے نہیں۔ کہنے لگے کہ اہلیہ کو اسہال کی تکلیف ہے۔ فلاں حکیم سے علاج کراتے ہیں تین چار دن آرام کے بعد پھر اسہال شروع ہو جاتے ہیں اور اسہال سفید رنگ کے آتے ہیں۔ میں نے انہیں ایک گرم معجون دارچینی الائچی اور چائے کی پتی کے قہوہ کے ساتھ ایک خوراک دے دی اور ایک خوراک گرم سفوف کی دے کر کہا کہ ایک گھنٹہ بعد یہ پڑیا بھی دے دیں۔ صبح اطلاع ملی کہ مریضہ رات آرام سے سوئی رہی ہے تشخیص پوائنٹ یہ تھا کہ معدہ میں گرمی ہو تو سفید اسہال نہیں آ سکتے لہٰذا معدہ میں گرمی کی کمی ہے جو درست ثابت ہوا اسے ایک ماہ کی دوائی دی اور ان کی ضد کی وجہ سے کہ مفت دوائی نہیں لینی اس وقت صرف دو روپے لے لیے۔

اسی مریضہ کے والد صاحب شوگر کے مریض تھے ان کو بھی دو چاول افیون فی خوراک ایک دو دیگر ادویہ کے ساتھ ملا کر روزانہ صبح کھانے کو دی تو وہ بھی بہت حد تک ٹھیک ہو گئے یعنی شوگر کنٹرول ہو گئی اسی طرح نوجوان مریضوں کو حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا نسخہ سفوف تالمکھانہ بہت کھلایا ہے جو بے حد مفید ثابت ہوا ہے اعصابی طاقت کے لیے مختصر سا نسخہ جند بیدستر۔ جدوار۔ عود صلیب نوجوانوں کے لیے بہت مفید ہے۔ ہم

وزن پیس کر بقدر چنا گولیاں بنائیں اور صبح ناشتہ کے بعد ایک گولی اور رات سوتے وقت ایک گولی مریض کو دیں تقویت اعصاب اور دماغ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

سال سوم کے بعد سال چہارم میں داخلہ لیا تو زیادہ تر کلاس فیلوز حاذق کے بعد چلے گئے۔ سال چہارم میں ہم سات آٹھ طلباء ہی رہ گئے تھے۔ طبیہ کالج میگزین کی ادارت اب کلی طور پر میرے سپرد تھی۔ ہر ماہ با قاعدگی سے رسالہ شائع ہوتا تھا۔ ایک ضخیم اجمل نمبر بھی شائع کیا جس میں مشاہیر اطباء، سٹاف کالج میگزین اور ایڈیٹر کی تصاویر بلاک بنوا کر شائع کروائی گئیں۔ ہر ماہ کا ایشو خاکسار با قاعدگی سے خلافت لائبریری، پرنسپل صاحب جامعہ احمدیہ اور نظارت اصلاح وارشاد کو بھجواتا تھا۔

ایک عجیب واقعہ اور اس کی بنیاد پر لکھا جانے والا اداریہ

ایک دن میں نے انچارج شفاخانہ طبیہ کالج اور اپنے معالجات کے پروفیسر حکیم مرزا محمود احمد صاحب اجمیری سے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ آپ کہتے ہیں طب اسلامی کا طریق علاج ہی اصل علاج ہے۔ آپ کے مخالفین نے سر درد کے لیے اسپرو ایجاد کی جس سے منٹوں میں درد غائب ہو جاتا ہے۔ کیا آپ کے پاس بھی سر درد کے لیے کوئی ایسا سریع التاثیر نسخہ ہے؟ بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ فرمایا ”ہے تو سہی“ عرض کیا پھر ایسے نوادرات تو عطا ہو جانے چاہئیں۔ ”فرمانے لگے بھئی کیا کریں کوئی اہل نہیں ملتا۔ میں نے عرض کیا کہ سینہ میں لے کر مر جانے کی بجائے کسی نا اہل کو ہی دے دیا جائے تو بہتر ہوگا تا کہ مخلوق خدا کا بھلا ہو جائے۔ اس پر مکمل سکوت اختیار فرمایا۔ ان کے اس جواب پر خاکسار نے ارشادِ باری تعالیٰ

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَّاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ

کو بنیاد بنا کر ایک اداریہ لکھا کہ اگر اطباء کرام نے خود کو زندہ رکھنا ہے اور علم طب

کو زندہ رکھنا ہے تو ان کو چاہیے کہ مخلوق خدا کی بھلائی میں مصروف ہو جائیں۔اور اگر وہ نافع الناس نہیں بنتے تو کچھ ہی عرصہ بعد ان کا نام ونشان مٹ سکتا ہے۔

علم طب اور نبض

نبض دیکھ کر تشخیص مرض کر لینے کے متعلق عامۃ الناس سخت غلط فہمی کا شکار ہیں اور اس بارہ میں بے شمار کہانیاں مشہور ہیں۔ایک قصہ میں نے بھی سنا ہوا ہے ممکن ہے آپ کو بھی علم ہو۔مشہور ہے کہ کوئی حکیم صاحب بڑے نباض تھے۔نبض دیکھتے ہی ہر مرض بتا دیتے تھے ایک دفعہ انہیں آزمانے کے لیے ان کے ساتھ والے کمرے میں بلی کے پاؤں سے دھاگہ باندھ کر حکیم صاحب کو دکھایا گیا کہ مریضہ پردہ دار ہے نبض کے لیے ہاتھ نہیں دکھا سکتی تو حکیم صاحب نے فوراً فرمایا یہ بھوکی ہے چھچھڑے کھانے کو دو۔گویا حکیم صاحب نے دھاگے سے جان لیا کہ مریض عورت نہیں جانور ہے سبحان اللہ کیا علم ہے۔حالانکہ ممکن ہے بلی نے آواز نکالی ہو اور حکیم صاحب تک وہ آواز پہنچ گئی ہو۔اسی طرح اور بھی بہت سے قصے عامۃ الناس میں مشہور ملیں گے میں نے طبیہ کالج میں نبض کی حقیقت جاننے کے لیے اپنے اساتذہ سے استدریافت کیا کہ حکماء نے نبض کی بانوے قسمیں لکھی ہیں۔کیا کوئی حکیم صاحب ایسے ہیں جو ان اقسام کو جانتے ہوں اور انہیں یاد ہوں۔افسوس کہ میرے سوال کا جواب بکلی نفی میں تھا۔اس پر میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ اگر تشخیص کے لیے تنہا نبض کافی ہے تو سابقہ حکماء نے تشخیص مرض کے لیے باقی آٹھ نو امور کو مدنظر رکھنے کا کیوں لکھا ہے۔مثلاً مریض کی جنس، عمر، پیشہ، وطن یا علاقہ، پیشاب پاخانہ، چہرہ کی رنگت وغیرہ کل دس امور بمع نبض مدنظر رکھنے کی وضاحت فرمائی ہے۔کیونکہ بعض امراض مردوں کو ہوتے ہیں بعض عورتوں کو۔پھر عمر کو بھی دیکھنا ہے کہ بعض امراض جوانوں کو ہوتے ہیں

بعض بوڑھوں کو۔ پھر پیشہ کہ کام کیا کرتا ہے۔اگر وہ آہن گر ہے تو اس کو اور قسم کا مرض ہوگا اگر وہ سنگ تراش ہے تو اس کا مرض بھی مختلف ہوسکتا ہے۔ پھر مرطوب، گرم اور سرد علاقہ کے مریضوں کی بیماریوں میں فرق ہوسکتا ہے۔نبض صرف کسی حد تک تشخیص میں معاون ہوسکتی ہے لیکن ایک لمبے تجربہ کے بعد۔

اساتذہ سے مایوس ہوکر میں نے حکیم اجمل خان صاحب کی بعض کتب کا مطالعہ شروع کیا تو انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ نبض ایک لمبے تجربے کے بعد آتی ہے۔اور وہاں مثال دی ہوئی ہے کہ ایک شخص میرے پاس آیا میں نے اس کی نبض دیکھی اس نے خود بتا دیا کہ اسے اسہال ہے۔ میں نے وہ نبض ذہن میں محفوظ کر لی۔ بعد ازاں تین مختلف وقتوں میں اسہال ہی کے مریض آئے اور میں نے ان کی نبض کی کیفیت یاد رکھ لی۔ آئندہ مجھے اس قسم کی نبض والے مریض پر اسہال کا مریض ہونے کا حکم لگانے میں دقت نہ ہوئی۔اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بھی چند قسم کے مریضوں کی نبض کی پہچان کی۔لیکن نبض سے پہچان سے قبل ہی نبض ہاتھ میں دیتے ہوئے مریض اپنا سارا دکھ درد خود بیان کر دیتا ہے۔اس میں نبض سے تشخیص والا معاملہ ہی کوئی نہیں۔

ربوہ میں نباض کی آمد

سنا ہے کہ اب ربوہ میں بھی حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب اغلباً ہومیو ہوں گے کیونکہ ایلوپیتھی والے تو نبض سے تشخیص کے قائل نہیں، تشریف لے آئے ہیں۔ اللہ کرے خاکسار کی ان سے ملاقات ہو جائے اور میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں تو غلط فہمی دور ہو جائے ورنہ عوام الناس کو اس دھوکہ سے محفوظ کرنے کا موقع مل جائے۔

وہ لوگ جنہوں نے نبض دیکھنے کا کسی قدر تجربہ کیا ہے وہ بھی نبض دیکھنے کے مختلف طریقے بتاتے ہیں۔کوئی کہتا ہے صبح نہار منہ نبض دیکھیں۔بعض کہتے ہیں کہ نبض

پر چار انگلیاں رکھنے سے نبض کی ٹھوکر جس انگلی کے نیچے لگے گی اس کی مرض دوسری جگہ نبض کی ٹھوکر لگنے سے الگ ہوگی۔ بہرحال نبض سے تشخیص کے متعلق بہت ہی غلط فہمی پائی جاتی ہے جس کا دور ہونا ضروری ہے۔

محترم قاضی عظیم اللہ صاحب سے دلچسپ نوک جھونک

محترم قاضی صاحب پرانی وضع کے عمر رسیدہ استاد تھے۔ بڑے تیز طرار اور حاضر جواب تھے۔ ہمیشہ شلوار قمیض، ہاف کوٹ اور رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ دوسری طرف محترم ڈاکٹر محمد شریف صاحب مشہور سیاسی وسماجی خاندان کے فرد اور بیگم سلمیٰ تصدق حسین کے بھتیجے تھے۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر تھے۔ وہ کوٹ پتلون ٹائی وغیرہ لگا کر آتے۔ قاضی صاحب پتلون کو پیچک تنی کہتے۔ ایک دن اتفاق سے کالج کی گیلری میں کفیل سرحدی جو میرا کلاس فیلو تھا وہ میں اور قاضی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کھڑے تھے۔ کفیل کو شرارت سوجھی ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگا دیکھو جی ڈاکٹر صاحب قاضی صاحب پتلون کو پیچک تنی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا قاضی صاحب اس میں کوئی شاعریت نہیں پائی جاتی۔ قاضی صاحب نہایت تیزی سے فرمانے لگے اس میں کیا فرق ہے ہم پیچک تنی کہتے ہیں تم پتلون کہتے ہو۔ میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں فرق بتاؤں۔ کہنے لگے ہاں بتاؤ۔ میں نے کہا قاضی صاحب فرض کریں آپ کا صاحبزادہ یہاں کھڑا ہے سامنے سے آپ آرہے ہیں۔ میں اسے کہوں کہ وہ تیرا پیو آندا ہے۔ تو کہے گا کتنا بدتمیز ہے۔ اگر کہوں کہ آپ کے ابا حضور آرہے ہیں تو وہ بڑا خوش ہوگا۔ بس اتنا ہی فرق ہے۔ قاضی صاحب جھٹ کہنے لگی بھئی ہمارے ساتھ استاد بات کریں لڑکوں سے تو شیطان نے بھی پناہ مانگی تھی۔

اسی طرح ایک دن بحیثیت نگران میگزین کسی بات پر مجھ سے خفا ہو رہے تھے۔

میں نے کہا قاضی صاحب آپ کے رسالہ کو میری ضرورت ہے مجھے رسالہ کی ضرورت نہیں یہ رہا رسالہ جس کو مرضی کام دے دیں۔اس پر خاموشی سے باہر نکل گئے۔اصل میں اندر اس بات کی خلش تھی کہ میں عبدالحمید اعوان کو نائب ایڈیٹر بنانا چاہتا تھا جو احمدی تھے۔محترم پرنسپل صاحب نے سنا تو مجھے بلا کر کہا آپ قاضی صاحب کے ساتھ الجھنے کی بجائے میرے ساتھ ہر بات کر لیا کریں اور تسلی سے اپنا کام جاری رکھیں۔ بہر حال پرنسپل صاحب میرے کام کی وجہ سے بہت مطمئن تھے۔

ایک دفعہ راولپنڈی سے ایک حکیم صاحب کی برسی میں شمولیت کے لیے پرنسپل صاحب کو دعوت ملی تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔وہاں جنرل واجد علی برکی جو اس وقت وزیر صحت تھے آئے ہوئے تھے۔میں نے ان کی خدمت میں طبیہ کالج میگزین پیش کیا۔وہاں بہت سے اطباء سے ملاقات ہوئی جنہیں طبیہ کالج میگزین خریدنے کی تحریک کی۔سٹیشن پر ایک احمدی نوجوان نے پرنسپل صاحب کو لٹریچر پیش کیا تو میری طرف اشارہ کر کے کہا ان کو دے دیں۔میں نے اس نوجوان کو بتایا کہ میں احمدی ہوں۔اغلباً دو روز بعد وہاں سے واپسی ہوئی۔

ڈاکٹر محمد شریف صاحب ایک دن رسالہ میں میری دلچسپی اور محنت دیکھ کر کہنے لگے رسالہ سہ ماہی کر دو۔میں نے عرض کیا محنت سے ڈر کر ایسا نہیں کر سکتا۔مجھے جماعت تعلیم دلوا رہی ہے کسی دنیاوی غرض کے لیے نہیں آیا۔میں نے اس دن خاکی رنگ کی پتلون اور قمیص کے اوپر نسواری رنگ کی سویٹر پہن رکھی تھی۔کہنے لگے پھر جماعت کو کہو تمہیں اچھے لباس میں ملبوس رکھیں۔میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب میں جب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جن کے پاس ایسا لباس بھی نہیں ہے تو میں اللہ کا بہت شکر کرتا ہوں۔اس جواب پر ڈاکٹر صاحب بے حد خوش ہو کر کہنے لگے کہ جواب میں آپ لوگوں سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

لاہور میں شیخ ظہور الدین صاحب سے دوستی

جب میں 1957ء میں لاہور حصول علم طب کے لیے گیا تو وہاں برادرم اسلم فاروقی صاحب پہلے موجود تھے۔ گذشتہ صفحات میں ان کا متعدد بار ذکر آچکا ہے۔ لاہور میں متعدد احمدی دوستوں سے محبانہ تعلقات قائم ہوئے ان میں سے ایک شیخ ظہور الدین صاحب بھی تھے جن کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی دوکان تھی۔ گاہے بگاہے ان سے ملنے دوکان پر چلا جاتا۔ تعلقات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے۔ ادھر میری طبیعت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ کسی دوست کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایک دن شیخ ظہور صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آج میں مارکیٹ اس صورت میں جا سکتا ہوں کہ میرے پاس تین صد روپے ہوں۔ اس وقت تین صد روپیہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے سیکرٹری صاحب مال مکرم سلطان علی صاحب کو امانت کا چیک دے کر ان سے پیسے لیے اور ظہور صاحب کو دے دیے وہ خوش خوش مارکیٹ چلے گئے۔ لیکن اب قسمت ان پر مہربان نہ تھی۔ دن بدن مالی حالت خراب ہو گئی۔ کبھی مال روڈ پر سیلز مین اور کبھی بس کی کنڈکٹری اور کبھی چپکیری۔ لیکن گزر اوقات مشکل تھی۔ ایک بار یہ اپنے والد صاحب کے ساتھ کراچی کپڑے کے کاروبار کے لیے گئے۔ اغلباً 59-1958ء کی بات ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں کرونڈی سسرال میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ ایک دن محترم شیخ صاحب اچانک کراچی سے پڈعیدن سٹیشن پر اتر کر وہاں سے پیدل بھریا روڈ اور بھریا روڈ سے پیدل کرونڈی پہنچ گئے۔ اور یہ کوئی سولہ سترہ میل کا سفر تھا۔ میں کرونڈی قصبہ سے قدرے دور سسرال والوں کی الگ بستی تھی وہاں تھا جسے مقامی زبان میں گوٹھ کہا جاتا ہے۔ ان کا پیغام آیا تو میں قصبہ کرونڈی جا کر ان سے ملا۔ قصبہ میں کافی عزیز تھے۔ ان کی مہمان نوازی کی۔ شام کو بستی آ گئے۔

رات یہاں بسر کرنے کا انتظام کیا۔اگلے روز ان کو سسرال کے باغ میں لے گیا وہاں کیلے کھاتے رہے اور اس سے اگلے دن انہوں نے واپسی کا اظہار کیا۔ان کو سائیکل پر گرمی میں بھریا روڈ لے کر گیا۔ٹکٹ کے علاوہ کچھ رقم بطور سفر خرچ بھی چپکے سے ان کی جیب میں ڈال دی۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے پاس کچھ نہیں۔اب یہ بہت خوش ہوئے اور آج تک میرے اس سلوک کو یاد کرتے ہیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بتاتے ہیں۔ابھی اللہ کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک، نہایت زرخیز دماغ، حاضر جواب اور حاضر دماغ۔ لاہور سے 1960ء میں دوبئ وہاں کی فوج میں بھرتی ہو گئے اور پھر خوب پیسہ کمایا۔ میرے پیسے بھی ایک بار آئے تو واپس کر گئے۔نہایت پختہ عقیدہ اور عمل کے احمدی۔ دوبئ فوجی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ دارالعلوم میں کوٹھی بنالی۔ابھی تک دوستی کو نباہ رہے ہیں۔انہوں نے دو بار حج بیت اللہ کی سعادت پائی۔

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں نے کسی دوست کو آزمایا نہیں نہ ہی اللہ تعالیٰ نے زندگی بھر کسی کا محتاج کیا ہے۔لاہور میں اور بھی دوست تھے مگر اب طوالت کے خوف سے ان کے ذکر کو چھوڑتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور دین ودنیا کی حسنات سے نوازے۔آمین

بھائیوں کو بعض اہم معاملات میں مشورے

لاہور سے ملہو کے گاؤں قریب تھا۔بعض اوقات عزیزوں کو ملنے چلا جاتا تھا اور بھائیوں نے بھی مجھے اب اپنا بڑا سمجھ لیا تھا اس لیے تمام معاملات میں مشورہ کرتے۔ پاکستان بننے سے قبل جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ اب جوان ہو رہی تھیں ان کے رشتوں کی بھی فکر لاحق ہوئی۔ چنانچہ بھائی کمال الدین صاحب جو مدرس تھے ان کی ایک بیٹی

جوان تھی۔ دوسری طرف دوسرے بھائی جلال الدین صاحب کا بیٹا مبشر بھی جوان تھا۔ ذہن میں آیا کہ دونوں بھائیوں کا آپس میں رشتہ جوڑ دیا جائے لیکن بعض مشکلات درپیش تھیں۔ میں نے تجویز دے دی بھائی تو رضامند ہو گئے لیکن دیگر مشکلات کو دور کرنے میں کچھ دیر لگی اور یہ رشتہ طے ہو گیا۔اسی طرح بھائی کمال الدین کا بیٹا عزیزم مسعود احمد جو میرا بہت پیارا دوست بھی ہے اب جوان تھا اور بی اے کر چکا تھا۔اس کا رشتہ بھائی نے میرے سسرال میں ایک لڑکی سے اس بنا پر کرنا چاہا کہ سسرال اس کو اپنے خرچ پر بار ایٹ لاء کروا دیں گے۔ مجھے اس پر سخت کوفت ہوئی کیونکہ وہ لڑکی بھی زیور تعلیم سے آراستہ نہ تھی۔ میں نے بھائی جان کو بہت سخت خط لکھا کہ آپ پہلے بھی ایسا تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ میں ایسا ہر گز نہیں ہونے دوں گا۔اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا رشتہ ربوہ میں ایک بی۔اے پاس لڑکی سے کروا دیا جو حضرت بابا فضل محمد صاحب ہرسیاں والے کی پوتی اور مولوی صالح محمد صاحب واقف زندگی کی بیٹی تھی۔ یہ رشتہ بہت کامیاب رہا۔مسعود احمد کے چار بیٹے ہیں ان میں سے تین انجنیئر ہیں۔ایک یو کے، ایک کینیڈا اور ایک امریکہ میں ہے۔ایک بیٹا بی اے کے بعد پبلک سروس کمیشن میں ملازم ہے۔ایک بیٹی ڈاکٹر ہے اور انگلستان میں ہے۔ دوسری بیٹی بھی ایم اے ہے اور اس وقت میاں کے ساتھ کینیڈا میں ہے۔

اہلیہ کی بیماری

میں لاہور میں پڑھتا تھا اور اہلیہ سندھ اپنے میکے میں تھیں۔ وہاں وہ شدید بیمار ہو گئی۔ مقامی طور پر علاج معالجہ کروایا گیا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر آپا سعیدہ زوجہ خواجہ عبدالرحیم صاحب ساکن کراچی میرے سسرال آئی ہوئی تھیں۔ ان کی زمین میرے سسر صاحب نے اپنے قریب الاٹ کرا دی تھی اس لیے ان سے

تعلقات تھے۔ وہ میری بیوی کو کراچی لے گئیں اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا اس نے بڑی محنت اور توجہ سے علاج کیا۔ رہائش کے اخراجات تو آپا سعیدہ وغیرہ نے برداشت کیے اور علاج کے اخراجات سسرال والوں نے جو اس وقت خود تنگی کا شکار تھے، برداشت کیے۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا بیماری بہت حد تک دور ہوگئی ورنہ مزید اولاد ہونا بظاہر ممکن نہ رہا تھا۔ میں ایک ماہ کی رخصت لے کر وہاں گیا اور واپس آ گیا اللہ تعالیٰ نے اولاد کی امید دلا دی۔ اہلیہ کراچی معائنہ کے لیے گئی ادھر لاہور میں مجھے خواب آئی کہ میری اہلیہ میرے سامنے آئی ہے اس کے سر پر کالا دوپٹہ ہے اور وہ امید سے ہے۔ کراچی سے آپا سعیدہ کی بہن رشیدہ کا خط آیا جس میں مجھ سے مٹھائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ میں نے جواباً لکھا کہ مٹھائی امتحان میں کامیابی کی مانگ رہی ہیں یا مجھے یہ خواب آئی ہے وہ سچی ہے۔ اس کا جواب آیا کہ آپ کی خواب سچی ہے۔ چنانچہ امۃ السلام بڑی بیٹی کے چار سال بعد امۃ القیوم عطا ہوئی۔ ڈلیوری کے لیے کراچی میں انہی ڈاکٹر صاحبہ کے پاس لے جایا گیا اور تمام اخراجات اللہ تعالیٰ نے مجھے خود برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ 1961ء کی اغلباً پہلی سہ ماہی کی بات ہے۔

طبیہ کالج میں آخری امتحان اور لاہور سے واپسی

اب کالج میں سالانہ امتحانات قریب آ رہے تھے۔ ادھر پرنسپل صاحب کی طرف سے سپرد کیے گئے کام بکثرت ہوتے۔ رسالہ کی اشاعت مزید بوجھ تھا۔ کلاس میں بیٹھتا تو پرنسپل صاحب کا بلاوہ آ جاتا۔ بعض اوقات بعض تحریریں مجھ سے لکھوائی جاتیں۔ ایک استاد نے کلاس میں کم حاضری کے باعث کہہ ہی دیا کہ آپ کو پرنسپل صاحب ہی پاس کروائیں گے۔ میں نے اسے خاموشی سے سن لیا۔ جب امتحان میں ایک مہینہ رہ گیا تو میں نے پرنسپل صاحب سے عرض کیا کہ اب میں اپنی پڑھائی کے

علاوہ اور کوئی کام نہیں کروں گا۔انہوں نے کہا بہت اچھا اور میں اللہ کا نام لے کر امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔امتحان کے پرچے دیے۔ایک دن وہی استاد صاحب جنہوں نے کہا تھا کہ اب پرنسپل صاحب ہی آپ کو پاس کرائیں گے، کہنے لگے رہان صاحب امید ہے کہ آپ اول آئیں گے۔چنانچہ جب نتیجہ نکلا تو میں 77.5 نمبر لے کر اول آیا اور تین گولڈ میڈلز کا حق دار قرار پایا۔ایک کالج کی طرف سے،ایک حکیم نوازش علی گولڈ میڈل اور ایک رسالہ کی ایڈیٹر شپ کے باعث۔میرے دوست شیخ ریاض محمود صاحب تاجر چرم نے میری تصویر بنوا کر روزنامہ نوائے وقت میں شائع کروائی۔اسی طرح طبیہ کالج میگزین میں بھی تصویر اور انعامات کی تفصیل شائع ہوئی۔

رسالہ خالد میں خدمت اور چک نمبر 93T.D.A جانا

لاہور سے واپسی پر نظارت اصلاح وارشاد میں حاضری دی۔ساتھ ہی ربوہ پہنچے سے ایک دن پہلے کا محررہ خط مکرم سید میر داؤد احمد صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ کی طرف سے مجھے ملا کہ مجھ سے ملیں۔چنانچہ اگلے روز جامعہ جا کر خدمت میں حاضر ہوا اور خط بھی پیش کیا تو آپ نے رسالہ خالد جو خدام الاحمدیہ کا ماہنامہ تھا میں مولانا دوست محمد شاہد صاحب کے ساتھ کام کرنے کا ارشاد فرمایا۔چنانچہ مولانا کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ماہنامہ خالد میں بھی خدمت کی توفیق پائی۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔

ربوہ میں ہمشیرہ کے ہاں کوارٹرز صدرانجمن احمدیہ جونیئر کوارٹر میں قیام تھا۔مختلف اوقات میں ہمشیرہ کے ہاں لمبا قیام کیا ہے۔مگر میں نے ہمیشہ اپنا خرچ خود ہی ادا کیا ہے۔بہن اور بہنوئی پر کبھی بوجھ نہیں بنا۔ہمشیرہ کی پہلے خاوند سے ایک بیٹی تھی جو پہلے ملہو کے میں والد صاحب کے پاس رہتی تھی اور لڑکوں کے پرائمری سکول میں اس نے پرائمری پاس کی پھر اسے ربوہ داخل کرایا گیا اس کا بھی نصف خرچ میں برداشت

کرتا تھا تا کہ ہمشیرہ اور بہنوئی کو تکلیف نہ ہو۔ بہنوئی مددگار کارکن تھے۔ بہت کم گزارہ تھا۔ بہرحال مل جل کر گزر اوقات ہو رہی تھی۔

ربوہ میں روزانہ دفتر حاضری دیتا۔ دن بھر حضرت قاضی محمد نذیر صاحب جو تالیف وتصنیف میں مصروف رہتے، ان سے علم حاصل کرتا یا دفتر کی کسی خط وکتابت پر لگا دیا جاتا تو یہ خدمت سرانجام دینے کی سعادت حاصل کرتا۔ نومبر میں چھٹی لے کر سندھ چلا گیا اور پھر اہلیہ جو دو ڈھائی سال سے میکے رہ رہی تھی اسے بھی ساتھ لانے کا پروگرام تھا۔ اب تو ایک کی بجائے دو بیٹیاں تھیں۔ تاہم چھٹیاں وہاں گزار کر بیوی بچیوں کو ساتھ لے کر جلسہ سالانہ کے قریب واپس ربوہ آ گیا۔ جلسہ سالانہ کے ایام تک ابھی میری رخصت باقی تھی۔ جلسہ سالانہ میں شمولیت کی سعادت ملی۔

جلسہ کے بعد جنوری کے آخر میں ڈیرہ غازی خان، چک نمبر 93T.D.A ضلع مظفر گڑھ میں جماعتی جلسے تھے اور بہاولپور میں ایک معاملہ کی دفتری تحقیقات تھیں۔ چنانچہ جناب مولانا قمرالدین صاحب، جناب مولانا دوست محمد شاہد صاحب اور استاذی المکرّم مولانا قاضی محمد نذیر صاحب فاضل ان جلسوں میں شمولیت کے لیے بطور مرکزی نمائندے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں فارغ بیٹھا تھا۔ قاضی صاحب کی خدمت میں ساتھ لے جانے کی درخواست کو تو دفتر سے مجھے بھی ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی گئی اور میں بھی ہمراہ روانہ ہو گیا۔ پہلے ملتان سے ڈیرہ غازی خان گئے وہاں جلسے کی تقاریر ہوئیں مجھے بھی وہاں وفات مسیح کے عنوان پر تقریر کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہاں مولانا عبدالمنان شاہد صاحب مربی متعین تھے۔

ڈیرہ غازی خان سے چک 93T.D.A پہنچے۔ یہ سب لوگ پاکستان آ کر پہلے احمد نگر میں آباد تھے۔ تھل ترقیاتی منصوبہ کے تحت انہوں نے یہاں زمینیں خریدیں اور آباد ہو گئے۔ تقریباً سب واقف تھے۔ احمد نگر میں مل کر کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ

جلسہ میں اساتذہ اور بزرگوں کے ساتھ مجھے بھی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر تقریر کی سعادت نصیب ہوئی۔ قاضی صاحب کی تقریر نہایت اعلیٰ علمی دلائل سے مزین ہوتی تھی لیکن مولانا دوست محمد صاحب کا انداز بھی اچھوتا تھا، آواز بھی بلند تھی۔ مجھے بھی کسی قدر ہمت کرنا ہوتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ تقریر کی توفیق دے دیتا تھا۔ یہاں سے ملتان آئے اور ایک دن قیام کیا۔ میں نے خدام سے مل کر رسالہ خالد کے دس بارہ خریدار بنا لیے اس پر مولانا دوست محمد صاحب بہت خوش ہوئے۔ قریباً ایک ہفتہ کے دورہ کے بعد واپس ربوہ آمد ہوئی اور دفتر حاضری اور دفتری ڈیوٹی کی ادائیگی شروع ہوگئی۔ مجھے خط و کتابت کے لیے ایک کرسی اور میز دے کر بٹھا دیا گیا۔

اب گرمیوں کا موسم تھا کہ صدر صاحب چک 93T.D.A نے دفتر سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی مربی دیا جائے۔ چنانچہ ڈیڑھ ماہ کے لیے مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ سارے دوست واقف تھے۔ کوئی دقت نہ ہوئی۔ چک دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ درمیان میں (بیت الذکر) اور سکول تھا۔ میں نے سکول میں ڈیرہ لگا لیا وہاں پرانے واقف ایک معلم وقف جدید غلام احمد صاحب چغتائی بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔ پانچوں نمازیں با جماعت ادا ہونے لگیں۔ دوپہر کو مردوں اور عورتوں کے لیے درس القرآن شروع کیا گیا۔ نماز کا ترجمہ سکھانا شروع کیا۔

قبولیت دعا کا واقعہ

بہت زیادہ گرمی تھی۔ قریب کے گاؤں کے نمبردار ابراہیم کو احباب (دعوت الی اللہ) کرتے رہتے تھے۔ میں نے بھی اس سے گفتگو کی کہنے لگا آپ دعا کریں اگر آج رات بارش ہوگئی تو میں احمدی ہو جاؤں گا۔ چنانچہ ہم سب حاضرین نے نمازوں میں خشوع و خضوع سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے خوب بارش برسائی۔ بارش کے بعد جب

اس سے رابطہ کیا گیا تو کہنے لگا بارش تو ہونی ہی تھی۔ میں اپنے ساتھ علاج معالجہ کے لیے کچھ ادویہ بھی لے گیا۔گرمی کے باعث بچوں کو اسہال کی زیادتی کی تکلیف ہوئی۔ ان کا علاج کیا۔کافی مریضوں نے فائدہ اٹھایا۔ایک احمدی کو درد عرق النساء تھی اس کا علاج کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ٹھیک ہو گیا۔مربی نے ہر روز نئے گھر میں کھانا کھانا ہوتا تھا جس سے کافی مشکل پیش آتی۔ بعد ازاں انہوں نے معلم صاحب کے ہاں انتظام کر دیا تو سکون ملا۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے سوا ماہ کی مساعی سے کافی بیداری پیدا ہوئی تو صدر صاحب نے مجھے مزید وہاں رکھنے کے لیے ناظر صاحب اصلاح و ارشاد کی خدمت میں درخواست کر دی۔ چنانچہ مزید پندرہ دن وہاں گزار کر واپس آیا۔

بہاولپور تقرری

واپسی پر پہلے تو کوئٹہ تقرری کی خبر ملی جس سے مجھے گھبراہٹ ہوئی کیونکہ کوئٹہ ایک سرد مقام تھا میرے پاس اور بچوں کے پاس مناسب کپڑے بھی موجود نہ تھے۔ ساری صورتحال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر کے دعا کی تو بہاولپور تقرری کا پروانہ مل گیا۔ وہاں پہلے دو معلم صاحب موجود تھے اور ایک مربی صاحب بھی تھے مگر مربی صاحب کو مرکز نے وہاں سے تبدیل کر دیا تھا۔ مجھے بڑی فکر لاحق ہوئی میں نے مولوی محمد صدیق صاحب لائبریرین سے اتفاقاً ذکر کیا تو انہوں نے کہا وہاں کے امیر صاحب بھائی کے بڑے دوست ہیں ان کا خط امیر صاحب کے لیے لے لو۔ میں نے ان کی بات خاموشی سے سن لی اور دل میں سوچا کہ جانا تو اللہ تعالیٰ کے کام ہے پھر بندوں کے خط بندوں کے لیے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے وہ خط نہیں لیا۔

ہاں یہ بتانا بھول گیا کہ بہاولپور کے ساتھ بہاولنگر بھی میرے حلقہ تربیت میں دیا گیا تھا۔ خط ملنے پر اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کرتے ہوئے روانہ ہوا۔ سٹیشن پر گاڑی سے

اترا تو معلمین کرام لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سٹیشن سے قریب ہی مشن ہاؤس تھا۔ وسیع پلاٹ تھا لیکن مربی اور معلمین کے لیے جو کوارٹر بنائے گئے تھے وہ بہت چھوٹے تھے۔ میرے بچے سندھ گئے ہوئے تھے۔ مشن ہاؤس سے امیر صاحب کی رہائش کوئی دو کلومیٹر دور دفتر انہار کے کوارٹر میں تھی۔ امیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نہایت بشاشت سے پیش آئے۔ دفتر چیف انجنیئر انہار میں ایڈمنسٹریٹر کے عہدہ پر فائز تھے۔ دو بیٹے اور بیوی اور خود کل چار افراد تھے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرنے والے متقی و صاحب علم، جماعتی قواعد کی سختی سے پابندی کرنے والے بہت ہی نیک آدمی تھے۔ قریبا پچیس سال سے محکمہ میں ملازم تھے لیکن عمر بھر ایک پائی رشوت لینا بھی ثابت نہیں۔ دونوں ٹانگوں سے معذور تھے۔ چپڑاسی کے سائیکل پر بیٹھ کر جاتے تھے۔ گھر میں بھی بڑی سادگی تھی۔ جمعہ کی نماز ان کے کوارٹر پر ادا کی جاتی تھی۔ ان کے پاس جانے کے لیے مرکز نے نئی سائیکل خرید کر مجھے دے دی تھی۔

معلمین میں سے ایک حکیم محمد عقیل صاحب تھے۔ یہ خود احمدی ہوئے تھے۔ قبل ازیں محکمہ نہر میں ملازم تھے۔ زندگی وقف کر کے ملازمت ترک کر دی۔ تہجد گزار اور نیک آدمی تھے۔ دوسرے رشید احمد طیب صاحب تھے۔ یہ مولانا غلام احمد ارشد کے صاحبزادے تھے۔ وقف کر کے معلم وقف جدید بنے اور بہاولپور میں تعینات تھے۔ دونوں حکمت کی دوکان چلاتے تھے۔ آدھا وقت مکرم حکیم عقیل صاحب دیسی طریق علاج سے مریضوں کو مستفید کرتے تھے اور آدھا دن مکرم رشید احمد طیب صاحب ایلو پیتھی علاج معالجہ کرتے تھے۔ میرے ساتھ دونوں مروت سے پیش آتے تھے۔ محترم عقیل صاحب ضلع کی جماعتوں سے واقف تھے۔ ان سے جماعتوں کی تعداد، وقوع اور راستہ وغیرہ دریافت کیا۔ جماعتوں میں سب سے قریب جماعت خانقاہ شریف نزد سمہ سٹہ تھی۔ تین چار افراد پر مشتمل تھی۔ علاوہ ازیں چک 23 ڈی۔ این۔ بی کی

جماعت میرے تایا زاد بھائیوں کے ننھیال کی جماعت تھی۔ابتداء میں یہاں صدر چوہدری نذیر احمد صاحب تھے، جو رشتہ میں ہمارے ماموں تھے، ان کے دو بیٹے، بڑے ماموں بشیر احمد صاحب مرحوم کے تین بیٹے بمع اہل وعیال مقیم تھے اور یہ سب دوصدا ایکڑ زمین کے مالک تھے۔دونوں ماموں اور خالائیں تو فوت ہوگئی ہیں۔ ایک مخلص عزیز مکرم برادرم شریف احمد صاحب نہایت مخلص اور فدائِ سلسلہ تھے، وہ بھی فوت ہوگئے ہیں اوران کی اولاد ربوہ آباد ہوگئی ہے۔

تیسری جماعت احمد پور شرقیہ تھی جو چار افراد پر مشتمل تھی جو چاروں مختلف جگہوں پر رہتے تھے۔چوتھی جماعت اوچ شریف کی پرانی جماعت تھی جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت میں قائم ہوئی۔اس کے احباب کئی مختلف جگہوں پر رہتے تھے۔ایک جماعت منڈی یزمان تھی اور اس سے دوسری طرف ایک چک میں باجوہ خاندان پر مشتمل جماعت تھی۔ یزمان سے کچھ فاصلہ پر چک 92 میں چوہدری صادق علی ججہ صاحب رہتے تھے۔کچھ جماعتیں بہاولنگر کی طرف تحصیل حاصل پور میں تھیں۔ چنانچہ جنوبی جانب کی جماعتوں میں پہلے دورہ کیا اور تعارف اور رابطہ قائم کیا۔ پھر عقیل صاحب کو ساتھ لے کر تحصیل حاصل پور کی جماعتوں کا دورہ کیا۔بعض جگہ تربیتی جلسے بھی کیے۔اس طرح ضلع بہاولپور کی اکثر جماعتوں سے واقفیت ہوگئی۔

دورہ بہاولنگر اور چک نمبر 166 مراد کا ایک واقعہ

دسمبر کے شروع میں ضلع بہاولنگر کی جماعتوں کے دورہ کے لیے گیا۔ پہلے بہاولنگر پہنچا۔ وہاں محترم امیر صاحب ضلع اور دوسرے احباب سے ملا۔وہاں سے واپس چشتیاں آ کر ڈاہرانوالہ گیا۔ ڈاہرانوالہ سے چک 168 مراد بالکل قریب تھا۔ وہاں رانا فیروز خان صاحب برادر اکبر رانا محمد خان صاحب صدر جماعت تھے۔ جماعت

سے متعارف ہوا اور بعض تربیتی امور سے جماعت کو آگاہ کیا۔ دو دن قیام رہا۔

چک 168 مراد سے رہبر ساتھ لے کر ریت کے ٹیلوں اور ٹبوں سے گزرتے ہوئے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر چک نمبر 166 مراد پہنچ گیا۔ صدر صاحب چوہدری لاب دین صاحب خود احمدی ہوئے تھے۔ باقی سب احباب ان کے توسط سے احمدی ہوئے تھے۔ قریباً سارا گاؤں احمدیوں کا ہے۔ سخت سردی تھی۔ دو یوم وہاں تربیتی امور کی طرف احباب کی توجہ مبذول کروائی۔ اگلی جماعت میں جانے کی تیاری کی اور صدر صاحب سے ملاقات کی غرض سے ان کی بیٹھک میں گیا تو فرمانے لگے مربی صاحب! آپ دو ضلعوں کے مربی ہیں میرے لیے تو آپ ہی ڈی سی اور آپ ہی کمشنر ہیں۔ گاؤں میں آٹھ ایکڑ سرکاری زمین نیلام ہوگی اور گاؤں میں تین معتبر تھے جن کے لوگ واسطہ دار تھے۔ کہنے لگے تینوں ہی بولی دینے اور زمین خریدنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میری عرض یہ ہے کہ آپ آج ٹھہر جائیں اور ان سب کو تحریک کریں کہ ہم یہ زمین خرید کر وقف جدید کو دے دیں اور ہمیں کوئی معلم مل جائے تو ہماری آئندہ نسلیں سدھر جائیں گی۔ میں نے وہاں ہی بیگ رکھ دیا اور جانا ملتوی کر دیا۔

مغرب کی نماز میں سب سرکردہ احباب اور دوسرے احباب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو صدر صاحب محترم کی خواہش بتائی اور ان سرکردہ لوگوں کی تعریف بھی کی تو سب نے کہا ہمیں منظور ہے۔ اب جلسہ سالانہ قریب تھا۔ یہ سب احباب جلسہ سالانہ میں شامل ہوتے تھے۔ جلسہ سالانہ آیا اور میں نے حضرت میاں طاہر احمد صاحبؒ سے ان سب کی ملاقات کا وقت لے لیا۔ آپ اس وقت ایک لنگر خانہ کے انچارج تھے۔ ان سب کو لے گیا اور ان سب کے روبرو عرض کیا کہ یہ سب آٹھ ایکڑ زمین گاؤں میں خرید کر وقف کرنا چاہتے ہیں کیا آپ ان کو معلم دے دیں گے۔ فرمایا ہاں۔ واپس جا کر چوہدری محمد شریف صاحب نے جماعت سے کہا کہ میں

دس ہزار روپیہ دے دیتا ہوں آپ زمین مجھے خرید لینے دیں۔ جماعت کے احباب نے تسلیم کرلیا اور دس ہزار روپیہ لے کر وقف جدید کو دے دیا جس پر میاں صاحبؒ بہت خوش تھے۔ کیونکہ 62-1961 میں دس ہزار روپے کی بڑی اہمیت تھی۔

چنانچہ وہاں مرکز کی طرف سے مکرم ڈاکٹر غلام محمد خاں حق صاحب کو معلم وقف جدید متعین کیا گیا جو نہایت دعا گو، متقی اور خدا رسیدہ شخص تھے۔ تیس سال تک وہ اسی جماعت میں رہے اور انہوں نے خواتین کو بھی با جماعت تہجد گزار بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

اوچ شریف

جماعت احمدیہ اوچ شریف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیات طیبہ میں قائم تھی۔ اس میں بہت سے بزرگ لوگ احمدیت میں شامل تھے جن کی اولادوں نے کمزوری دکھائی۔ میں اس جماعت کے دورہ پر گیا تو عبدالحمید صاحب شکرانی کی دوکان پر سب سے پہلے جانا ہوا۔ انہوں نے بطور مہمان نوازی دو آنے کی دو روٹیاں اور سالن لا کر روبرو رکھ دیا۔ میں نے جب اس میں سے ایک نوالہ کھایا تو دن کو تارے نظر آ گئے کیونکہ سرخ مرچ بڑی سخاوت سے ڈالی گئی تھی۔ باقی احباب نے کوئی توجہ نہ کی۔ جماعت کے بعض افراد کی رہائش شہر سے چند میل دوران کی زمین پر تھی۔ چنانچہ بستی چلا گیا۔ احباب سے متعارف ہوا اور ان کی تربیت کے لیے فکرمند بھی۔ بستی طاہر خان اور بستی تاج محمود بھی اس جماعت کا حصہ تھیں۔ کچھ عرصہ بعد عبدالحمید صاحب کی ہمشیرہ بی ٹی کا امتحان دینے کے لے بہاولپور آئیں (اس وقت بی۔ اے بی ٹی کی ڈگری ہوتی تھی) تو میں نے انہیں اپنے ہاں رکھا اور حسب توفیق ان کی بہتر طور پر مہمان نوازی کی۔ اسی طرح جماعت کے ایک فرد حکیم محمد افضل صاحب تشریف لے

آئے تو ان کی بھی خاطر مدارات کی۔اب جبکہ دوبارہ اوچ شریف گیا تو مہمان نوازی کے طور طریقے بکلی بدلے ہوئے تھے۔کوئی پلاؤ لا رہا ہے تو کوئی آم لیے آ رہا ہے۔ میں نے اللہ کا شکرادا کیا کہ اب انہیں بھی سمجھ آ گئی ہے کہ مربی بھی عزت دار مہمان ہوتا ہے۔بڑی جماعت تھی۔کئی جگہوں پر رہائش تھی۔میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر احمدی کو اس کے ہاں جا کر ملا کرتا تھا خواہ کتنی دور بھی ہو۔چنانچہ اس جماعت کے بھی ہر فرد سے ملا خواہ کتنی دور ہی تھا۔اور اکثر پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔

جنوب مشرق کی طرف تحصیل یزمان تھی جس کے ہیڈ کوارٹر کا نام منڈی یزمان تھا۔وہاں بھی احمدی تھے۔یزمان سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک مخلص دوست صادق علی صاحب بجہ رہتے تھے۔ان سے بھی ان کے گاؤں میں ملاقات کی۔اسی طرح عنایت اللہ باجوہ صاحب کے چک بھی گیا جو یزمان سے کئی میل دور تھا۔ایک جماعت ایسی بھی تھی جس میں جانے کا راستہ کچا تھا اور بس کی چھت پر بیٹھ کر سفر کرنا ہوتا تھا۔گرد و غبار اس قدر اڑتا تھا کہ آدمی کی شکل پہچاننا مشکل ہو جاتا۔وہاں بھی گیا۔شمال کی طرف کی جماعتوں میں بھی دورہ کیا۔سب سے رابطہ کیا اور ان کو ضلعی نظام سے منسلک کرنے کی توفیق پائی۔اب گیارہ میں سے سات جماعتیں ضلعی میٹنگ میں آنا شروع ہو گئیں۔امیر صاحب بہت خوش تھے۔یہ پہلے ہی سال کی مساعی تھیں۔

مہمان نوازی کا ایک واقعہ

ایک دفعہ غالباً 1963ء کے موسم بہار میں نظارت امور عامہ نے جماعتوں کو اطلاع دی کہ اگر کسی کو نوکری چاہیے تو وہ بہاولپور چلا جائے۔بہاولپور میں خلیفہ سلیم الدین صاحب انجنیئر تھے جن کو صرف آہنگروں اور ویلڈروں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں شہر سے آیا تو دس بارہ نوجوان جن میں سے بعض کے ساتھ ان کے بزرگ

بھی تھے مشن ہاؤس پہنچے ہوئے تھے۔ میں نے امیر صاحب سے رابطہ کیا تو کہنے لگے وہ لوگ اپنے کھانے کا خود انتظام کریں۔ مہمان مشن ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ اپنے کھانے کے خود ذمہ وار ہیں۔ چنانچہ میں نے دو تین کلو گائے کا گوشت اور سبزی منگوا کر گھر میں سالن پکوایا۔ روٹی کا انتظام یاد نہیں کیسے کیا۔ بہرحال مہمانوں کو کھانا مہیا کیا اور جماعت کے زمیندار مرزا ارشد بیگ صاحب کو کھانا کھلانے کا فرض سونپا اور خود جا کر خلیفہ صاحب سے ملا۔ انہوں نے کہا مجھے تو لوہار اور ویلڈ نگ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ آنے والوں میں سے کوئی بھی یہ کام نہ جانتا تھا۔ جبکہ ضلع نوابشاہ سندھ سے بھی بعض لوگ تشریف لائے تھے۔ چنانچہ یہ سب لوگ واپس چلے گئے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جماعت احمدیہ بہاولپور جو مرکزی جماعت تھی وہاں جماعتی طور پر مہمان نوازی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ بار بھی مربی کو ہی اٹھانا ہوتا تھا۔

عائلی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کے لیے اہلیہ سے معاہدہ

ابھی تک تو ہم بے گھروں والی زندگی گزار رہے تھے۔ اہلیہ میکے اور میں مرکز کے حکم پر کبھی لاہور کبھی ربوہ اور کبھی مظفر گڑھ۔ اب ایک حلقہ میں تقرری کے بعد اہلیہ سے ایک دن کہا کہ میاں بیوی کا جھگڑا اکثر اس بات پر ہوتا ہے کہ بیوی کو شکایت ہوتی ہے کہ مجھے تو کبھی کچھ نہیں دیا نہ جانے کہاں خرچ کرتے ہیں اور کس کو دے آتے ہیں۔ میں اس جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنا سارا الاؤنس لا کر آپ کو دے دوں گا پھر مہینہ کی اخراجات کی آپ ذمہ وار۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مجھے نہیں پوچھنا کہ کیا الاؤنس ملتا ہے اور کہاں خرچ ہوتا ہے۔ گھر کی ضروریات میں انشاءاللہ خود مہیا کروں گا۔ بیوی نے نہایت سمجھدارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہ ضرورت نہیں کہ روزانہ صبح

اٹھ کر پیسے گنوں اور ساتھ یہ بھی شمار کروں کہ مہینہ کے دن کتنے باقی ہیں۔ آپ ہی گھر کی ضروریات کی ذمہ داری اٹھائیں۔

دوسری بات یہ کی کہ میں مربی ہوں اور مربی سے ملنے کے لیے حلقہ کے لوگ آئیں گے۔ پردہ ضروری ہے۔ پردہ کی رعایت سے آنے والے مہمان کو بٹھا کر روٹی پانی جو چیز بھی میسر ہو پیش کریں۔ میں گھر سے باہر ہوں تو بعد میں بتائیں کہ فلاں جگہ گئے ہیں۔ اتنے دن یا اتنی دیر بعد آئیں گے۔ یہ نہ ہو کہ دروازہ بند کر کے کہہ دیں کہ مربی صاحب گھر نہیں اور وہ مہمان واپس چلا جائے۔ یہ دونوں ہی باتیں بیوی نے پلے باندھ لیں اور مجھے خدمت دین کے لیے فارغ کر کے اس قابل بنا دیا کہ میں وقف میں بہتر طور پر زندگی گزار سکا۔

اب بہاولپور میں ایک معلم صاحب کے تبادلہ کے باعث ایک کوارٹر خالی تھا۔ میں نے بیرونجات کے احباب کو کہا کہ اگر آپ کو بہاولپور ٹھہرنے کی ضرورت پیش آئے تو بلاتردد مشن ہاؤس آجائیں۔ اور خالی کوارٹر کو مہمان خانہ بنا دیا۔ ایک چارپائی اور بستر مکرم حکیم عقیل صاحب معلم وقف جدید نے وقف کیا اور ایک چارپائی اور بستر میرے ننھال جو چک 23D-N-B میں زمیندار تھے، انہوں نے دیا۔ اس طرح مہمانوں کے آرام کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کر دیا۔ کھانا میرے ہاں سے دیا جانے لگا۔ مہمانوں کو ہوٹلوں اور سراؤں میں نہ ٹھہرنا پڑا۔

اس وقت کے بعض امیر لوگوں کی سوچ اور اس کو بدلنے کی توفیق

ایک دفعہ صبح صبح مکرم حکیم عقیل صاحب نے اوپر سے نیچے آنے کو کہا۔ دیکھا تو ایک مہمان تھے۔ عقیل صاحب نے تعارف کرایا کہ یہ فلاں چوہدری صاحب ہیں۔ مشن ہاؤس والا یہ پلاٹ ان کے نام ہے۔ علیک سلیک کے بعد چائے وغیرہ کی

پیشکش کی تو ٹھکرا دی۔ آنے کی غرض دریافت کی تو فرمایا کہ معلوم ہوا تھا نئے مربی صاحب آئے ہیں میں نے کہا ان سے مل آؤں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور وہ واپس چل پڑے۔ میں اور عقیل صاحب بھی رخصت کرنے کے لیے ساتھ ہو لیے۔ راستہ میں مَیں نے دریافت کیا کہ آپ کہاں ٹھہرے ہیں تو کہنے لگے کہ شہر میں فلاں جگہ ایک غیر احمدی دوست ہے اس کے ہاں۔ میں نے عرض کیا آپ یہاں ہمارے پاس تشریف لے آتے۔ بڑی حقارت آمیز طرز سے فرمانے لگے۔ تمہارے پاس دو بستریاں ہوتی ہیں۔ تمہاری مثال چمگادڑوں والی ہے کہ ان کے ہاں کوئی مہمان گیا تو انہوں نے کہا کہ ایک شاخ کے ساتھ ہم لٹک رہے ہیں دوسری کے ساتھ تم لٹک جاؤ۔ یہ سن کر میری جو کیفیت ہوئی وہ کوئی صاحب دل ہی جان سکتا ہے۔ خیر واپس آ گئے۔

بہاولپور میں سید دربار علی صاحب قائمقام کمشنر تھے اور یہ مکرم ومحترم صوفی بشارت الرحمٰن صاحب کے گورنمنٹ کالج میں کلاس فیلو رہے تھے۔ کمشنر کے ساتھ چوہدری صاحب کو کوئی کام تھا۔ یہ مرکز سے صوفی بشارت الرحمٰن صاحب کو ساتھ لے گئے۔ مجھے علم ہوا تو میں نے صوفی صاحب محترم، چوہدری صاحب اور امیر صاحب اور شاید کوئی ایک اور بھی تھے جواب یاد نہیں، ان کو صبح ناشتہ پر بلایا۔ میرے پاس کرسیاں میز تو تھے نہیں۔ زمین پر مصلیٰ بچھایا، اوپر گدا ڈال کر سفید چادر اور اس کے اوپر عمدہ سا پلاسٹک کا دسترخوان بچھا دیا۔ چینی کے برتن میرے پاس تھے۔ انڈے فرائی کروائے۔ کچھ حلوہ بھی بنوایا اور ساتھ چائے پیش کر دی۔ بہر حال وقت گزر گیا۔

کچھ عرصہ بعد چوہدری صاحب اپنی جیپ میں چھ سات افراد لے کر کسی کام سے بہاولپور آ گئے اور مشن ہاؤس تشریف لے آئے۔ میں نے ٹھہرنے کو کہا تو کہا کہ آپ انتظام نہیں کر سکیں گے۔ میں نے کہا یہ میرا کام ہے۔ آپ اتریں۔ تھوڑی بہت بحث کے بعد ٹھہر گئے۔ موسم بہار کا قریبا آخر تھا۔ دو مہمان میرے گھر میں پہلے بھی

موجود تھے ان کو چار پائیاں اور بستر دیے۔ عقیل صاحب کے بچے لودھراں عزیزوں کے پاس گئے تھے اس لیے دقت نہ ہوئی۔ میں نے کھانے کا پوچھا کہنے لگے صرف چائے پئیں گے۔ میں نے چائے بنوائی۔ مہمانوں میں ایک صاحب کہنے لگے مجھ سے پیسے لےلو اور دودھ لا دو میں چائے نہیں پیتا۔ اب چوہدری صاحب نے ان کو ڈانٹنا شروع کیا کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ پیسے لےلو اور دودھ لا دو۔ تم واقف زندگی لوگوں کے پاس آئے ہو تم نے دودھ پینا تھا تو جیپ لے جاتے اور بازار سے پی آتے۔ اتنے میں میرا عزیز دودھ لے آیا۔ اب وہ صاحب پئیں نہ اور چوہدری صاحب ان کو کہہ رہے تھے کہ اب تم نے بہرحال یہ پینا ہے۔ تم نے مانگا کیوں تھا۔ خیر رات گزری۔ صبح چوہدری صاحب کہنے لگے کہ دوبارہ آمد پر ایک چار پائی اور بستر یہ صاحب لے آئیں گے اور ایک چار پائی اور بستر میں لے کر آؤں گا۔ اس واقعہ میں بھی مربیان کرام کے لیے کئی سبق ہیں۔ تاہم گھر میں بھی دو مہمان تھے۔ اپنی چار پائیاں ان کو دے دیں اور خود میاں بیوی اور بچوں نے زمین پر بستر بچھا لیا اور رات خیریت سے گزر گئی۔ اب چوہدری صاحب سے دوستی ہوگئی اور جہاں بھی ان سے ملاقات ہوئی ان کو چائے ضرور پلائی۔

جماعتی طور پر مشورہ ہوا کہ بہاولپور اور بہاولنگر کے خدام کا بہاولپور میں اجتماع کیا جائے۔ اس کے لیے بہاولپور کے مشرق میں حمائیتیاں نامی بستی جہاں مکرم مولوی غلام نبی صاحب کا گھر تھا اور ان کے دیگر عزیز بھی تھے، ان کے پاس کشادہ جگہ تھی جو مقام اجتماع کے طور پر استعمال ہوسکتی تھی، تجویز ہوئی۔ اجتماع کے لیے فنڈز کی فراہمی کے لیے چوہدری غلام احمد صاحب سیکرٹری مال کے ساتھ ضلع بہاولنگر کا دورہ کیا۔ جیسے ہی مخالفین کو پتہ چلا انہوں نے جلوس نکالنے شروع کر دیے۔ اخبارات کی شہ سرخیوں میں ہمارے اجتماع اور مخالفین کے بیانات کی اشاعت شروع ہوگئی۔ ہم اجتماع کے

انعقاد کی قائمقام کمشنر سے اجازت لے چکے تھے۔ پولیس نے جلوس پر لاٹھی چارج کیا اور پھر حکماً اجتماع بند کر دیا گیا۔ جبکہ چک نمبر 166 مراد کے احمدی احباب نے بھرپور حاضری سے معاونت کی۔ اجتماع تو نہ ہو سکا مگر جماعت کی تین چار روز خوب تشہیر ہوئی اور اس سے دعوت الی اللہ کے راستے کھلے اور جماعتوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی۔

بعض دلچسپ واقعات

بہاولپور میں فیض اللہ چک نزد قادیان کے ایک دوست ملک عطاء الرحمٰن صاحب محکمہ واپڈا میں ایس۔ڈی۔او تھے۔ ان کے پاس ہر وقت گاڑی ہوتی تھی وہ مجھے بعض اوقات سیر کے لیے بھی لے جاتے تھے اور بعض دیگر پروگراموں میں شمولیت کے لیے گاڑی استعمال کر لیتے تھے۔ بہت تعاون کرنے والے تھے۔ گھر میں نماز باجماعت کا اہتمام کرتے اور خود بھی اور بچوں کو بھی صبح نماز کے بعد تلاوت کرنے کی تاکید کرتے۔ اب مشن ہاؤس میں بجلی نہ تھی۔ ان کے ساتھ تین چار احمدی نوجوان لائن مین تھے۔ انہوں نے انہیں تحریک کی کہ مشن ہاؤس میں بجلی کی وائرنگ کر کے بجلی مہیا کی جائے۔ چنانچہ ان کی کوشش سے مشن ہاؤس میں میٹر لگ گیا اور مشن ہاؤس کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے بجلی مہیا ہو گئی۔

ملک صاحب کا عیسائی بھنگی ایک دن ان کی بیگم کو کہنے لگا صاحب بڑا قرآن پڑھتا رہتا ہے۔ میں اپنے پادری صاحب کو لاؤں کہ صاحب سے گفتگو کرے۔ ملک صاحب نے سن لیا اور کہا کہ ضرور لے کر آؤ۔ چنانچہ ایک دن ایک منادآ گیا اور مجھے بھی بلا لیا گیا۔ مناد ادھر ادھر کی باتیں عیسائیت کے حق میں کرنے لگا۔ ملک صاحب نے اس سے کہا کہ کیا آج دنیا میں کوئی ایسا عیسائی ہے کہ جو کہے اس کا خدا سے تعلق ہے اور اس کا ثبوت بھی دے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کہنے لگا او ہو ایسا کوئی بھی نہیں۔

ملک صاحب نے کہا کہ پھر آپ خود اندھے ہیں تو کسی کو کیا راہ دکھائیں گے۔ مجھ پر مقدمہ تھا میں نے گھر میں دعا کی تحریک کی۔ (اغلباً ملک صاحب کے چار بیٹے تھے ان میں سے ایک کا نام کرشن تھا) کرشن سامنے تھا اس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے کہ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے سلیٹ پر لکھا دیکھا ہے کہ جاؤ بری ہو گئے۔ عدالت گیا تو واقعی میں بری ہو گیا۔ اب ہمارے تو بچوں کے ساتھ بھی خدا تعالیٰ کا تعلق ہے۔ آپ ایک عیسائی بھی پیش نہیں کر سکتے تو پھر عیسائیت کی دنیا کو ضرورت کیا ہے؟ اس پر وہ خاموش ہو کر چلا گیا۔

مولوی قاضی احسان احمد ایک مسجد کا امام تھا لیکن عیسائیوں سے گفتگو کے لیے احمدیوں کو ساتھ لے جاتا تھا۔ ایک دن محترم امیر صاحب کے مکان پر اس سے پوچھا گیا کہ قاضی صاحب سچ بتائیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں کہ فوت ہو گئے؟ تو قاضی صاحب نے یہ جواب دیا

”اگر کسی کمرے کے اندر پوچھو تو فوت ہو گئے ہیں اور اگر باہر میدان میں پوچھو تو زندہ آسمان پر ہیں۔“

اس واقعہ سے احمدی علم کلام کی کس شان سے برتری ثابت ہو رہی ہے۔ صرف دنیاوی حرص و لالچ کی بنا پر مولوی صداقت سے منکر ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ آمین

یہی قاضی صاحب ایک دن معلمین کی دوکان پر آ گئے وہاں لوگ جمع تھے اور وفات و حیات مسیح پر بحث ہو رہی تھی۔ لوگوں نے انہیں کہا تم لوگوں نے ہمیں مصیبت میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ سچ بتاؤ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں کہ زندہ ہیں۔ کہنے لگے۔

”کون کہتا ہے کہ فوت ہو گئے ہیں۔ مجھے تو وہ آسمان پر بیٹھے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن خاتم النبیین انہوں نے ہونا ہے“

یوں لوگوں کو نہایت عمدگی سے بے وقوف بنا گیا۔ اسی طرح ایک دن مغرب کی

نماز سے قبل خاکسار اور مرزا ارشد بیگ صاحب بازار میں ایک مولوی محمد حیات صاحب کے بیٹوں کی دکان پر کچھ ادویہ لے رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہو گیا کسی احمدی کا گھر قریب نہ تھا۔ سوچا کہ اگر ہم نے نماز نہ پڑھی تو یہ لوگ کہیں گے احمدی نماز بروقت ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ ساتھ ہی ایک مسجد میں جا کر وضو کیا۔ جماعت ہو رہی تھی اور آخری رکعت تھی۔ میں نے اپنی علیحدہ نماز شروع کر دی۔ مرزا ارشد بیگ صاحب بہت معروف احمدی تھے۔ جیسے ہی سلام پھیرا ایک نمازی کہنے لگا مرزائیوں کا کیا کام ہے مسلمانوں کی مسجد میں۔ اور یہی قاضی احسان ان کا امام تھا۔ کہنے لگا ان کو نہیں آنا چاہیے۔ دوسرا کہنے لگا اب کیا ہوگا۔ تیسرے نے کہا تمہیں مسجد کو دھونا پڑے گا۔ مرزا ارشد بیگ صاحب نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عیسائیوں کو بھی اجازت دے دی تھی۔ کہنے لگے عیسائیوں کو اجازت دی جاسکتی ہے، ہندوؤں کو اجازت دی جاسکتی ہے، مرزائیوں کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ایک شریف آدمی کہنے لگا آپ آرام سے تشریف لے جائیں جی۔ اور زیادہ شور شرابہ سے پہلے پہلے ہم وہاں سے نکل گئے۔ مزے کی بات ہے کہ منافق مولوی بھی نمازیوں کی حمایت کر رہا تھا۔

مولوی محمد حیات جس کے بیٹوں کی دوکان سے دوائی لیتے ہوئے ہم غیر احمدیوں کی مسجد میں چلے گئے تھے، بہاولپور کی شاہی مسجد کا خطیب تھا۔ جماعت کے سخت خلاف تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو گالیاں دیتا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آیا تو فالج ہوا اور زبان بند ہوگئی۔ کچھ احمدی دوست عیادت کے لیے گئے تو دعا کے لیے ملتجی ہوا لیکن خدا کی تقدیر جاری ہو چکی تھی۔

مخلصین بہاولپور میں محترم امیر صاحب بابو عزیز محمد خان صاحب غلام احمد صاحب محکمہ نہر میں ملازم تھے۔ حاجی احمد بخش صاحب صراف کے احمدی ہونے کے باعث کاروباری لوگوں نے ان کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔

مولوی غلام نبی صاحب ایاز یہ اس سیشن جج اکبر کی عدالت میں ملازم تھے جنہوں نے مقدمہ بہاولپور کی سماعت کر کے جماعت کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے احمدیت قبول کر لی اور پھر ان کے کئی رشتہ داروں نے بھی احمدیت قبول کی۔ غلام احمد صاحب کے بھائی مبارک احمد صاحب اور چند اور احباب تھے جن کے نام اب یاد نہیں۔ محترم امیر صاحب کا میرے ساتھ نہایت احترام اور محبت کا سلوک تھا۔ بہاولپور رہتے ہوئے پونے دو سال کا عرصہ ہوا تھا کہ میں نے مرکز سے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست کی۔ چھٹی منظور کرنے کے ساتھ ہی کہا کہ چھٹی گزارنے کے بعد آپ امیر صاحب ضلع نوابشاہ کو رپورٹ کریں۔ آپ کا تبادلہ بہاولپور سے ضلع نوابشاہ اور خیر پور کی جماعتوں کی تربیت کے لیے نوابشاہ کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ کہہ کر رخصت کینسل کروالی کہ اب پہلے نئے حلقہ کا چارج لوں گا اور اگر ضرورت ہوئی تو رخصت لے لوں گا۔ محترم امیر صاحب کے پاس بھی مرکز کا خط پہنچا۔ انہوں نے مرکز لکھا کہ میرے خیال میں انہیں پانچ سال تک یہاں رہنا چاہیے تھا تا کہ ان کا عمدہ کام ضلع میں جاری رہ سکے۔ اللہ تعالیٰ امیر صاحب مرحوم کے درجات بلند کرے۔ میں تو نوابشاہ چلا گیا مگر محترم امیر صاحب نے زندگی بھر مجھ سے تعلق قائم رکھا۔ ہر سال جلسہ سالانہ پر بیٹے کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر میری قیام گاہ پر مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میں اب تک ان کی بلندی درجات کے لیے دعا کی توفیق پا رہا ہوں۔

معلم رشید طیب صاحب تو تبدیل ہو چکے تھے۔ عقیل صاحب کے ساتھ زندگی بھر تعلق قائم رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں مدرسۃ الظفر میں قلیل عرصہ اکٹھے بھی رہے۔ رشید طیب صاحب سے جرمنی میں ملاقات ہوئی تھی۔

بہاولپور سے نوابشاہ تبادلہ

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ میں نے اگست 1964ء میں مرکز سے ایک ماہ کی رخصت کے لیے درخواست کی۔ رخصت کے ساتھ ہی میرا تبادلہ نوابشاہ سندھ کر دیا گیا اور وہاں سے مولوی محمد دین صاحب کا تبادلہ بہاولپور کر دیا گیا۔ کیونکہ ان کی اہلیہ صاحبہ بیمار تھیں اور انہیں ہسپتال والی جگہ رہائش درکار تھی۔ چنانچہ میں بلا اطلاع خیبر میل سے باندھی کے لیے روانہ ہوا۔ خیبر میل کا سٹاپ پڈعیدن جنکشن پر تھا۔ وہاں سے نواب شاہ کے لیے پسنجر چلتی تھی۔ چنانچہ پڈعیدن سے گاڑی تبدیل کر کے صبح باندھی پہنچ گیا۔ لیکن کسی کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ سٹیشن پر یونہی انتظار میں بیٹھ رہا کیونکہ بستر وغیرہ میرے پاس تھا۔

میں سٹیشن پر سامان کے پاس بیٹھا تھا۔ پگڑی پہن رکھی تھی۔ اتفاق سے ایک احمدی نوجوان اقبال حیدر یوسفی ادھر آنکلا۔ وہ پہچان گیا کہ مربی صاحب بیٹھے ہیں۔ اس نے باندھی جا کر محمد اسلم صاحب دوکاندار اور صدر صاحب جماعت باندھی کو بتایا۔ وہ آکے میرا سامان لے گئے اور میں اونٹ پر سوار ہو کر حاجی صاحب کی بستی جسے مقامی زبان میں گوٹھ کہتے ہیں چلا گیا۔ حاجی صاحب کے ڈیرہ پر جسے لوکل زبان میں اوطاق کہتے ہیں، پہنچا۔

محترم حاجی صاحب بڑے تپاک سے گلے ملے۔ سید علی اکبر شاہ صاحب جو کسی وقت پولیس مین تھے۔ خود احمدی ہوئے تھے۔ حاجی صاحب کی طرح لمبے تڑنگے موٹے تازے خوبصورت جوان تھے اور بہت نیک اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ حاجی صاحب کے مینیجر اور اکاؤنٹنٹ بھی تھے۔ خیر فوراً نوکر نے دوسرے کمرے میں چارپائی بستر تیار کر کے وہاں چلنے کی فرمائش کی۔ وہاں جا کر

آرام کیا تھوڑی دیر میں ناشتہ آ گیا۔ ناشتہ کیا۔ ایک دو روز اکیلا رہا۔ پھر بچے لانے کے لیے کرونڈی گیا۔ وہاں سے بچوں کو لے کر باندھی آ گیا اور ہمیں بہت بڑا قلعہ نما مکان ملا جو حاجی صاحب کے بھائی مکرم رئیس عبدالستار صاحب کا تھا۔ اس کا صحن کم از کم دو کنال پر مشتمل تھا۔ دیواریں پندرہ پندرہ سولہ سولہ فٹ بلند تھیں۔ کچھ دن تو کھانا حاجی صاحب کے ہاں سے آیا پھر ہم نے خود پکانے کا انتظام کر لیا۔ تاہم حاجی صاحب ہمیشہ تعاون کرتے رہے۔ محترم حاجی صاحب میرے سسرال والوں کے بھی محسن تھے۔ اس احسان کی تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔ انشاءاللہ

آپ چونکہ امیر ضلع تھے اس لیے مربی اور انسپکٹر کا ہیڈ کوارٹر بھی یہیں ہوتا تھا۔ میرے جانے سے قبل قاضی خورشید الرب صاحب سارے سکھر ڈویژن کے لیے انسپکٹر بیت المال کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ جیسے ہی میں پہنچا جماعت احمدیہ قمر آباد جو نسبتاً ایک نئی جماعت تھی وہاں خدام الاحمدیہ کے اجتماع کی تیاری ہو رہی تھی۔ پہنچنے کے اگلے روز مکرم قائد صاحب ضلع سیٹھ محمد یوسف صاحب کا کارڈ ملا کہ کل نواب شاہ میں ضلعی مجلس خدام الاحمدیہ کی میٹنگ ہے براہ کرم اس میں تشریف لائیں۔ چنانچہ قائد مقامی کے ہمراہ نوابشاہ پہنچ کر میٹنگ میں شامل ہوا۔

ضلع کے سارے معتبر خدام سے ملاقات ہوگئی۔ مکرم سیٹھ یوسف صاحب کو بہت مخلص، سمجھ بوجھ والا اور خلوص سے جماعتی خدمت کرنے والا پایا۔ ان سے نہایت پرخلوص محبانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ واپس آ کر لوکل جماعت کے احباب سے متعارف ہوا۔ محترم قاضی خورشید الرب صاحب انسپکٹر بیت المال ہونے کے علاوہ بھی عمدہ جماعتی کارکردگی کے حامل تھے۔ اکثر جماعت کے افراد سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ محترم حاجی صاحب کی بھی ایک طرح سے چابی تھے۔ یعنی ان کو جماعتی کاموں کے لیے متحرک کرتے تھے۔ میں نے حلقہ کی جماعتوں سے رابطہ اور آگاہی کے لیے

محترم امیر صاحب سے درخواست کی تو فرمانے لگے قاضی صاحب کے ساتھ دورہ کا پروگرام بنالیا کریں۔ یہاں خدام الاحمدیہ کے اجتماع اور جماعتی جلسہ میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ احباب جماعت بھرپور شرکت کرتے تھے۔ قمر آباد کے اجتماع میں علماء کرام میں سے مولانا غلام احمد صاحب فرخ، مولانا مہاشہ محمد عمر صاحب اور مولانا عبدالمالک صاحب شریک تھے۔ باندھی سے قمر آباد قریبا چودہ میل تھا۔ سٹیشن سے آگے قمر آباد تک محترم حاجی صاحب نے ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس طرف سے شاملین کو لانے اور لے جانے کے لیے ٹریکٹر ٹرالی استعمال کی گئی۔

طالب آباد اور نذیر احمد برق

باندھی سے قمر آباد جائیں تو راستہ میں طالب آباد چوہدری طالب دین صاحب گجر کی گوٹھ تھی۔ یہاں نذیر احمد برق رہتا تھا جس نے جماعت میں ملہم من اللہ اور خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ابتداءً اس نے قادیان میں دعا گو پارٹی بنائی تھی۔ پھر یہ مرکز کی سندھ فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اسے جماعت سے نکال دیا گیا۔ بہرحال اس کے چند معتقد پیدا ہو گئے۔ متفنّی قسم کا آدمی تھا۔ چوہدری طالب دین، ڈاکٹر نثار، صوفی شریف، جان محمد اس کے مرید تھے۔ یہ خود گڈ سٹیشن کے قریب جنڈاں والا کا رہنے والا تھا۔ یہاں اس کی برادری آباد ہے لیکن برادری کے چند افراد کے سوا اسے کسی نے قبول نہیں کیا۔ البتہ طالب دین اور ڈاکٹر نثار پر اس کا جادو خوب چلا ہوا تھا۔ لیکن چوہدری طالب دین کی بیوی بیٹیاں اور بیٹے اس پر کوئی یقین نہیں کرتے تھے۔ اس کے اکثر الہامات یہی ہوتے تھے کہ فلاں کی لڑکی سے میرا عرش پر نکاح ہو گیا ہے اس لیے مجھے وہ لڑکی ملنی چاہیے۔ یہی بات اس نے چوہدری طالب دین صاحب کی صاحبزادی کے متعلق کہی تو چوہدری صاحب یہ خوشخبری لے کر گھر گئے۔ جیسے ہی بات

کی ماں بیٹیوں نے برق کو سخت برا بھلا کہا۔اور ماں نے کہا میں ہرگز اپنی بیٹی کی اس سے شادی نہ کروں گی۔ چوہدری طالب دین صاحب کے پانچ بیٹے تھے۔ایک ناصر الدین سب سے بڑا تھا۔باقی چار مختلف کلاسوں میں نوابشاہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔باپ ان کو کہتا کہ اگر تم نے مولوی صاحب کو نہ مانا تو تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔لیکن لڑکے اس پر ہرگز یقین نہ رکھتے تھے اور احمدیت اور خلافت پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا مضبوط رابطہ تھا۔میں نے ان کے مسئلے کا مرکز سے حل دریافت کیا تو بتایا گیا کہ ان سب کی جو احمدی ہیں ایک بار پھر بیعت خلافت کرا دو۔چنانچہ سب نے بیعت فارم پر کر دیے اور میں نے مرکز ارسال کر دیے۔آہستہ آہستہ سب کی شادیاں احمدیوں میں ہو گئیں اور تین لڑکے محمد، غالب اور راغب بڑے بڑے دنیاوی عہدوں پر پہنچے۔انہوں نے مولوی کو ماننے کی حماقت نہیں کی اور خلافت کی اطاعت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی و دنیوی نعماء اور حسنات سے مالا مال کر دیا۔

برق کی کہانی تو قدرے لمبی ہے۔مزید کچھ معلومات رقم کر دیتا ہوں کیونکہ اب اس کو اور کوئی بیان کر سکنے والا شاید باقی نہ ہو۔آہستہ آہستہ متعدد لوگ تو بیعت خلافت کر کے سلسلہ سے منسلک ہو گئے۔لیکن طالب دین، ڈاکٹر نثار اور اس کے بیٹے، صوفی شریف اور جان محمد اس کے مرید رہ گئے۔ جان محمد کی پہلی بیوی فوت ہو گئی تو اس کی شادی صوفی شریف کی لڑکی رفیعہ سے ہو گئی۔رفیعہ کی ماں جنت بی بی، صوفی شریف کی بیوی تھی اس نے بھی خلافت کی بیعت کر لی۔رفیعہ نے بھی خلافت کی بیعت کر لی۔ جان محمد کے ہاں رفیعہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تو برق صاحب کہنے لگا کہ یہ میری لونڈی ہو گی۔ جان محمد نے تسلیم کیا۔ جب یہ لڑکی جوان ہوئی تو اس نے بھی بیعت خلافت کر لی اور اس کی شادی جان محمد کی برادری کے ایک نوجوان محمد اسلم سے ہو گئی۔ میں اس کی شادی میں شمولیت کے لیے ربوہ سے باندھی گیا۔ جان محمد کے بیٹوں نے

بھی بیعت خلافت کر لی ہوئی تھی۔ بچی کی شادی میں مَیں شامل تھا۔ جان محمد کو میں نے کہا کہ بھئی اب تمہاری (روحانی ماں) ہم بیاہ کر لے گئے ہیں۔اس پر شرمندہ ہو گیا۔ صوفی شریف کی بیوی جنت بی بی بیمار تھی۔صوفی آیا کہ اسے لے جائے۔ وہ نہایت کمزور تھی۔ کہنے لگی میں احمدی ہوں اور میرا جنازہ صرف احمدی پڑھیں۔ یہ صوفی وغیرہ میرے جنازے کو ہاتھ بھی نہ لگائیں۔ چنانچہ جنازہ صرف احمدی احباب نے پڑھا۔ اور معلوم ہوا ہے کہ برق نے ڈاکٹر نثار کے جس بیٹے محمد رفیع کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا وہ بھی فوت ہو گیا ہے۔ جان محمد بھی فوت ہو گیا۔ روحانیت کے اس موسم بہار میں یہ خود رو بیل اور اس کی ساری شاخیں سوکھ کر گردشِ زمانہ کا ایندھن بن کر ختم ہو گئیں اور شجرہ طیبہ ہر لمحہ دنیا بھر میں تازہ بہ تازہ پھل دے رہا ہے۔ خلافت احمدیہ کے ذریعہ اس کی آبیاری اس کو مزید سر سبز اور مضبوط اور بلند سے بلند ترین کرتی جا رہی ہے۔

حلقہ کی جماعتیں

محترم امیر صاحب سے جماعتوں کے تعارف اور راستوں کے متعلق رہنمائی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ قاضی صاحب کے ساتھ دورہ پر چلے جایا کریں۔ قاضی صاحب انسپکٹر مال آمد تھے۔ بڑے جسیم، خوش خور، شوگر کے مریض اور خوبصورت باتیں نیز دعائیں کرنے والے وجود مشہور تھے۔ ان سے دورہ کا پروگرام بنانے کی درخواست کی تو کسی جماعت میں مچھر کی بہتات کسی میں راستہ میں کتوں کی موجودگی اور کسی دوسری جماعت میں جانے کے لیے اور مشکل بتا دی۔ میں نے سوچا کہ اس طرح تو کسی جماعت کا دورہ ممکن نہیں ہو گا۔ چنانچہ میں نے ان سے جماعتوں کی فہرست اور قدرے راستہ کی تفصیل لی اور فیصلہ کیا کہ اکیلا ہی حلقہ میں دورہ کروں گا۔ ابتدا میں دونوں ضلعوں کی چونتیس جماعتیں حلقۂ تربیت میں تھیں۔ ضلع نوابشاہ کی

جماعتیں درج ذیل ہیں۔

۱۔رحمان آباد۔ جہاں مربی اور انسپکٹر صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

۲۔باندھی۔قریب ہی قصبہ میں الگ جماعت قائم تھی۔

۳۔دیہہ ماہ کھنڈ

۴۔گوٹھ سردار محمد

۵۔قمر آباد۔1950 اور 1960ء کی دہائی میں یہ جماعت قائم ہوئی۔

۶۔مورو۔ یہاں بھی اس وقت تین چار سندھی احباب پر مشتمل جماعت قائم تھی۔

۷۔گوٹھ دادن خاں چانڈیو۔ یہ مورو سے مٹھّیانی ریلوے سٹیشن کے قریب سندھی احباب پر مشتمل جماعت تھی۔

۸۔کنڈیارو۔ یہاں ایک مہاجر احمدی گھرانے پر مشتمل جماعت تھی۔کنڈیارو سے کچھ فاصلہ پر دریائے سندھ کے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت سے جماعت قائم ہے۔جس کا نام ماہی جو بھان ہے۔

۹۔ماہی جو بھان۔ یہاں دو (رفقاء) حضرت مسیح موعود علیہ السلام تھے۔ان میں سے ایک فوت ہو چکے تھے اور میری تقرری کے وقت حضرت ماسٹر محمد پریل صاحب والد بزرگوار مولانا بشارت احمد صاحب بشیر بقید حیات تھے۔ان کے علاوہ بھی احباب موجود تھے۔

۱۰۔محراب پور۔ یہ بھی چار احمدی احباب پر مشتمل جماعت تھی۔ان میں سے کسی بھی جگہ پہنچنا مشکل نہ تھا۔

۱۱۔محراب پور سے نواب شاہ کو آتے ہوئے لاکھا روڈ سٹیشن سے مشرق کی طرف جماعت احمدیہ مہدی آباد مہاجرین پر مشتمل جماعت تھی۔

۱۲۔مہدی آباد سے قریب ہی جماعت گوٹھ مولوی عبدالسلام تھی۔

۱۳۔ گوٹھ عبدالسلام کے قریب ہی گوٹھ عبدالرحیم تھی۔

۱۴۔اس سے قریب تھوڑے فاصلے پر گوٹھ علی محمد تھی۔ چوہدری علی محمد قادیان کے قریب تلونڈی جھنگلاں کے رہنے والے تھے۔

۱۵۔ گوٹھ علی محمد سے تین چار میل کے فاصلہ پر جماعت احمدیہ کرونڈی ہے۔ کرونڈی ریلوے سٹیشن سے قریبا آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔

۱۶۔ لاکھا روڈ سے بذریعہ ریل نواب شاہ کی طرف سفر کریں تو بھریا روڈ چوہدری عبدالرزاق شہید مرحوم اوران کے بھائی ڈاکٹر ارشاد صاحب کے افراد خاندان پر مشتمل جماعت تھی۔

۱۷۔ پڈعیدن سٹیشن سے دو تین میل مغرب میں گوٹھ شاہ دین جماعت قائم تھی۔

۱۸۔ اگلے سٹیشن کوٹ لالو سے تین چار میل شمال مشرق میں جماعت احمدیہ جماپور ہے۔

۱۹۔ اورجنوب مغرب میں گوٹھ امام بخش کے احباب پر مشتمل جماعت قائم ہے۔

۲۰۔ باندھی سے نواب شاہ جاتے ہوئے راستہ میں دوڑ جو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا وہاں بھی جماعت تھی۔

۲۱۔ دوڑ سے شمال مشرق میں گوٹھ رسول بخش جماعت قائم تھی۔

۲۲۔ نواب شاہ سے قومی شاہراہ کی طرف جائیں تو سکرنڈ سے تین میل کے فاصلہ پر دیہہ نمبر 21 دود میں اٹھوال ضلع گورداسپور کے احباب پر مشتمل جماعت تھی۔ اسی طرح اس سے آگے مین روڈ پر قاضی احمد کی جماعت تھی۔

۲۳۔ محراب پور سے سکھر کی طرف سفر کریں تو رانی پور سٹیشن سے قریبا چار میل کے فاصلہ پر جماعت احمدیہ گوٹھ غلام محمد کے احباب رہائش پذیر تھے۔

۲۴۔ ان سے مغرب کی طرف صوبوڈیرو ایک پرانی جماعت تھی۔

۲۵۔ گمبٹ کے قریب تین جماعتیں گوٹھ نتھے خان، گوٹھ فتح دین اور گوٹھ سلطان علی واقع تھیں۔ اس کے علاوہ ٹھری میرواہ کے پاس ایک جماعت دیہہ مروڑہ کے نام سے قائم تھی اور جماعت احمدیہ گوٹھ رحمت علی بھی تھی۔

بہاولپور سنٹر میں جانے سے قبل اس وجہ سے فکرمندی تھی کہ مجھ سے پہلے مربی صاحب وہاں سے کسی شکایت پر تبدیل کیے گئے تھے۔ لیکن میرے تبادلہ پر محترم امیر صاحب نے نظارت اصلاح وارشاد کو لکھا کہ میرے خیال میں ان کو مزید پانچ سال بہاولپور میں رکھنا چاہیے۔ دوسری طرف نواب شاہ والوں نے مرکز کو لکھا کہ اب کوئی ایسا مربی دیں جو یہاں ٹک کر کام کرے۔ کیونکہ اس سے پہلے مولانا غلام احمد فرخ صاحب کے تبادلہ کے بعد تین چار مربیان تشریف لائے لیکن جلد چلے گئے۔ اس پر مرکز نے نوابشاہ والوں کو لکھا کہ اب آپ کو ایسا مربی دے رہے ہیں جس سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ حلقہ میں مشہور تھا کہ جو باندھی جاتا ہے وہاں ہی بندھ جاتا ہے۔ یعنی حلقہ میں نہیں نکلتا اور دورہ نہیں کرتا۔ میرے سامنے یہ چیلنج موجود تھا۔ چنانچہ میں نے از خود اکیلے دورہ جات کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اکثر جماعتوں کے ساتھ رابطہ کرلیا۔ واقفیت بھی ہوگئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں نے سال بھر میں بعض جماعتوں کا متعدد بار دورہ کرلیا۔ اور جہاں بھی کوئی احمدی رہتا تھا جس طرح بھی بن پڑا وہاں اس سے رابطہ کیا۔

مزید برآں یہ کہ مالی سال کے آخر میں محترم امیر صاحب بذات خود، انسپکٹر صاحب مال اور مربی اور اس کے علاوہ بھی جیپ میں ایک آدھ اور فرد کو ہمراہ لے کر چندہ جات کی وصولی کے لیے ہر جماعت میں جاتے اور وصولی کرتے۔ اگر کوئی جماعت چندہ کی ادائیگی نہ کرتی لیکن کھانا یا چائے وغیرہ پیش کرتی تو اس کا کھانا اور چائے بھی قبول نہ کرتے۔ بلکہ خود بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی کسی ہوٹل سے کھانا کھلا

دیتے۔ بہرحال ایک، دو یا تین بار تک بھی وصولی کے لیے احباب جماعت کے پاس جانا پڑتا تو تشریف لے جاتے۔ ان کی مساعی کے باعث ضلع نوابشاہ چھ سال تک سارے مغربی پاکستان میں وصولی چندہ کے لحاظ سے اول آتا رہا۔ اس دورہ سے بھی مجھے جماعتوں سے آگاہی ہوگئی۔

سندھی زبان سیکھنے کی طرف توجہ ہونا

قمر آباد کی جماعت چانڈیو قوم کے احباب پر مشتمل تھی اور ایک دوست ڈاکٹر (ہومیو) فقیر محمد صاحب میمن بھی یہاں کلینک چلا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت کامیابی سے نوازا تھا۔ ان سب کی زبان سندھی تھی۔ ایک دفعہ میں اور محترم قاضی صاحب انسپکٹر مال وہاں دورے پر گئے تو قاضی صاحب ان سے سندھی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ قاضی صاحب کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں اور میرے ساتھ اجنبیت محسوس کر رہے ہیں۔ میں نے اس کی وجہ زبان نہ جاننا ہی قرار دیا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔

چنانچہ میں نے سندھی زبان بولنا شروع کر دی۔ ابتدا میں تو بہت غلطیاں بھی ہوتی تھیں لیکن آخر کسی حد تک بولنے میں کامیاب ہوگیا اور بہت حد تک اجنبیت دور ہوگئی۔ آہستہ آہستہ روانی سے زبان بولنا شروع کر دی اور بعد میں سندھی زبان میں تقاریر بھی کیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت حد تک سندھی زبان کا لہجہ اختیار کرنے کی توفیق دے دی۔ پھر تو اس قدر مہارت ہوگئی کہ ایک دفعہ میں اردو میں تقریر کر رہا تھا کہ درمیان میں مجھے کہا گیا کہ سندھی میں تقریر کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس میں بھی بہت حد تک کامیاب کر دیا۔ محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب میرے سندھی بولنے کو پسند کرتے تھے جبکہ ان کے ساتھ ہمیشہ میں نے اردو میں ہی بات کی۔

برادرم سیٹھ محمد یوسف صاحب

برادرم سیٹھ محمد یوسف صاحب چاول کا کاروبار کرتے تھے اور باندھی کے دکانداروں کو بھی تھوک کے حساب سے چاول سپلائی کرتے تھے۔ وہ صبح کی گاڑی سے پہلے میرے پاس آ گئے پھر مجھے بھی ساتھ باندھی لے گئے۔ اتنے میں جنگ 1965ء شروع ہونے کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ دوپہر کو پڈعیدن سے نوابشاہ تک ایک ٹرین چلتی تھی وہ اچانک بند ہو گئی۔ یوسف صاحب کو بھی رکنا پڑا۔ جنگ کے ابتداء میں ہی لوگوں کا جوش و جذبہ اور اتحاد دیدنی تھا۔ کسی بھی دکاندار نے زیادہ منافع کے لالچ میں کوئی بھی چیز سٹاک نہیں کی۔ اس دن ہم دونوں نے کافی وقت اکٹھے گزارا۔ یوسف صاحب تھوڑے ہی عرصہ میں میرے ساتھ بے حد مانوس ہو گئے اور خدام الاحمدیہ کے کام میں میرے مشورے کو اہمیت دینے لگے۔

غلط فہمی کے ازالہ کا ایک طریق

نواب شاہ میں ایک بزرگ قاری حافظ فتح محمد صاحب مکرم سیٹھ محمد یوسف صاحب اور سیٹھ محمد اسحٰق صاحب وغیرہ کے پاس رہتے تھے اور ان اور دیگر احباب کے بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے تھے ان سے حاجی صاحب کے مخالف خاندان کے بڑے حاجی صاحب کے خلاف باتیں کرتے رہتے تھے اور حافظ صاحب ان باتوں سے متاثر تھے۔ میں ایک رات نوابشاہ محترم حافظ صاحب کے پاس ٹھہرا تو وہ مجھ سے حاجی صاحب کے خلاف باتیں کرنے لگے جو انہوں نے سن رکھی تھیں۔ میں نہایت خاموشی اور توجہ سے ان کی باتیں سن کر جی ہاں جی ہاں کرتا رہا۔ جب بات ختم کی تو میں نے عرض کیا حافظ صاحب آپ بزرگ ہیں آپ نے ایک طرف کی باتیں سنی ہیں میں

حاجی صاحب کو تیار کرتا ہوں کہ آپ ان کی باتیں بھی سنیں اور پھر فیصلہ کریں۔ حافظ صاحب مان گئے۔ ان کو رحمان آباد حاجی صاحب کے پاس لے آیا۔ رات کو انہوں نے حاجی صاحب کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی۔ نتیجۃً کہنے لگے اس میں تو سارا قصور ہی دوسرے فریق کا ہے۔ اس پر واپس نوابشاہ جا کر وہاں سے پنجاب چلے گئے۔

نوابشاہ میں حضرت مرزا ناصر احمد صاحبؒ کی تشریف آوری

خلافت کے بارِ گراں سے قبل حضرت میاں صاحب نے جو آخری سفر بحیثیت صدر انصار اللہ کیا اس میں انصار اللہ ضلع نوابشاہ کے اجتماع میں آپ کی تشریف آوری بھی شامل ہے۔ حضرت صدر صاحب کا بابرکت قیام اس مکان میں تھا جس میں عام طور پر اس خاکسار کی رہائش تھی۔ دیگر احباب کے علاوہ ڈاکٹر کرنل ضیاء الحسن صاحب بھی آپ کے ہمسفر تھے۔ اور مہمان نوازی کے لیے کھانا پکانے کی ڈیوٹی خاکسار کی اہلیہ کی تھی۔ جس سے ہمارے لیے بہت سی برکات کا حصول ممکن ہوا۔ ایک بیعت فارم آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو فرمایا مربی صاحب کو دے دو۔ برادرم سیٹھ محمد یوسف صاحب مرحوم اجتماعات کے انتظام کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے۔ اگرچہ اخراجات بنیادی طور پر حاجی صاحب ہی اٹھاتے تھے لیکن سیٹھ یوسف صاحب شہید مرحوم بھی اس بارے میں بڑے فراخ دل تھے۔

خصوصی مہمانوں کی سپیشل چائے جس میں قہوہ، دودھ، چینی الگ الگ پیش کیے جاتے ہیں یہ بھی خصوصی طور مکرم سیٹھ محمد یوسف صاحب کی فرمائش پر خاکسار کی اہلیہ کے ہی ذمہ ہوتا تھا۔ احباب جماعت بھی بھرپور شرکت کرتے تھے اور مہمانوں کی خدمت میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی۔ گوشت کا سالن یا پلاؤ اکثر مہمانوں کے کھانے میں شامل ہوتا تھا اور حاجی صاحب پلاؤ کی دیگ میں آٹھ دس کلو سے کم

گوشت نہیں ڈلواتے تھے۔ایک بار میں نے عرض کیا کہ اتنا گوشت زیادہ ہے تو کہنے لگے کہ اگر گوشت کم ہوگا تو احباب کو چاولوں میں بوٹی تلاش کرنی پڑے گی۔کھانا بھی بافراط پکواتے کہ کم نہ پڑے۔بچ جائے گا تو کھانے والے بہت ہیں۔

ایک مخلص احمدی چوہدری سلطان علی صاحب کی وفات

میں مہدی آباد نزد لاکھا روڈ جماعت کے دورہ پر تھا تو معلوم ہوا چوہدری سلطان علی صاحب محراب پور میں سخت بیمار ہیں۔ میں مہدی آباد سے اگلے روز محراب پور چلا گیا۔ چوہدری صاحب واقعۃً زیادہ بیمار تھے۔ یہ خود احمدی ہوئے تھے اوران کے دو بیٹے مکرم فلک شیر صاحب اور مکرم عبدالحمید صاحب تھے۔عبدالحمید صاحب احمدی تھے اور فلک شیر صاحب احمدی نہیں تھے لیکن مخالفت بھی نہیں کرتے تھے۔شہر سے باہر قریب ہی ان کی زمین تھی۔ میں نے عبدالحمید صاحب کواس طرح تنہا پا کر وہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ شام کو چوہدری صاحب محترم کی وفات ہوگئی۔

شہر کے غیر احمدی سخت مخالفت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ ہم ان کو قبرستان میں اس شرط پر دفن ہونے دیں گے کہ یہ جنازہ ہمارے حوالے کر دیا جائے ہم جنازہ پڑھیں احمدی اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔جبکہ یہاں وفات کے وقت کل چار احمدی موجود تھے۔میں نے جب غیر احمدیوں کا مطالبہ سنا تو فوراً نوابشاہ فون کیا کہ صبح کی گاڑی سے زیادہ سے زیادہ احباب محراب پور پہنچ جائیں۔ادھر لائن کے قریب قریب جماعتوں مثلاً بھریا روڈ، مہدی آباد، گوٹھ عبدالسلام، گوٹھ علی محمد، کرونڈی، کنڈیارو تک اطلاع کر دی گئی۔ چنانچہ صبح صبح ایک پسنجر ٹرین نوابشاہ سے روہڑی تک جاتی تھی جیسے ہی وہ آئی سٹیشن پر احمدی ہی احمدی نظر آنے لگے۔ دوسری طرف فلک شیر نے کہا کہ میرا باپ احمدی تھا اس کا جنازہ بھی احمدی ہی پڑھیں گے جس نے پڑھنا ہے پڑھے جس نے

نہیں پڑھنا اس کی مرضی ہے، میں تو پڑھوں گا۔ چنانچہ احمدی احباب نے پہلے جنازہ پڑھا پھر ایک غیر از جماعت سٹیشن ماسٹر تھا اس نے امامت کرائی اور متعدد غیر احمدیوں نے جنازہ پڑھا۔ تدفین کے لیے لے گئے تو قبر اپنی زمین میں تیار کرائی۔ تدفین سے پہلے حضرت صوفی محمد رفیع صاحب (رفیق) حضرت مسیح موعود علیہ السلام تشریف لے آئے اور بعض اور احمدی بھی۔ چنانچہ تیسری بار چوہدری صاحب کا جنازہ پڑھا گیا۔

حضرت مصلح موعود کا انتقال اور انتخاب خلافت ثالثہ

چوہدری صاحب کی تدفین کے بعد واپس ان کی حویلی میں تھے کہ محترم سیٹھ محمد یوسف صاحب حویلی سے باہر ایک ہوٹل پر گئے واپس آئے تو ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ مجھے بڑی مشکل سے بتایا کہ ہوٹل کے ریڈیو پر یہ اعلان ہوا ہے

''اندرون و بیرون پاکستان جماعتوں کی آگاہی کے لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ امام جماعت احمدیہ کی حالت تشویشناک طور پر خراب ہے۔''

میں نے کہا کہ پھر میں تو ابھی ربوہ جاتا ہوں۔ دیکھا تو جیب میں صرف پندرہ روپے تھے۔ ایک دوست سے پچاس روپے لیے۔ میرے ساتھ مکرم ڈاکٹر فضل کریم صاحب ساکن فیصل آباد جو عبدالحمید صاحب ابن مکرم چوہدری سلطان علی صاحب کے سسر تھے وہ بھی تیار ہو گئے۔ چنانچہ اسی وقت شاہین نامی ٹرین آنے والی تھی اس میں انٹر کلاس میں جگہ مل گئی۔

خانیوال میں حضور کی وفات کی خبر ریڈیو پر سنی کہ رات دو بج کر بیس منٹ پر وفات ہو گئی ہے۔ ربوہ پہنچے۔ انتہائی طور پر غم اور افسردگی کی کیفیت تھی۔ کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے حضور کی زیارت کی۔ اب سارے مغربی پاکستان سے احباب دھڑا دھڑ ربوہ پہنچنے شروع ہو گئے۔ سندھ سے بہت سے احباب تشریف لے آئے۔ اب ایک

طرف تو زیادہ سے زیادہ احباب کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ دوسری طرف یہ سوچ کہ اب اللہ تعالیٰ کس کو مسندِ خلافت پر فائز کرتا ہے۔ تمام حاضرین ربوہ سراپا دعا بنے ہوئے تھے۔ بعض دور جنگل میں جا کر بھی دعا میں مصروف تھے۔ حضور کی وفات سات اور آٹھ نومبر کی درمیانی شب کو ہوئی اور آٹھ تاریخ کو عشاء کے وقت انتخاب خلافت ہوا۔ انتخاب سے قبل میرے خسر مرحوم، میں اور عزیزم مسعود احمد رہان تینوں ہمشیرہ کی بیٹھک میں (فضل عمر ہسپتال کے پاس جونیئر کوارٹر میں) سراپا انتظار تھے کہ عزیزم مسعود احمد نے کہا مجھے پتہ ہے خلیفہ کس نے ہونا ہے۔ میں نے کہا بتاؤ کہنے لگا گناہ نہ ہو۔ میں نے کہا پہلے خلیفہ کی زندگی میں گناہ ہوتا ہے وفات کے بعد نہیں۔ اس پر انہوں نے اپنے ایک خواب کی بنیاد پر جو انہوں نے حضرت مصلح موعود کی وفات سے چھ ماہ قبل دیکھا تھا حلفیہ طور پر بتایا کہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب اور مرزا رفیع احمد صاحب کا نام پیش ہونا ہے اور حضرت مرزا ناصر احمد صاحب نے خلیفہ ہونا ہے۔ ابھی اس نے بات ختم کی تھی کہ مولانا ابوالعطاء صاحب کی (بیت) سے آواز آئی کہ مجلس انتخاب نے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو خلیفۃ المسیح منتخب کیا ہے۔ اس پر ہم تینوں جلد جلد مسجد مبارک پہنچے اور بیعت خلافت کی۔ اللہ اللہ بارِ خلافت بھی عجیب چیز ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کس قدر تبدیل کر دیتا ہے۔ خلیفہ کس قدر شفیق اور محبت کرنے والے انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زندگی کا یہ حیران کن تجربہ پہلی ہی بار تو ہوا تھا۔

اس صدمۂ جانکاہ اور مژدۂ جانفزا کی کیفیت سے سرشار واپس سندھ چلا گیا۔ ایک دن خیال آیا کہ حضرت مصلح موعود کے حکم سے طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب تکمیل تعلیم کے بعد آیا تو حضور علیل تھے حضور کی خدمت میں رپورٹ نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے اب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی خدمت میں رپورٹ پیش کی جانی چاہیے۔ چنانچہ حصول تعلیم سے متعلق تفصیل لکھ کر حضور سے رہنمائی کی عاجزانہ درخواست کی۔

حضور نے اس پر تحریر فرمایا کہ

''مربی ہیں۔مربی کا کام کریں۔''

اس پر مجھے اطمینان ہوگیا اور میں اپنے کام میں محو ہوگیا۔اگست ستمبر 1964ء میں مَیں اس حلقہ میں آیا تھا۔ایک سال کے اندر اندر اللہ کے فضل سے جماعتوں کے ساتھ رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔دوستوں کی طرف سے بھی بھرپور تعاون مل رہا تھا۔

جماعت احمدیہ دیہہ مروڑہ

یہ جماعت ضلع خیرپور کی تحصیل ٹھری میرواہ سے کچھ فاصلہ پر تھی۔یہاں دورہ پر آیا تو یہ احباب 1947ء میں پہلے گمبٹ گوٹھ نتھے خان سے کچھ فاصلہ پر تھے۔وہاں سے یہاں ڈی کلاس زمین خرید کر منتقل ہوگئے۔ان میں ایک نوجوان محمد رفیق ولد محمد صدیق پہلے قادیان میں رہتا تھا اب براستہ مشرقی پاکستان یہاں آگیا۔یہ مولوی فاضل تھا۔جب میں یہاں پہنچا تو یہ بیلوں کے ساتھ زمین ہموار کرنے کے لیے بلیڈ مار کر آیا تھا۔سارا منہ سر مٹی سے بھرا ہوا تھا۔مجھے دیکھ کر دکھ ہوا کہ عالم دین ہے اور اس طرح مٹی چاٹ رہا ہے۔چنانچہ وہاں سے واپسی پر میں بھریا روڈ آیا۔یہاں برادرم چوہدری عبدالرزاق شہید مرحوم اور ان کے بھائی کا گھرانہ تھا۔اچھے آسودہ حال تھے۔ان سے عرض کیا کہ ایسا فرد ہے اسے کوئی صاف ستھرا کام دیا جائے۔عبدالرزاق نے کہا ہمیں تو بچوں کی تعلیم کے لیے بڑی ضرورت ہے۔اسے بلا کر ان کے پاس ملازم کروایا۔اس طرح وہ باوقار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکا۔

بعدازاں اس کا دوسرا چچازاد بھائی نور محمد جو کہ مٹھائی بنانے کا ہنر جانتا تھا،کو بھی باندھی شہر میں ایک دوکان پر ملازم کرایا۔آہستہ آہستہ خاندان کے دوسرے نوجوان بھی وہاں سے نکل کر مختلف ہنرمندوں کے پاس ملازم ہوکر ہنرمند ہوگئے۔نور محمد نے بھی

باندھی میں آئس کریم بنا کر فروخت کرنا شروع کر دی اور گزر اوقات بہتر ہوگئی۔ رفیق نے ارشاد صاحب سے بھریا روڈ میں ٹیکے وغیرہ لگانے سیکھ لیے تھے اور اب وہ بھی ڈاکٹر بن گئے مگر کامیاب نہ ہو سکے اس پر ان کو کراچی مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کو کہہ کر مقامی معلم لگوا دیا۔ وہاں اس نے شادی بھی کر لی اور مکان بھی خرید لیا۔ اب اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ نور محمد بھی کراچی جماعت کی خدمت کر رہا ہے۔ اس طرح ایک خاندان کو باعزت زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے کی توفیق ملی۔

محترم حاجی صاحب کا ڈرائیور محمد سومر کلہوڑو حاجی صاحب کی مہربانی سے باندھی یونین کا چیئر مین بن گیا۔ داؤد احمد نے میٹرک پاس کیا ہوا تھا۔ نواب شاہ میں ایک افسر تعلیم کلہوڑو صاحب آیا۔ تو میں نے سومر کو کہا کہ دیکھو داؤد غریب آدمی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی آگاہ ہوں۔ اس کا بازو ہاتھ میں لو۔ اس نے بازو پکڑا تو میں نے کہا کہ اس کو سکول ٹیچر لگوا دو لیکن رشوت اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ سومر کو جزائے خیر دے اس نے داؤد کی بطور ٹیچر تقرری کرا دی۔ یہ مخلص احمدی نوجوان تھا۔ غریب احمدی گھرانے کا فرد تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور میری تھوڑی سی کوشش سے اس نوجوان کا مستقبل سنور گیا۔ الحمدللہ

جماعت احمدیہ قمر آباد

حلقہ کی اکثر جماعتوں سے رابطہ اور واقفیت ہوگئی تھی۔ قمر آباد نسبتاً نئی قائم ہونے والی جماعت تھی۔ جس کے احباب کچھ سندھی اور کچھ پنجابی بولتے تھے۔ رمضان آیا تو میں نے یہاں درس القرآن کی منظوری لے لی اور یہاں نماز فجر کے بعد قرآن مجید کا درس دینا شروع کر دیا۔ جماعت کے تمام افراد بمع خواتین پردہ کی مکمل رعایت کے ساتھ مہینہ بھر درس میں شامل ہوتی رہیں۔ عید کی نماز کھلے میدان میں پڑھنے اور

مستورات کے لیے باپردہ انتظام کیا گیا۔ ادھر امیر صاحب نے آدھی رات کو جیپ بھیج دی کہ عید ہیڈ کوارٹر آ کر کریں۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی۔

جماعت احمدیہ قمر آباد نمازوں، چندوں، جماعتی اجلاسات اور دیگر تمام جماعتی تقریبات میں بفضل اللہ تعالیٰ بہت مستعد تھی۔ درس نے ان کی کارکردگی کو اور بہتر کر دیا۔ یہ جماعت سنٹر سے قریباً چودہ میل کے فاصلہ پر تھی۔ قریباً ہر ماہ ہی یہاں کا سائیکل پر دورہ کر لیتا تھا۔ پروگرام میں تسلسل قائم رہتا۔ احباب بھی بہت خوش رہتے۔ میری نوابشاہ میں تبدیلی کے وقت یہاں سے دو نوجوان زندگی وقف کر کے مرکز میں زیر تعلیم تھے اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مزید تین یا چار نوجوان شاہد کر چکے ہیں اور خدمات بجا لا رہے ہیں۔ عبدالقدیر صاحب چانڈیو مرحوم بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ کبھی سارے صوبہ سندھ میں صرف حضرت مولانا غلام احمد صاحب فرخ سندھی بولنے والے مربی سلسلہ تھے۔ بعد ازاں میں نے سندھی زبان بولنا سیکھی اور اب صرف سکھر ڈویژن میں کئی لوکل سندھی نوجوان شاہد کر کے میدان عمل میں ہیں۔ اس سے سندھی احباب کے اخلاص کی شہادت ملتی ہے۔ لاڑکانہ کی طرف تو بعض سندھی احباب راہِ مولا میں قربان بھی ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ورثاء کی حفاظت فرمائے اور ان کو دین و دنیا کی حسنات سے نوازے۔ آمین۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے ان احباب کی فہرست جو راہِ مولا میں قربان ہوئے، کتاب ہٰذا میں دوسری جگہ موجود ہے۔

جماعت احمدیہ دیہہ ماہ کھنڈ

یہاں گوکھووال کی ارائیں برادری کے متعدد خاندان زمین خرید کر رہائش پذیر ہیں۔ یہاں ایک شادی پر نکاح پڑھانے گیا ہوا تھا۔ احمدی بچے اور غیر از جماعت احباب بھی جمع تھے۔ احمدی بچوں کو کہا کہ کلمہ سناؤ۔ انہوں نے معروف کلمہ سنایا۔ میں

نے کہا احمدیوں والا سناؤ۔انہوں نے پھروہی کلمہ پڑھا۔اس پر میں نے غیر احمدی احباب کومخاطب کر کے کہا کہ اگر ہمارا کلمہ اور ہوتا تو ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ سکھاتے۔ ہمارا نہ قرآن الگ ہے نہ نماز الگ ہے نہ کلمہ الگ ہے۔آپ کے مولوی صاحبان آپ لوگوں کو بھڑ کانے کے لیے ایسا کہتے ہیں۔اس پر وہ لوگ کافی مطمئن ہوئے۔

ایک شیعہ مولوی فاضل سے گفتگو

ایک دفعہ باندھی قصبہ میں پانچ سات احباب سے دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہاں ایک شیعہ مولوی فاضل آ گئے۔ان کے والد بھی ساتھ تھے۔ آتے ہی مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے۔آپ مولوی فاضل ہیں؟ میں نے کہا بھئی امتحان تو دیا تھا۔ پاس بھی ہو گیا تھا۔مگر اب پتہ نہیں کچھ آتا ہے کہ نہیں۔ کہنے لگے یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یا خارج از ذات۔میں نے کہا کہ میرے نزدیک اللہ ایک ہے اور تمام صفات حسنہ کا مالک ہے۔نہ اس کی ذات میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی شریک ہے وبس۔ کہنے لگے تم مولوی فاضل ہی نہیں۔ یہ تو مولوی فاضل کے نصاب کا پہلا مسئلہ ہے۔میں نے نرمی سے عرض کیا شاہ صاحب آپ کا اس سے مقصد کیا ہے۔تفصیل بتا دیں۔کہنے لگے یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں یا خارج از ذات۔ میں نے عرض کیا کہ اگر عین ذات مانیں تو کیا فائدہ یا نقصان اور خارج از ذات مانیں تو کیا فائدہ یا نقصان؟ فرمانے لگے اگر صفات کو خارج از ذات مانیں تو سوچنا پڑے گا کہ خدا پہلے تھا یا صفات اور اگر یہ مانیں کہ عین ذات ہیں تو پھر یہ سوچنا نہیں پڑے گا کہ خدا پہلے تھا یا صفات؟ میں نے عرض کیا کہ درست کہا ہے۔ کہنے لگے کہ اللہ کی صفات عین ذات ہیں۔میں نے عرض کیا کہ عین ذات ماننے کا فائدہ کیا ہوگا؟ کہنے لگے اگر عقیدہ صحیح ہو

تو اعمال درست صادر ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا شاہ صاحب! اللہ بھی موجود ہے اور اس کی صفات بھی موجود ہیں۔ آپ کو یہ تسلیم ہے؟ کہنے لگے ہاں۔ میں نے کہا جب خدا موجود ہے۔ صفات کا ظہور بھی ہو رہا ہے تو اگر کوئی شخص مرغی کا انڈہ لے کر سوچنا شروع کر دے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈہ پہلے تھا تو اس کو ذہنی عیاشی کے علاوہ بھلا کچھ کہا جا سکتا ہے؟

اب آپ مولوی فاضل، آپ سچی توحید کے علمبردار، آپ کا عقیدہ صحیح اور عمل بھی۔ قاعدہ کی بات ہے کہ عمل درست ہو تو نتیجہ درست نکلتا ہے۔ آپ فرمائیں آپ پر اس عقیدہ کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ کہنے لگے نتیجہ قیامت کو نکلے گا۔ میں نے عرض کیا شاہ صاحب آپ سائنس کی صدی میں رہتے ہیں۔ کسی سائنسدان کو کہیں کہ تو مسلمان ہو جا تیرا نتیجہ قیامت کو نکلے گا تو کیا وہ یہ بات قبول کر لے گا؟ نہیں وہ مطالبہ کرے گا کہ مجھے سائنسی تجربات کی طرح ثابت کر کے بتاؤ کہ مسلمان ہونے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

دوسری عرض یہ ہے کہ رسم دنیا بھی یہی بتاتی ہے کہ نتیجہ یہاں نکلتا ہے جیسے ایک کسان گھر سے من بھر گندم اٹھا کر ایک ایکڑ زمین میں دانہ دانہ بکھیر دیتا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ موسم ٹھیک ہے عمل درست ہے۔ ایک من کے نتیجہ میں کئی کئی من حاصل ہو گا۔ اگر اسے معلوم ہو کہ کچھ بھی نہیں ہو گا تو وہ من بھر گندم ضائع نہیں کرے گا۔ نیز شریعت تو کہتی ہے کہ نتیجہ یہاں نکلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نماز برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ کیا اگر کوئی شخص نماز پڑھ کر برائی اور بے حیائی کرے تو اس نے صحیح نماز پڑھی۔ کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا اگر وہ صحیح نماز پڑھے گا تو برائی کرے گا۔ کہنے لگے نہیں۔ میں نے کہا شریعت کے مطابق بھی نتیجہ یہاں نکلنا ثابت ہو گیا۔ اب آپ بتائیں آپ پر کیا نتیجہ نکلا۔ وہ تو خاموش رہے ان کے والد صاحب فرمانے لگے۔ ہم لوہا گرم کر کے منہ میں ڈال لیں تو

ہمارا منہ نہیں جلتا۔ میں نے کہا واہ سچی توحید اور اس کا نتیجہ۔ چلو سامنے لوہار کی دوکان ہے۔ پیسے میں دوں گا آپ سرخ لوہا منہ میں ڈال کر دکھا دیں۔ اس پر پہلو بدل لیا۔ باپ سمجھ گیا کہ میں اس کے اس کرتب سے بھی واقف ہوں۔ چنانچہ خاموش ہو گیا اور باقی احباب جو سنی تھے بہت متاثر ہوئے۔ خفت مٹانے کے لیے مزید سوال کیا کہ کیا آدم علیہ السلام نے گناہ کیا تھا۔ میں نے کہا قرآن مجید کہتا کہ ہرگز گناہ نہیں کیا تھا۔ اور ساتھ ہی گناہ کی تعریف بھی بتا دی۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا

کہ بھول گیا ارادہ شامل نہیں تھا۔ پس گناہ وہ ہے جو ارادتاً کیا جائے۔ غیر ارادی فعل کو بھول یا غلطی کہتے ہیں۔ اس پر پھر سوال کیا کہ

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا

میں اسماء سے کیا مراد ہے؟ میں نے کہا شاہ صاحب سوال کرنے کی دو اغراض ہوتی ہیں۔ ایک تو علم حاصل کرنا دوسرے امتحان لینا۔ آپ کا سوال کس نوعیت کا ہے۔ کہنے لگے علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پھر میرے پاس آنا وہاں متعلقہ مقام نکال کر غور کریں گے۔ اس پر خاموش ہو گیا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

ایک پادری صاحب سے گفتگو

ایک بار ریل میں سفر کر رہا تھا کہ ایک سٹیشن پر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس کلے پر پگڑی ایک بزرگ سیرت ریل میں سوار ہوا۔ میں نے اپنے پاس جگہ دی۔ اور تھوڑی دیر بعد پوچھا کہ مولوی صاحب ہم تو پڑھتے پڑھتے مر گئے ہیں، امام مہدی علیہ السلام کب آئیں گے۔ کہنے لگے آپ نے مجھے مولوی سمجھا میں تو عیسائی پادری ہوں۔ مجھے جو اسلام کے متعلق آتا ہے عرض کرتا ہوں۔ میں نے کہا فرمائیے۔ کہنے لگا کہ قرآن

مجید میں لکھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے۔اب مسلمانوں کی ہدایت کے لیے عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے۔میں نے کہا کہ پادری صاحب کیا الیاس جو آسمانوں پر گئے تھے اور مسیح سے پہلے انہوں نے آنا تھا وہ آ گئے؟ فورا کہنے لگا آپ قادیانی ہیں۔آپ مرزائی ہیں۔آپ کو بائبل پڑھائی جاتی ہے۔آپ کے ساتھ بات نہیں کرنی۔ بہت کوشش کی لیکن آمادہ نہ ہوا۔

دعا کی قبولیت پر ایک مسافر سے گفتگو

ایک دفعہ ایک بس میں سفر کر رہا تھا۔ایک مسافر کسی بات پر کہنے لگا وہ وقت اب گیا جب دعائیں قبول ہوتی تھیں۔اب دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔میں نہ رہ سکا اور کہا یہ نہ کہیں دعائیں قبول نہیں ہوتیں یہ کہیں کہ ہم اس قابل نہیں کہ ہماری دعا قبول ہو۔ اس پر یہ کہنے لگا کہ آپ کی بات اچھی لگی ہے آپ یہاں قریب آ جائیں۔میں اٹھ کر اس کے پاس والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی کہا کہ ابھی آپ کو میری باتیں اچھی لگ رہی ہیں جب آپ کو پتہ چلا کہ میں احمدی ہوں تو آپ کو میری باتیں بری لگیں گی۔ کہنے لگا آپ کو مرزائی ہو کر کیا ملا؟ کوئی زمین مل گئی یا شادی ہو گئی یا کوئی اور جائیداد مل گئی؟ میں نے کہا یہ چیزیں تو میں پا کر حقارت سے ٹھکرا چکا ہوں۔میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہوئی ہے۔مجھے وہ ملا جس کا آپ کہہ رہے تھے کہ اب نہیں ملتا یعنی قبولیت دعا کی نعمت اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کی ہے۔اس پر وہ خاموش ہو گیا۔

خلافت ثالثہ کی ابتدائی تحریکات پر عمل

خلافت ثالثہ کے آغاز میں تسبیح و تحمید، درود شریف اور بعض اور دعائیں بکثرت پڑھنے کی تحریک ہوئی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خود بھی اور جماعتوں میں بھی اس

پر عمل پیرا ہونے کی بھرپور تحریک کی اور اس پر عمل بھی ہوا۔

تحریک فضل عمر فاؤنڈیشن میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے سولہ صد روپے لکھوانے کی توفیق ملی اور وہ ادائیگی بھی کر دی گئی۔ اس وقت الاؤنس تو اغلباً سو روپے یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ حضورؒ افریقہ سے کراچی تشریف لائے تو خاکسار استقبال کرنے والوں میں شامل تھا۔ احمدیہ ہال میں حضور نے جیسے ہی **نصرت جہاں فنڈ** کے قیام کی تحریک فرمائی اللہ تعالیٰ نے وہیں وعدہ کرنے والوں میں شمولیت کی توفیق عطا فرمائی اور پانچ صد روپے کا وعدہ پیش کیا۔ جو بعد میں ادا بھی کر دیا۔ الفضل میں چھپنے والی پہلی فہرست وعدہ جات میں خاکسار کا نام موجود ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے معانقہ کا شرف

جب حضور رحمہ اللہ تعالیٰ افریقہ کے دورہ سے واپس کراچی تشریف لائے تو کراچی ایئرپورٹ پر استقبال کرنے والوں میں یہ عاجز بھی موجود تھا۔ وہاں مولوی محمد دین صاحب ساکن ڈیرہ غازی خان غالباً اس وقت میر پور خاص میں مربی سلسلہ تھے وہ بھی موجود تھے۔ لاؤنج میں حضور کی تشریف آوری پر انہوں نے بھی معانقہ کیا اور مجھے بھی معانقہ کی سعادت ملی۔

وقف میں بعض مشکلات

جب بیوی کے ساتھ آباد ہونے اور گھر بنانے کی ابتداء ہوئی تو نہ سسرال سے کچھ ملا اور نہ میکے والوں نے گھر سے کچھ دیا۔ اس لیے ابھی گھریلو زندگی میں بہت مختصر سامان تھا۔ باندھی پہنچا تو بہت وسیع مکان اور خوبصورت نواڑ سے بنے پلنگ رہائشی مکان میں موجود تھے جن سے استفادہ کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد مالک نے پلنگ

منگوا لیے تو محترم حاجی صاحب کے اوطاق (ڈیرے) کی دو چارپائیاں منگوا لیں۔ میں دورہ پر تھا کہ ان چارپائیوں کی بھی باہر ضرورت پڑ گئی اور باہر منگوا لی گئیں۔ اہلیہ نے باہر سے چارپائیاں منگوانا مناسب نہ سمجھا اور اپنی چارپائی پر بچوں کو سلا کر خود زمین پر بستر کر کے سو رہی۔ دورہ سے واپسی پر مجھے علم ہوا تو میں نے کہا کہ اب اپنی چارپائیاں بنوا کر ہی چارپائی پر سوئیں گے۔ چنانچہ دو روز دونوں میاں بیوی زمین پر ہی سوتے رہے اور تیسرے دن دو چارپائیوں کا انتظام کر لیا۔ دوسری طرف یوسف صاحب کو علم ہوا تو وہ ایک چارپائی کی چوکھٹ کا سامان اور دو چارپائیوں کے بُننے کا بان لے کر پہنچ گئے۔ حاجی صاحب کے علم میں یہ بات نہیں تھی۔ چنانچہ تین چارپائیاں بنوا لیں۔ سندھ میں چارپائیوں کی چوکھٹیں بہت وزنی بنائی جاتی تھیں جن کو اٹھانا مشکل تھا۔ چنانچہ میں جب بھی پنجاب آتا یہاں سے ایک دو چارپائیوں کا سامان لے جاتا۔ اس طرح پھر نہ تو حاجی صاحب کے ہاں سے چارپائی منگوانی پڑی اور نہ کسی اور سے مانگنی پڑی۔ وقف میں اس طرح کی آزمائش بھی اس وقت آتی تھی۔ اب تو اللہ تعالیٰ نے بہت بہتر انتظام فرما دیے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

ایک نئی مشکل یہ پیش آ گئی کہ محترم حاجی صاحب کا گاؤں وہاں کی عام سطح زمین سے کافی نیچے تھا کیونکہ وہاں زیرِ زمین پانی اچھا تھا لیکن اب نہروں کی لیکج کا پانی بڑی تیزی سے سطح زمین پر آ رہا تھا جس سے گاؤں کے اکثر مکان خطرے سے خالی نہ تھے۔ یہ مکان جس میں میری رہائش تھی اس کی دیواریں بھی بڑی وزنی تھیں۔ چنانچہ ایک دن مکان کی پچھلی دیوار زمین میں دھنس گئی اور چھت کا کافی حصہ زمین پر آ رہا۔ ہمارے لیے کوئی متبادل مکان نہ تھا۔ البتہ بنایا جا رہا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہمیں مکان کے باورچی خانہ میں جو بالکل چھوٹا سا تھا رہنا پڑا جس میں بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا۔ بالآخر دو کمروں، برآمدہ اور باورچی خانہ پر مشتمل ایک کچا مکان تیار ہو گیا۔ چنانچہ

اس میں منتقل ہو گئے۔ یاد رہے کہ اُس وقت وہاں بجلی مہیا نہ تھی۔ گرمی میں ہاتھ کے پنکھے ہی استعمال ہوتے تھے۔ گرمی میں بچوں کے لیے بڑی مشکل پیش آتی۔

محمود ہال نوابشاہ کا مسئلہ

نوابشاہ میں ایک مکان سیٹھ محمد یوسف صاحب اور محمد اسحٰق صاحب کے اشتراک سے جماعتی مقاصد کے لیے خریدا گیا تھا۔ شرط یہ تھی کہ آدھا حصہ محمد اسحٰق صاحب وغیرہ کا ہوگا اور آدھا حصہ یہ جماعت کو دیں گے۔ فی الوقت یہ مکان محمد اسحٰق صاحب وغیرہ کے گودام کے طور پر مستعمل تھا۔ جس جگہ میں کمرے بنے ہوئے تھے وہ جماعت کی اور دوسری طرف ان سیٹھ برادران کی تھی۔ اب بنے ہوئے کمرے نہایت خستہ حالت میں تھے۔ کسی بھی وقت گر سکتے تھے اور کوئی نامناسب واقعہ بھی پیش آ سکتا تھا۔ میں نے یوسف صاحب کو مشورہ دیا کہ مجلس عاملہ سے منظوری لے کر اسے گرا دو۔ منظوری دے دی گئی اور گرا بھی دیا گیا۔ لیکن اب تعمیر میں ساتھ دینے کو کوئی تیار نہ تھا۔ یوسف صاحب اکیلے مشکل میں پھنس گئے۔ چنانچہ میرے پاس اس وقت کوئی تین ہزار روپیہ تھا اور میں اس وقت ربوہ میں مکان بنوانا چاہتا تھا۔ کہنے لگے پیسے مجھے بھیج دو آپ کا مکان بعد میں بنوائیں گے ورنہ اس جگہ پر مخالفین قبضہ کر سکتے ہیں۔ حاجی صاحب کی مالی پوزیشن بھی اس وقت زمین کے سیم تھور ہونے کی وجہ سے خراب تھی۔ یوسف صاحب خود بھی دوکان سے زیادہ پیسہ نہیں نکال سکتے تھے کیونکہ بھائی کے ساتھ اشتراک تھا۔ چنانچہ انہوں نے تن تنہا ملبہ اٹھوا کر دیواروں کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے وہ پیسے بغیر پرواہ کیے کہ ملیں گے یا نہیں ان کو بھیج دیے۔ انہوں نے کچھ حصہ پر چھت ڈال دی اور نماز باجماعت کی ادائیگی اور نماز جمعہ یہاں شروع کروادی۔ وگرنہ شہر میں جماعت کے پاس کوئی جماعتی جگہ نہیں تھی۔ الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسے حقیر

کو چند سال میں اس قابل بنا دیا کہ جماعتی ورثہ کی حفاظت میں مدد کر سکوں۔

میرا کوہ مری تبادلہ

اکتوبر 1967ء میں میرا تبادلہ نوابشاہ سے کوہ مری کر دیا گیا۔ ادھر اہلیہ بیمار تھی۔ بہر حال راولپنڈی پہنچا۔ وہاں مکرم و محترم مولانا محمد شفیع صاحب اشرف جو بعد میں ناظر امور عامہ بھی رہے، مربی تھے۔ ان سے اچھی شناسائی تھی۔ میں نے گھبراہٹ کا اظہار کیا تو انہوں نے نہایت خوبصورتی سے میری ہمت بندھائی۔ مری میں اب سیزن (سیر و سیاحت کا موسم) تو ختم ہو چکا تھا۔ لوگ واپس جا چکے تھے۔ البتہ فوجی اور کوٹھیوں کے چوکیدار موجود تھے۔ آہستہ آہستہ بعض لوگوں سے رابطہ کیا۔ نزدیک ہی چوکیدار محمد اسحاق ایک کوٹھی کی نگرانی پر مامور بچوں سمیت رہتا تھا اس سے تعارف ہوا تو اس سے کافی تعاون ملا۔ میں اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ ابتداء میں مٹی کا تیل سٹوو میں استعمال کر کے کھانا پکاتا تھا۔ دن بھر دور دور تک گھومتا۔ عیسائی سکول مری میں تھے۔ وہ سڑکوں پر ہوتے تو انہیں (دین حق) کے متعلق پمفلٹ دیتا۔ بچے باندھی میں ہی تھے۔ محترم سید اکبر علی شاہ صاحب جو حاجی صاحب کے مینیجر تھے ان سے خط و کتابت کے ذریعہ صورت حال سے باخبر رہتا۔ محترم حاجی صاحب بھی بچوں کا خیال رکھتے۔

مری میں کوئی مقامی احمدی نہ تھا۔ البتہ چند فوجی احباب اور ایک سکول ٹیچر پر مشتمل جماعت تھی۔ میجر اعجاز ربانی صاحب اس وقت صدر جماعت تھے۔ کیپٹن دلدار احمد صاحب جو بعد میں فوراً میجر ہو گئے۔ کیپٹن نصیر احمد صاحب یہ غزنوی خاندان میاں نیک محمد خان صاحب کے داماد تھے۔ اسی طرح ملتان سے ایک لیفٹنٹ مدثر صاحب ممبران جماعت تھے۔ چندہ کا حساب کتاب مربی کو ہی رکھنا پڑتا تھا۔ اب سیزن تو گزر چکا تھا۔ جمعہ کے دن بعض اوقات کلڈنہ کی احمدیہ (بیت الذکر) جو کسی

وقت خان غلام محمد خان آف گلگت نے بنوائی تھی اس میں پڑھ لیتے تھے۔ سردی کا موسم تھا اکثر برف باری ہوتی رہتی تھی۔ اسحٰق چوکیدار اور اس کی فیملی نے میری بڑی مدد کی۔ ایک دن سخت برف باری ہو رہی تھی کہ اس کی بیٹی زبیدہ نے جو نو دس برس کے قریب عمر کی تھی، مجھے دودھ لا کر دیا۔ دن بھر لکڑی جلا کر آگ تاپنا ہوتی تھی۔ یا پتھر کا کوئلہ دستیاب ہو تو بہت کام آتا تھا۔ اس کے لیے مخصوص قسم کی انگیٹھی استعمال کرنا پڑتی تھی۔ جس کے ساتھ لمبا نلکا لگا کر کمرہ کے شیشہ سے باہر نکال دیا جاتا کہ پتھر کے کوئلہ کا دھواں اور گیس کمرے میں نہ بھرے۔

جس سال میں مری تھا سیزن میں 33 فٹ برف پڑی تھی۔ میری چھت اور مکان کے اردگرد برف ہی برف تھی۔ جس کو بیلچہ سے ہٹانا پڑتا تھا۔ سردیاں گزرنے پر میں نے جناب ناظر صاحب کی خدمت میں درخواست کی کہ مجھے چار صد روپیہ پیشگی دی جائے تاکہ سامان اور بچے باندھی سے مری منتقل کر سکوں۔ جواب ملا کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ استاذی المکرّم محترم قاضی محمد نذیر صاحب ناظر اصلاح و ارشاد تھے۔ عرض کیا کہ پھر کیا کروں تو فرمایا سامان سسرال کے ہاں رکھ دو۔ آپ جانتے تھے کہ باندی سے قریب کرونڈی میں میرے سسرال ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ سامان وہاں رکھوں تو خود کیا استعمال کروں۔ فرمایا بہرحال اتنے پیسے نہیں دے سکتے میں بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن اس وقت سلسلہ کی مالی حالت کا اس سے ضرور اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور آج جو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس کا اندازہ کر کے ایمان میں کس قدر تازگی پیدا ہوتی ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

گرمی کے موسم کی ابتداء ہو رہی تھی۔ مشن ہاؤس کے قریب ریشم کے کیڑوں کی پرورش کا دفتر تھا۔ ان کے ایک بزرگ کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسہ میں صدر جلسہ بنایا اور خود میں نے تقریر کی۔ نیز اس دفتر کے اکثر احباب کو کھانسی کی

شکایت تھی۔ میں باندھی سے ایک دوائی بنا کر ساتھ لے گیا تھا۔ ان کو وہ دوائی دی تو کھانسی کو بہت آرام آیا۔ جس کو بھی دوائی دی اسے آرام آ گیا۔ اس طرح ان کے ساتھ تعلقات قائم ہو گئے۔ اب آہستہ آہستہ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ مری کی رونق لوٹ رہی تھی۔ خیر میں بھی دن بھر لٹریچر لے کر تقسیم کرتا رہا۔ عیسائی پادری سے رابطہ کیا لیکن اس نے بات چیت سے انکار کر دیا۔

مری سے واپس نوابشاہ تبادلہ

اسی اثناء میں معلوم ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ گھوڑا گلی کے ریسٹ ہاؤس میں کچھ دن کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ چنانچہ محترم امیر صاحب چوہدری احمد جان صاحب نے مجھے بھی انتظامات میں شریک کیا۔ حضور کے آنے سے دو روز قبل پنڈی سے مری اور مری سے پنڈی متعدد بار جانا پڑا۔ مجھے شدید سر درد تھا۔ مولانا محمد شفیع اشرف صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کو بلڈ پریشر تو نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں۔ کہنے لگے تمہارا چہرہ بہت سرخ ہے اس لیے ضرور چیک کرواؤ۔ چنانچہ اگلے روز سی۔ ایم۔ ایچ کے ڈاکٹر کیپٹن خالد صاحب سے بلڈ پریشر چیک کروایا تو بہت بڑھا ہوا تھا۔ حضور تشریف لا چکے تھے۔ حضور کا استقبال بھی کیا جا چکا تھا۔ دو روز بعد ملاقات کے لیے گیا تو حضور باہر تشریف نہ لائے تھے۔ میں نے ایک میاں صاحب سے عرض کیا کہ حضور کی خدمت میں دعا کے لیے عرض کریں کہ اسکا بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے۔ جیسے ہی حضور رحمہ اللہ کے علم میں یہ بات آئی آپ نے پرائیویٹ سیکرٹری چوہدری ظہور احمد باجوہ صاحب سے فرمایا کہ مرکز کو لکھو اس کو فوراً پہاڑ سے نیچے تبدیل کر دو۔ میں اگلے دن پھر حاضر ہوا تو مکرم و محترم باجوہ صاحب نے اشارۃً بتایا کہ یہاں سے تبادلہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ اکتوبر 1967ء میں سردی میں

باندھی سے آیا اور جون 1968ء میں واپس ضلع نوابشاہ تبدیل کر دیا گیا۔ راجہ خورشید احمد صاحب منیر کو نوابشاہ سے مظفرآباد اور مظفرآباد سے عطاء الکریم صاحب کو مری تبدیل کیا گیا۔ تبدیلی کے حکم پر واپس نواب شاہ روانہ ہو کر اگلے روز وہاں پہنچ گیا۔ اس پر سندھی احباب بہت خوش ہوئے۔

باندھی کے ڈاکٹر صاحب کی نوازش

میں کوہ مری میں تھا۔ اہلیہ لو بلڈ پریشر کی مریض تھیں۔ ان کو اکثر انجکشن لگتے تھے۔ خود موجود تھا تو خود لگا لیتا تھا۔ میرے بعد مکرم ڈاکٹر محمد حسین صاحب یہ فریضہ سر انجام دیتے رہے۔ میں نے گھر لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بل ساتھ ساتھ دیتے جائیں۔ گھر والوں نے بھی پیسے دینے چاہے تو فرمانے لگے۔ مربی صاحب آئیں گے تو اکٹھے ہی لے لیں گے۔ میں جب آیا، ان سے ملا اور بل دریافت کیا تو کیا ہی عمدہ جواب دیا۔ کہنے لگے

”آپ لوگ زندگی وقف کر سکتے ہیں تو ہم آپ کے لیے اتنا وقت بھی قربان نہیں کر سکتے کہ آپ کے خرید کردہ ٹیکے تھوڑا سا وقت صرف کر کے لگا جائیں۔ میں نے کوئی بل نہیں لینا“

ان سے تا قیام باندھی تعلقات رہے۔ اسی طرح سیٹھ محمد یوسف صاحب بھی گھریلو ضروریات کی فراہمی ہر ممکن طریق سے بلا تعطل جاری رکھتے۔

محمود ہال کی تکمیل کی کوشش

برادرم سیٹھ محمد یوسف صاحب نے محمود ہال لیاقت مارکیٹ نوابشاہ کی پہلی چھت تو مکمل کر لی۔ اب ان کا ارادہ تھا کہ چھت پر مزید دو کمرے اور باورچی خانہ بنایا جائے

تا کہ آئندہ مربی سلسلہ کی رہائش کے لیے کام آ سکے۔ایک دن ان کا رحمان آباد پیغام آیا کہ علی الصبح چار بجے والی گاڑی پر بھریا روڈ چلنا ہے۔سٹیشن پر ان سے مل گیا۔بھریا روڈ چوہدری عبدالرزاق صاحب تاجر کے پاس جانا تھا۔صبح ہی صبح ان کے ہاں پہنچ گئے۔انہوں نے ناشتہ وغیرہ کے لیے کہا تو میں نے کہا پہلے ہماری بات سنو اس کا مثبت جواب دو گے تو کھانا کھائیں گے۔ان کو بتایا کہ ہمیں محمود ہال کی چھت پر کمرہ بنانا ہے۔اس پر گارڈر اور ٹی آئرن ڈالنے ہیں جن پر تین ہزار روپیہ خرچ ہوگا۔تو فوراً کہا کہ پانچ پانچ صد دینے والے چھ افراد کو تحریک کرو۔عرض کیا کہ پھر آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی۔میں یوسف صاحب کو بتا چکا تھا کہ عبدالرزاق صاحب اول تو پانچ صد روپیہ کی پیشکش کریں گے اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار روپیہ دیں گے۔خیر وہ ایک ہزار روپے پر اڑ گئے۔میں نے کہا لے لو پھر ان سے دوسرے وقت میں لے لیں گے۔عرض کیا کہ ڈاکٹر ارشاد جو آپ کے بھائی ہیں ان سے بھی ہزار روپیہ لے دو۔کہنے لگے وہ جانے اور مربی صاحب جانیں۔میں نے کہا کہ اول تو پچاس روپے دے گا۔زیادہ سے زیادہ سو روپے دے گا۔چنانچہ نہایت خوبصورتی سے جماعتی ضرورت کا احساس دلانے کے باوجود پہلے پچاس روپے دیے اور بالآخر سو روپیہ نکال کر کہنے لگے لینا ہے تو لے لو ورنہ آپ کی مرضی۔یوسف صاحب اور سیکرٹری صاحب مال محمد اکرم صاحب بہت ہنسے اور کہا کہ آپ کو پتہ کیسے لگا کہ اس سے زیادہ نہیں دیں گے۔چنانچہ گیارہ سو روپیہ لے کر واپس آ گئے۔اسی طرح ایک روز چوہدری عطا محمد صاحب علوی صاحب موصوف جو اچھے خاصے زمیندار تھے وہ نوابشاہ تشریف لے آئے میں بھی وہاں موجود تھا ان کو تکمیل عمارت کے لیے درخواست کی تو مطلوبہ رقم انہوں نے مہیا فرما دی جس سے اوپر ایک یونٹ مکمل ہو گیا۔اللہ تعالیٰ یوسف صاحب مرحوم کی ان کاوشوں کو قبول فرما کر اجر عظیم عطا فرمائے۔آمین

تعمیر مکان اور اس کے لیے انجمن سے قرضہ کا حصول

والد صاحب محترم مرحوم نے بالکل ابتدائی ایام میں ربوہ میں ایک کنال زمین بعوض سو روپے کنال خرید کر لی تھی۔ 1951ء میں مرکز کے حکم کے تحت ایک کچا باورچی خانہ بھی پلاٹ میں تعمیر کر کے قبضہ کی صورت پیدا کی گئی۔ والد صاحب فوت ہو گئے۔ مزید تعمیر کی توفیق نہیں تھی۔ خاکسار مربی بننے کے بعد ضلع نوابشاہ چلا گیا۔ 1967ء میں جب کوہ مری تبادلہ ہوا تو احساس ہوا کہ ربوہ مکان بنوانا چاہیے تا کہ بچے ربوہ رہیں اور خود جہاں بھی تبادلہ ہو آسانی سے جا سکوں اور تعمیر مکان کے لیے انجمن سے قرضہ مکان لیا جائے۔

کارکنان کے لیے قرض کا طریق یہ تھا کہ جس کی سروس دس سال ہو جائے گی اسے تیس تنخواہوں کے برابر قرضہ مل سکے گا۔ اس پر میں نے قرض کی درخواست دی تو مجھے تین ہزار روپے قرض مل گیا۔ تین ہزار قرض اور تین ہزار محترم سیٹھ محمد یوسف صاحب کے پاس تھا۔ مرکز سے ایک ماہ کی چھٹی لی۔ اغلباً اگست 1969ء کی بات ہے۔ ایک ہزار روپے کا مزید انتظام ہو گیا۔ سات ہزار روپے میں ایک چھوٹا سا یونٹ دو کمروں، باورچی خانہ، سٹور اور نصف برآمدہ پر مشتمل تیار ہو گیا۔ فرش پر آ کر پیسے ختم ہو گئے جو مجھے مسعود احمد میرے دوست اور عزیز نے دے دیے۔ اسی طرح الحمدللہ یہ مکان تیار ہو گیا۔ ابھی تیار ہو رہا تھا کہ میں نے وصیت والوں سے اس کی قیمت لگوا کر قسط وار ادائیگی کی اجازت کی درخواست کر دی۔ انہوں نے پلاٹ اور مکان سمیت چودہ ہزار قیمت لگائی جس کی چودہ روپے ماہوار قسط ادا کرنی تھی۔ دوسری طرف قرضہ مکان کی بھی تیس روپے ماہوار قسط ادا کرنی تھی۔ گویا کل 44 روپے ماہوار مجھے ادا کرنے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ایسا فضل ہوا کہ مکان کی تکمیل سے بھی قبل 45 روپے ماہوار

کرایہ پر اٹھ گیا۔ اس طرح بغیر کسی مشکل میں پڑے قرضہ مکان اور حصہ جائیداد دونوں ادا ہو گئے۔ یہ کرایہ دار جن کا نام محمد دین صاحب تھا اور بہت پہلے سے ربوہ آ کر رہنے لگے تھے بیس سال تک مکان ان کے پاس رہا۔ ان کے ساتھ طے تھا کہ جب خود آنا ہو گا مکان خالی کراؤں گا۔ چنانچہ 1989ء میں جب بچوں کو ربوہ منتقل کیا تو مکان خالی کروایا گیا۔

ایک واقعہ

تعمیر مکان کے وقت ارد گرد بہت کم مکان بنے تھے۔ حفاظتی لحاظ سے خود یہاں میدان میں سوتا تھا۔ گرمی کا موسم تھا ایک دن ایک قریب کے کارکن رات کو میرے پاس تشریف لے آئے اور میرے ساتھ اہل مرکز کی کمزوریوں کو بیان کرنا شروع کیا۔ میں بھی ہاں ہاں کرتا رہا۔ جب وہ تھک گئے تو میں نے عرض کیا اب مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ فرمایا۔ ہاں۔ میں نے کہا میرے نزدیک یہ جماعت خدا کی قائم کردہ ہے۔ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اگر یہ درست ہے تو جماعت باقی نہیں رہنی چاہیے۔ چونکہ جماعت قائم ہے لہٰذا آپ کی غلطی ہے۔ اس لیے میرے ساتھ اس قسم کی گفتگو کی زحمت نہ کریں۔ اس پر وہ بالکل خاموش ہو گئے اور پھر انہوں نے کبھی اس قسم کی بات نہیں کی۔

جلسہ سالانہ 1965ء جنگ ستمبر کے باعث نہ ہو سکا۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے مرکزی نمائندگان پر مشتمل سارے مغربی پاکستان کی جماعتوں میں وفود بھجوائے۔ سندھ میں مکرم مبارک مصلح الدین صاحب، عبدالرزاق صاحب پی ٹی آئی اور خاکسار پر مشتمل ایک وفد تو خیر پور، سکھر، جیکب آباد، لاڑکانہ کے ہر احمدی دوست سے ملنے کی تاکید کے ساتھ بھجوایا۔ دوسرا وفد مکرم نور محمد نسیم سیفی

صاحب اور غالبا مولانا غلام باری سیف صاحب اور مولانا نصر اللہ خان صاحب ناصر پر مشتمل ٹھٹھہ، دادو وغیرہ اضلاع کے لیے تھا۔ چنانچہ دونوں وفود کے اخراجات سفر مع سواری محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے ادا کیے۔ اس طرح دورہ کردہ جماعتوں کے تمام افراد سے ملاقات کر کے حضور کا سلام و پیغام پہنچایا۔ جس سے جماعتوں میں اطمینان کی کیفیت پیدا ہوئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کا ایک ارشاد اور اس کی تعمیل

حاجی عبدالرحمٰن صاحب امیر ضلع نوابشاہ کو حضور نے ایک ملاقات میں فرمایا کہ سندھیوں کو میرے پاس لے کر آؤ۔ اس ارشاد پر عمل کے لیے صدر صاحبان ضلع سے میٹنگ کی گئی۔ اسی طرح یہ ارشاد سندھ کے باقی اضلاع کے امراء تک بھی پہنچایا گیا۔ ایک دفعہ غالباً نوابشاہ میں اسی غرض سے مکرم و محترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب صدیقی ڈویژن امیر تھرپارکر ڈویژن بھی تشریف لائے تھے۔ ضلع نوابشاہ کے احباب سے جلسہ سالانہ پر ایک دو سندھی غیر از جماعت احباب کو ساتھ لے جانے کے وعدے لیے اور طے پایا کہ یہاں سے بس کے ذریعہ سفر کیا جائے تا کہ احباب اکٹھے سفر کر سکیں۔ چنانچہ پہلے سال ایک بس بھر کر لے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جلسہ سے دو روز پہلے روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔ محترم حاجی صاحب نے عمومی نگرانی اور انتظام کے فرائض مجھے سونپ دیے۔ اخراجات سفر زیادہ تر محترم حاجی صاحب برداشت کر لیتے تھے۔ اب ان مہمانوں کے راستہ کے کھانے وغیرہ کے لیے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک دیگ عمدہ چاولوں میں زیادہ گوشت ڈال کر پکا لیا جائے۔ راستہ میں دوپہر اور شام کے کھانے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ چائے کے انتظام کے لیے دودھ، ایندھن اور برتن وغیرہ ساتھ لے لیے جائیں تا کہ کسی بھی جگہ دوستوں کو چائے پلائی جا سکے۔ اس سے

اخراجات میں بھی بچت ہوگی۔ وقت بھی بچے گا اور اچھا کھانا بھی ملے گا۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور اس پر عمل پیرا ہونے سے بہت سہولت رہی اور احباب بھی خوش رہے۔ مجھے بھی حاجی صاحب باجازت مرکز قافلہ کے ہمراہ جانے کو فرماتے تھے۔ چنانچہ اس سال ایک عبدالرحمٰن نام مری بلوچ نے بیعت کر لی جو ویلڈنگ کا کام کرتا تھا۔ جلسہ سے واپسی پر عبدالرحمٰن کو کام سے فارغ کر دیا گیا۔ عبدالرحمٰن شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ اب وہ کراچی چلا گیا۔ اس کے گاؤں میں اس کے احمدی ہونے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہاں مشورہ ہوا کہ یہ کافر ہو گیا ہے اسے قتل کر دیا جائے اور اس کی بیوی کی دوسری جگہ شادی کر دی جائے۔ عبدالرحمٰن گھر آیا تو بیوی رو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ انہوں نے تمہیں قتل کر کے میری شادی کسی دوسری جگہ کر دینی ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ اس نے جماپور کے احمدیوں سے کچھ پیسے لیے اور اپنی والدہ کو جس کی اس کے والد کی وفات کے بعد دوسری جگہ شادی ہو چکی تھی اور اپنے بیوی بچوں کو یہ کہہ کر ساتھ لے کر روانہ ہوا کہ انہیں سہون شریف دکھانا ہے اور ریل پر بیٹھ کر سیدھا ربوہ پہنچ گیا۔ تین چار روز دارالضیافت میں قیام کے بعد وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ سندھ سے اس کی برادری اس کی تلاش میں ربوہ آئی اور اس کا جرم تھا کہ اپنی ماں کو کیوں ساتھ لے آیا ہے۔ تاہم اس نے مجھے ساری صورتحال سے مطلع کیا۔ میں حاجی صاحب کے مشورہ سے کچھ پیسے لے کر اس کی مدد کے لیے ربوہ آیا اور اس سے ملا۔ ناظر صاحب اصلاح و ارشاد مولانا عبدالمالک خان صاحب سے صورتحال عرض کر کے مدد چاہی تو انہوں نے نظارت امور عامہ کی طرف بھیج دیا۔ نظارت امور عامہ نے پھر ناظر صاحب اصلاح وارشاد کی طرف بھیج دیا۔ آخر میں نے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کی اجازت لی اور ملاقات میں ساری صورتحال عرض کی۔ حضور نے فرمایا کہ اس کو کراچی بھیج دو اور ان کو

کہو کہ اس آدمی کو سنبھالو۔ حضور رحمہ اللہ نے ازراہِ شفقت اس کے لیے سات صد روپے عنایت فرمائے۔ کچھ پیسے اس کے لیے میرے پاس بھی تھے۔ چنانچہ اس کو کراچی بھیج دیا۔ وہاں یہ بچوں سمیت کمانڈر شمیم صاحب کی حفاظت میں رہا۔ بلوچوں نے جماعت جماپور اور بعض دیگر احمدیوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیں لیکن اللہ نے محفوظ رکھا۔ البتہ عبدالرحمٰن کو مارنے کے درپے رہے اور یہ ہر پندرہ روز بعد مکان تبدیل کرتا رہا۔ اب بھی وہ کراچی میں ہے۔ معمر ہو چکا ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ چاروں اچھا کما رہے ہیں۔ گذشتہ سال دونوں میاں بیوی قادیان گئے تھے۔ واپسی پر میرے ہاں ٹھہرے۔ بہت خوش تھے۔ بچیاں بھی ہیں۔ سب احمدیوں کے ہاں شادی شدہ ہیں۔ خود بھی جماعت کراچی کے ایک حلقہ میں کسی جماعتی جائیداد کا نگران ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے قبیلے سے مزید دو گھرانے احمدیت کے نور سے منور ہوئے ہیں۔ جبکہ یہ شدید وحشی پس منظر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

اگلے سال مزید دو بسیں جلسہ سالانہ ربوہ پر لے کر گئے۔ ان کا نگران اعلیٰ بھی خاکسار تھا۔ حسب سابق دو دیگ عمدہ پلاؤ پکا کر ساتھ رکھا گیا جس سے خرچ اور وقت کی بہت بچت ہو جاتی تھی۔ قریباً پانچ سال تک یہ سفر جاری رہا۔ اگرچہ بیعتیں تو زیادہ نہیں ہوئیں لیکن لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آئی تھی۔

7 ستمبر کے ناٹ مسلم والے فیصلہ پر دورہ

ناٹ مسلم کے فیصلہ پر سیدی خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کا جو پیغام آیا وہ فون کے ذریعہ جماعتوں کو پہنچا رہا تھا۔ جہاں بھی پیغام دیتا وہاں کے احباب کہتے آپ نے آنا نہیں؟ اس پر خاکسار نے محسوس کیا کہ اب فوری طور پر جماعتوں میں دورہ کر کے رابطہ کرنا چاہیے۔ محترم امیر صاحب سے ذکر کیا تو فرمانے لگے درست ہے۔ اس

وقت چوہدری عبدالرزاق صاحب کے بیٹے ناصر احمد صاحب کے پاس ہنڈا ستر سی سی تھا۔ایک چلانے والے دوست کوساتھ لے کر دورہ کے لیے ان سے موٹر سائیکل لی۔ سب سے پہلے ان کے پاس گئے۔ دوستوں میں اداسی کی کیفیت تھی اور مخالفوں نے بڑی سرعت سے یہ افواہیں پھیلائی ہوئی تھیں کہ تمام جماعتوں کے لوگ احمدیت چھوڑ چکے ہیں۔ چنانچہ موٹر سائیکل پر تین یوم میں قریباً پندرہ جماعتوں کا دورہ کیا۔ جہاں بھی گیا انہوں نے کہا سنا ہے قریب والی فلاں جماعت کے احباب احمدیت چھوڑ چکے ہیں جو بالکل جھوٹ تھا۔ چنانچہ دورہ سے احباب کی یہ غلط فہمی دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔

غیر احمدی تو اعلان سے یہ سمجھ رہے تھے کہ اب واقعی یہ (مومن) نہیں رہے۔ گویا (دین حق) ان کا دیا ہوا تھا جو انہوں نے چھین لیا۔ بعض لوگوں نے تو احمدیوں کے ساتھ کھانا پینا بھی ترک کر دیا۔ دورہ سے واپسی پر گوٹھ جالندھریاں باندھی مورو روڈ پر ایک قصبہ آتا ہے وہاں ہمیں موٹر سائیکل میں ہوا بھرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو پاس ہی باندھی کے ایک تاجر چوہدری فرزند علی صاحب دکانات تعمیر کروا رہے تھے مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ نوکر کو ہوٹل سے چائے لانے کے لیے کہا۔ جب چائے ڈال کر دے رہے تھے تو کہنے لگے مولوی صاحب بڑا سخت فیصلہ ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا چوہدری صاحب یہ کون سا فیصلہ ہوا ہے۔ یہ قوم جو ہندوؤں کی جھوٹی پلیٹوں میں کھاتی اور ان کے جھوٹے گلاسوں میں پانی پیتی ہے ہمارے ساتھ بھی کھانا پینا نہیں چھوڑے گی۔ یہ چند دن کی بات ہے اور ان کو بتایا چند روز قبل باندھی سٹیشن ماسٹر نے شہر والوں کی دعوت کی۔ وہاں مسلمان اور ہندو سب تھے۔ سب مل کر کھا پی رہے تھے۔ تو چوہدری فرزند علی صاحب کہنے لگے اس طرح تو میں نے بھی کئی بار کیا ہے۔ بہر حال فیصلہ کے بعد یہ پہلا شخص تھا جو اتنی محبت اور احترام سے پیش آیا اور جب تک میں باندھی میں رہا چوہدری فرزند علی صاحب نے ہمیشہ محبت اور احترام پر مبنی تعلقات

رکھے۔ جب ربوہ منتقل ہونے لگے تو میرے گھر کے تمام افراد کی دعوت کی۔ ساتھ وعدہ لیا کہ جب بھی پنجاب سے باندھی آؤ ہمیں ضرور مل کر جاؤ۔ چنانچہ اس وعدہ کو پورا کرنے کی توفیق ملتی رہی۔ اس دورہ سے ایک تو جماعتوں کی خیریت معلوم ہوگئی دوسرے ان سے رابطہ ہوگیا جس سے جماعتیں بہت خوش ہوئیں۔ بعد ازاں حیدرآباد ڈویژن کے امراء نے بھی تمام جماعتوں کے نمائندگان سے دورہ جات کروائے۔ الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے بروقت کارروائی کرنے کی توفیق دی۔

اس فیصلہ کے ضمن میں دو واقعات تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس فیصلہ کے بعد مکرم رئیس عبدالحمید صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی مکرم رئیس عبدالقادر صاحب ایم اے حاجی صاحب سے ملنے آئے اور وہ فیصلہ پر بڑے نالاں نظر آئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فیصلہ سے وہ اپنے آپ کو واقعۃً غیر مسلم سمجھ رہے ہیں۔ میں اٹھ کر اندر سے باہر آیا تو ڈیوڑھی میں رئیس عبدالستار ٹہل رہے تھے۔ میں نے کہا سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔ کہنے لگا مولوی صاحب زندگی میں کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ ان دنوں کھلے عام پھرتا رہا ہوں کہ کوئی احمدی سمجھ کر مار دے تو بخشا جاؤں وہ بھی کسی نے نہیں کیا۔ مجھے اس فقرے کا بڑا لطف آیا اور آج تک یاد ہے۔ کیونکہ ان کی زندگی میرے سامنے تھی۔ احمدیت پر یقین کا یہ اظہار ان کی اندرونی کیفیت کا پتہ دیتا ہے۔

فیصلہ کا غیر مؤثر ہونا

یہ سرکاری فیصلہ بے سمجھ عوام پر تو کچھ دن اثر انداز رہا لیکن عام طور پر سندھی دوستوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ 7 ستمبر کے اعلان کے بعد محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے ہاں کوئی شادی تھی۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ لوگوں کو اس پر دعوت دینی چاہیے تا کہ تعلقات واسطہ داری اور اعلان غیر مسلم کی اثر انگیزی کا علم ہو سکے۔ کہنے

لگے بہت اچھا۔ چنانچہ اچھے بڑے پیمانے پر شادی کے انتظامات کر کے بہت سے غرباء اور غیر احمدی شرفاء کو دعوت دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے مدعووین کی بھاری اکثریت دعوت میں شامل ہوئی۔محترم حاجی صاحب کی والدہ جو کہ احمدی تھیں، کی وفات ہوگئی۔ان کے جنازہ میں بھی بہت سے غیر از جماعت شامل ہوئے۔اس طرح اس اعلان کے غیر مؤثر ہونے کا اندازہ ہوگیا۔

سوشل بائیکاٹ

جس طرح پنجاب میں احمدیوں کا سوشل بائیکاٹ کیا گیا سندھ میں بھی بعض جگہ اس کے اثرات تھے۔باندھی شہر میں بھی احمدیوں کے بائیکاٹ کے لیے ایک تنظیم بنائی گئی جس کا سربراہ ایک ڈاہری حاجی محمد یوسف زمیندار اور تاجر تھا اور نائب صدر ایک پنجابی تھا اور سیکرٹری حاجی بہادر جمالی تھا جبکہ اسسٹنٹ سیکرٹری ایک پنجابی تھا۔انہوں نے شہر میں احمدیوں کے بائیکاٹ کا پروگرام بنایا۔میں نے حاجی صاحب کو کہا کہ یہ بائیکاٹ ناکام بنانا چاہیے۔کہنے لگے کیسے؟ میں نے کہا حاجی یوسف ڈاہری صدر ہے اس کو بلائیں اور کھلائیں پلائیں نیز اسے سمجھائیں کہ یہ طریق درست نہیں۔

اس پر حاجی صاحب نے حاجی یوسف ڈاہری کو فون کیا کہ بھئی آپ میرے بھائی ہیں۔آپ کو عہدہ ملا ہے میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔آپ میرے پاس آئیں۔اس نے کہا جب حکم کریں آجاؤں گا۔کہا گیا کہ ابھی آجائیں۔چنانچہ وہ آگیا۔حاجی صاحب نے چائے اور مٹھائی گھر سے منگوالی۔پیش کی اور اس نے کھا لی۔پھر حاجی صاحب نے کہا کہ آپ شہر میں احمدیوں کا سوشل بائیکاٹ کرنا چاہتے ہیں۔یہ بتائیں کہ حضرت امام حسینؓ کا پانی کس نے بند کیا تھا۔کہنے لگا یزید نے۔تو پوچھا گیا کہ حق پر کون تھا۔جواب دیا حضرت امام حسینؓ۔اس پر انہیں کہا گیا کہ ہمارا

بائیکاٹ کر کے سوچو کہ ہمارا مقام کیا ہوگا اور آپ کا کیا ہوگا۔

اگر آپ بائیکاٹ احمدیوں کو سمجھانے کی خاطر کرنا چاہتے ہیں تو آپ حفظ امن کی ذمہ داری لے لیں میں تمام احمدیوں کو آپ کے گھر پر اکٹھا کر دیتا ہوں۔ آپ اپنے عالم دین کو بلائیں میں اپنے عالم دین کو بھی نہیں بلاؤں گا۔ اگر آپ کے عالم دین نے مجھے شکست دے دی تو سارے احمدی آپ کی طرف ہو جائیں گے۔ یا پھر آپ اپنے عالم کو میرے ڈیرے پر لے آئیں میں سارے احمدیوں کو یہاں جمع کر لیتا ہوں۔ حفظ امن کی مکمل ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ میرے سوا کوئی شخص گفتگو نہیں کرے گا۔ آپ مولوی صاحب کو یہاں لے آئیں۔ حاجی صاحب کہنے لگے وہ کسی صورت بھی میرا سامنا کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔

اس پر حاجی یوسف صاحب چلے گئے۔ جا کر مولوی صاحب سے رابطہ کیا تو وہ آنے پر رضامند نہ ہوئے۔ ادھر حاجی صاحب، یوسف صاحب کو فون پر فون کر رہے ہیں کہ جلد مولوی صاحب کو لے کر آؤ میری عاقبت نہ کہیں خراب ہو جائے۔ آخر تیسرے دن یوسف صاحب نے مولوی صاحب کو بڑی سی گالی دے کر کہا وہ نہیں آتا اور خود ایک احمدی چوہدری منیر احمد عابد صاحب کی دکان پر جا کر اس سے ملا۔ اس نے بوتل وغیرہ پلائی۔ سامنے ہوٹل والے نے جب دیکھا کہ احمدی کے ہاں بوتل پی ہے تو اس نے بلند آواز میں کہنا شروع کر دیا ہمیں بائیکاٹ کرنے کو کہتے ہیں اور خود ان کی دکان پر بوتلیں پیتے ہیں۔ ہم کسی کا بائیکاٹ نہیں کریں گے۔ چنانچہ اس تدبیر سے باندھی شہر میں کوئی بائیکاٹ وقوع میں نہ آسکا۔ اسی طرح حاجی بہادر صاحب کو بھی بلا کر عرض کیا گیا کہ بائیکاٹ تو یزید نے کیا تھا۔ آپ سوچیں یہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور آپ جیسے امن قائم رکھنے والے زمیندار کو فساد میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی کہا کہ ہرگز کوئی بائیکاٹ نہیں ہوگا۔

علم طب سے استفادہ

تحصیل علم طب سے قلیل طور پر تو ایام قیام لاہور میں استفادہ شروع ہو گیا تھا اور بعض مریضوں کے علاج میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کامیابی ہوئی۔ پھر ربوہ آ گیا۔ یہاں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتا رہا۔ میرا رجحان علم طب میں مختصر ترین مقدار خوراک کے ذریعہ علاج کی طرف تھا۔ چنانچہ اس غرض سے کشتہ جات کو پیش نظر رکھا۔ اسی طرح کم از کم مفردات پر مشتمل نسخہ جس کا بنانا اور استعمال کرنا سہل ہو وہ پیش نظر رکھنا شروع کیا کیونکہ لوگ اب جوشاندے اور نقوع کے بڑے بڑے پُڑے اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ اس میں اللہ تعالیٰ میری رہنمائی فرما رہا تھا اور کامیابی بھی مل رہی تھی۔ لیکن جب سندھ میں تقرری ہوئی تو جس کسی کو بھی دوائی دیتا تو وہ فورا کہتا سوئی نہیں لگانی؟ یعنی ٹیکا نہیں لگانا۔ گویا انجکشن کے بغیر مریض کو علاج پر اعتماد نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ انجکشن تو پہلے ہی لگانا آتا تھا، سندھ جا کر ایک سرنج بکس اور اس میں ملیریا کے ٹیکوں کے علاوہ دو چار قسم کے اور ٹیکے رکھ لیے اور مریضوں کو انجکشن لگانا شروع کر دیا۔ باندھی شہر میں متعدد معالج موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی مستند نہیں تھا۔ ہمارے ایک احمدی دوست کسی زمانہ میں ربوہ میں خزانہ کے پہرہ دار تھے۔ کسی وجہ سے یہاں سے فراغت کے بعد سندھ چلے گئے اور دو تین ماہ ہمارے احمدی معالج مکرم عبدالقدوس صاحب مرحوم کی شاگردی کر کے باندھی میں ڈاکٹر بن گئے اور اچھی خاصی گزر بسر کرنے لگے۔

اب رہا میرا معاملہ تو میں نے اسے دعوت الی اللہ اور خدمت خلق کا ذریعہ بنایا۔ نادار مریض کو بے علاج نہیں رہنے دیا۔ بلکہ علاج کے ساتھ اسے غذا کے لیے بھی مدد دی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا اس قدر اعتماد بڑھا کہ ساہیوال اور اوکاڑہ کے علاقہ کے حاجی

صاحب کے مزارع جو گاؤں میں موجود تھے،ان کا بچہ بیمار ہو جاتا اور میں دورہ پر ہوتا تو کہتے بچہ کو ان کے گھر سے پھرالاؤ تو بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ گاؤں میں بہت سے سندھی مزدور لوگ امن سے بیٹھے تھے۔ دن بھر شہر میں جا کر مزدوری کرتے۔ بیمار ہو جاتے تو علاج کے لیے رجوع کرتے۔ اگر ان کے پاس پیسے نہ ہوتے تو ان کے نام لکھ چھوڑتا۔ دے دیتے تو ٹھیک اگر ان کی غربت آڑے آئے تو کوئی مطالبہ نہ کرتا۔ جب ہیڈ کوارٹر ہوتا تو دو دو تین تین میل سائیکل پر جا کر لوگوں کا علاج کرتا اور آنے جانے کی کوئی فیس نہ لیتا تھا۔صرف تین روپے ٹیکا کے یا اگر گولیاں دیتا تو ایک روپیہ گولیوں کا کل چار روپے لیتا۔ وہ بھی اگر وہ خود دے دیتے تو ٹھیک ورنہ ان کے نام لکھ چھوڑتا۔اس سے میرے دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں تعلقات بہت وسیع ہو گئے اور اگر کسی مریض کا مقامی طور پر علاج نہ ہوسکتا تو ان کے ہمراہ نواب شاہ میں جا کر ان کو سرکاری ہسپتال میں دکھا دیتا۔اس کی کئی ایک مثالیں ہیں۔ جانے آنے کا خرچ خود کرتا تھا۔ حاجی صاحب کو بھی میری تشخیص پر خاصا اعتماد ہو گیا تھا۔نوکروں میں سے کوئی بیمار ہوتا تو میرے پاس بھیج دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ متعدد مریضوں کو مختلف اوقات میں نواب شاہ سرکاری ہسپتال میں داخل کرایا۔اسی طرح ایک گاؤں میں دو خاندانوں کے افراد کو ٹی بی تھی۔ میں نے ان کا نوابشاہ میں علاج کروایا اور ہسپتال کا آدمی بلوا کر سارے گاؤں والوں کو حفاظتی ٹیکے لگوائے اور باقی افراد خاندان ٹی بی سے بچ گئے اور میرے بڑے ممنون ہوئے۔

غیر احمدیوں کے ایک گاؤں والوں کا میں علاج کرتا تھا۔ کچھ دن میں نہ جا سکا۔ ایک غیر احمدی وہاں گیا۔اس نے پوچھا کہ یہاں اب کون علاج کے لیے آتا ہے۔تو انہوں نے میرا نام بتایا۔ کہنے لگا وہ تو مرزائی ہے (مومن) نہیں تم اس سے علاج کرواتے ہو۔وہ بی بی کہنے لگی تم کہتے ہو وہ (مومن) نہیں وہ تو ہمارے گھروں میں آ کر

نمازوں کے وقت نماز پڑھتا ہے۔ ٹیکا لگاتا ہے تو کئی بار بسم اللہ پڑھتا ہے۔ آپ کی زبان سے تو خدا کا نام بھی نہیں سنا اس لیے آئندہ یہاں وہی آئے گا آپ کو تکلیف نہیں دیں گے۔ اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اس بی بی نے خود مجھے یہ واقعہ سنایا۔

علم طب سے استفادہ کا مضمون چل رہا تھا اسی سلسلہ میں تحریر ہے کہ ایک دفعہ محترم حاجی صاحب کے ایک رشتہ دار کو دل کی تکلیف ہوئی ان کا عزیز آپ سے گاڑی مانگنے کے لیے گیا تو آپ نے کہا پہلے مربی صاحب کو دکھاؤ۔ میں نے دیکھا تو اس کے بائیں بازو میں درد تھا جو سینے تک جاتا تھا اور سانس میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ اسے درد روکنے کا انجکشن دے کر فورا ہسپتال لے جانے کا کہا۔ حاجی صاحب نے گاڑی دے کر ساتھ مجھے بھی جانے کے لیے کہا۔ میں گیا۔ واقعۃً وہ ہارٹ کا مریض ثابت ہوا۔ نوابشاہ ہسپتال داخل کرا کے واپس آ رہے تھے۔ ڈرائیور حاجی صاحب کا رشتہ دار تھا۔ گاڑی میں حاجی صاحب کے ماموں، میں، ڈرائیور اور پچھلی طرف ایک اور احمدی نوجوان بیٹھا تھا۔ راستہ میں گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ سڑک سے اتر کر پکی اینٹوں کے ایک ڈھیر سے ٹکرا گئی۔ سامنے گاڑی لگتی ہوئی نظر آئی تو زبان سے تین بار لاحول ولاقوۃ کا ورد نکلا۔ گاڑی ٹکرائی۔ ڈرائیور بھی زخمی ہوا۔ حاجی صاحب کے ماموں اور پچھلی طرف والا نوجوان بھی زخمی ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحم کہ مجھے خراش تک نہ آئی۔ گاڑی کا ریڈیئٹر تباہ ہوا۔ اب گاڑی کا ڈرائیور اور حاجی صاحب کے ماموں مجھے سبق دے رہے ہیں کہ حاجی صاحب کو کہنا گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا اس لیے حادثہ پیش آیا۔ گویا جھوٹ بولنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ میں نے سوچا ابھی موت سامنے نظر آ رہی تھی اس سے بچ کر پہلا کام یہ کروں کہ جھوٹ بولوں۔ میں ہرگز ایسا کام نہیں کروں گا۔ چنانچہ جب گاؤں کے قریب پہنچے میں گاڑی رکوا کر دوسری طرف سے گھر چلا گیا اور یہ جب گاڑی لے کر گیا تو پھر حاجی صاحب کے غصہ کا خود نشانہ بنا۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنے سے بچالیا اور چوٹ سے بھی بالکل محفوظ رہا۔

اس کے علاوہ بھی جب بھی کسی مریض کے لواحقین کو ہسپتال تک ساتھ جانے کے لیے میری ضرورت پیش آتی میں بلا عذر اس کے ساتھ ہو لیتا اور کرایہ کھانا وغیرہ خود اپنے پاس سے کھاتا۔ ان سے کبھی چائے بھی قبول نہیں کی۔ اس طرح گاؤں کے سب لوگ میرا احترام بھی کرتے اور میری بات بھی سنتے۔ آدھی رات کے وقت آنے والے مریض کو کبھی جواب نہیں دیا چاہے گاؤں سے دور جانا پڑتا۔ اگر علاج میرے بس کا ہوتا تو کرتا ورنہ انہیں ہسپتال لے جانے کا مشورہ دے دیتا۔ مفت طبی مشورہ اور اگر ممکن ہو تو آنے والے کو نسخہ لکھ کر دے دیتا۔

دو مفید اور آزمودہ نسخے

یہ سلسلہ آج تک بھی جاری ہے۔ میرے پاس چند نسخے بہت آزمودہ اور مفید ہیں۔ جب بھی کوئی مریض آیا جن کو علاج کے لیے ان نسخہ جات کی ضرورت ہوئی اس کو فوراً لکھ دیے۔ چنانچہ دو نسخے یہاں بھی استفادۂ عام کے لیے تحریر ہیں۔ جو پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے مریضوں کو دے رہا ہوں اور وہ خطا نہیں گئے۔

صداع شقیق (میگرین پین) جس کا ایلوپیتھی میں کوئی علاج نہیں۔ اس مختصر ترین نسخہ کے ایک ہفتہ کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض صحتیاب ہو جاتا ہے۔ نسخہ یہ ہے

ھوالشافی

کالی مرچ (تین گرام)، دھنیا خشک (چار گرام)، اسطوخودوس (چھ گرام)

گرائنڈ کر لیں یا ہاون دستہ میں پاؤڈر بنا لیں۔ رات کو پاؤ بھر پانی میں بھگوئیں۔ علی الصبح طلوع آفتاب سے آدھا گھنٹہ پہلے چھان کر پانی پی لیں اور سو

جائیں۔سونا نہایت ضروری ہے۔انشاءاللہ سات دن سے بھی پہلے پہلے آرام آجائے گا۔مدرسۃ الظفر میں خدمت کے دوران متعدد طلباء کواس سے شفاء ہوئی ہے۔

نسخہ نمبر 2 ایسے نوجوان جن کی شادی نہیں ہوئی اور کثرت احتلام کے مریض ہیں ان کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الاول کا یہ نسخہ بے حد مفید ہے۔

ھوالشافی

گوند کیکر، گوند کتیرا، لاکھ دانہ، تخم تالمکھانہ۔ ہر ایک پانچ پانچ تولہ۔

باریک سفوف بنالیں۔صبح نہار منہ دودھ کے ساتھ ایک چائے کا چمچ دو ہفتہ تک استعمال کریں۔یہ نسخہ اس سلسلہ میں بے شمار فوائد کا حامل ہے ۔ مجھے محترم سید عبداللطیف شاہ صاحب انسپکٹر بیت المال نے عطا کیا تھا اور بیاض نورالدین میں یہ نسخہ موجود ہے۔نسخہ جات تو اور بھی ہیں لیکن یہ ان کا محل نہیں۔اس لیے سر دست اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔علاج معالجہ کے سلسلہ میں مَیں نے بارہا اپنی معالجاتی زندگی میں تجربہ کیا ہے کہ مریض کے لیے معالج کی پُر درد دعا بہت اثر انگیز ہے۔

جذبۂ ہمدردی

اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے ہی میرے سینہ میں ہمدردی بھرا دل رکھا ہے۔اس پر اس کا جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ مجھے اس نے محض اپنے فضل سے عزیزوں، رشتہ داروں کی وقتاً فوقتاً مختلف رنگ میں خدمت کرنے کی توفیق بخشی اور یہ محض اس کا فضل ہے کیونکہ اس کی دی ہوئی توفیق کے بغیر ایسا کرسکنا ہرگز ممکن نہیں۔میں یہاں یہ ذکر احسان جتانے کے رنگ میں ہرگز نہیں کر رہا بلکہ صرف اس غرض سے کر رہا ہوں کہ میرے ان عزیزوں کا ذکر خیر بھی ہو جائے اور شاید اس سے ان اعزہ اور قارئین کے دل میں میرے لیے دعا کی تحریک پیدا ہو جس کا میں محتاج ہوں اور قارئین کے دل میں

بھی خدمت انسانیت اور صلہ رحمی کی تحریک پیدا ہو۔

میری چھوٹی ہمشیرہ کو خاوند کی زیادتیوں کے باعث اس سے خلع لینا پڑا۔اس میں سے اس کی ایک بیٹی اختری نام ہے۔اس کی پرورش کے اخراجات میں بھی ہمشیرہ کے دوسرے خاوند کے ساتھ شریک رہا۔اس کو ایف اے تک تعلیم کے بعد سی ٹی میں داخلہ ملا۔داخلہ کے اخراجات ادا کیے۔میری اہلیہ کپڑوں کی سلائی کر کے مجھے اس کی مدد کرنے میں تعاون کرتی۔تاہم وہ تعلیم کے بعد شعبہ تعلیم میں ٹیچر ہوگئی اور ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ڈویژنل انسپکٹر ہوگئی۔ہمشیرہ کے بچوں کو خود تنگی اٹھا کر بھی تحائف دیتا رہتا۔ایک بار ہمشیرہ کا بڑا بیٹا سلیم جو میرے ساتھ بہت مانوس تھا طبیہ کالج کی تعلیم کے دوران میرے پاس لاہور آ گیا۔چھوٹا ہی تھا۔اسے سارے لاہور کے اہم مقامات کی سیر کرائی۔ایک دن راستہ میں سڑک کنارے ایک شخص تازہ مٹھائی بنا کر بیچ رہا تھا سلیم نے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور اس کی نظر لمبی ہوگئی۔میں واپس آیا۔اسے پیٹ بھر کر مٹھائی کھلوائی تب آگے گئے۔آج وہ جرمنی بیٹھا ہے۔بچوں کی شادیاں بھی کر لی ہیں لیکن یہ واقعہ آج بھی اپنے بچوں کو سناتا ہے۔

1984ء کی بات ہے۔میرے چھوٹے تایا زاد بھائی مکرم جلال الدین صاحب میرے سسرال کرونڈی میں رہتے تھے۔ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔بڑا بیٹا فوج میں ملازم تھا اور پنجاب رہتا تھا۔والدین کے ساتھ تعلق نہ تھا۔دوسرا بیٹا ان کے ساتھ ہی رہتا تھا۔اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کے ہاں چار بیٹیاں اور تین صغیر السن بیٹے تھے۔پرائیویٹ نوکری کر کے اپنے بچوں اور والدین کا پیٹ پالتا تھا۔وہ دل کا مریض تھا۔اس کے دل کے تین والو بند تھے۔اسے کراچی علاج کے لیے لے جانا پڑا۔اس وقت اس کے علاج کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ ہزار روپے نقد دینے کی توفیق عطا کی۔لیکن بشیر بچ نہ سکا۔اب مرحوم کے زیر کفالت گیارہ افراد جن میں والدہ، والد،

جوان بہن، چار بیٹیاں، تین بیٹے شامل تھے۔ والد اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ سب بے آسرا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کی خبر گیری کی مجھے توفیق دی۔ مرحوم کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ انہی دنوں بیوت الحمد سکیم کا اجراء ہوا۔ جماعت کرونڈی کی کوشش سے انہیں یہاں کوارٹر مل گیا اور وظیفہ بھی منظور ہو گیا۔ اب ان کو ربوہ منتقل کرنے کے لیے اس زمانہ میں چار ہزار روپے کی ضرورت تھی جو میری ادنیٰ سی کوشش سے ایک مخیّر دوست نے ادا کر دیے اور ان کو ربوہ لا کر بیوت الحمد میں آباد کر دیا۔ جب تک یہ کرونڈی رہے بچیوں میں سے دو کو اپنے پاس باندھی رکھ کر میٹرک تک تعلیم دلوائی۔

بشیر احمد مرحوم کی ہمشیرہ عزیزہ نصیرہ کی شادی اپنے سالے کے بیٹے محمد ایوب سے کر دی اور سارے اخراجات کا تین چوتھائی مجھے ادا کرنے کی توفیق ملی۔ ایک چوتھائی بھائی جان کے بھتیجے محمد اسماعیل مرحوم نے ادا کیے۔ اس طرح اس فرض سے بھائی جان اور بھاوج سبکدوش ہو گئے اور داماد کسی حد تک ان کا آسرا بھی بننے لگا۔ لیکن مرحوم کی بیوہ اور بچوں کی نگہداشت کے لیے یہ بھی ربوہ آ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو ان کے ربوہ آنے کے بعد مختلف اوقات میں کچھ اپنے عزیزوں اور کچھ مرکز کے تعاون سے چار بچیوں کی شادیاں کر دیں۔ اب تین بیٹے، ان کی والدہ اور دادا دادی تھے۔ ان کی گندم کی ضرورت پوری کرنے کی توفیق ملی۔ بھائی بوڑھے تھے۔ کئی بار بیمار ہوئے تو ان کو ہسپتال داخل کروانا پڑا۔

بشیر احمد مرحوم کے تین بیٹوں کے نام درج ذیل ہیں۔ آصف بشیر، عاطف بشیر اور یاسر بشیر۔ بڑا بیٹا زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ پہلے گھر سے باہر رہا بعد میں نانبائی کا کام سیکھ کر ربوہ آ گیا۔ چھوٹے دونوں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں میرے دو بیٹے، ایک بیٹی، تین بھانجے بمع اہل وعیال جرمنی جا چکے تھے اور سب میری عزت کرتے تھے۔ ان کے تعاون سے درمیانے بیٹے کو بی کام تک تعلیم دلوائی اور اسے

نوکری مل گئی۔ دوسرے کو بھی ایف اے تک تعلیم دلوائی۔ چھوٹے دونوں اب جرمنی پہنچ چکے ہیں۔ درمیان والے عاطف کی وہاں میرے بڑے بیٹے نے شادی بھی کر دی ہے۔ بشیر مرحوم کا بڑا بیٹا جب نانبائی کا کام سیکھ کر ربوہ آ گیا تو اسے مدرسۃ الظفر کے ہوسٹل میں باورچی کا کام مل گیا۔ اس کی شادی بھی کر دی۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ بھائی اور بھاوج دونوں وفات پا چکے ہیں۔ بچوں کی والدہ زندہ ہے اور بیوت الحمد میں رہ رہی ہے۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر ان کی مدد کی توفیق دی۔

زندگی کے مختلف مراحل میں مجھے اس کار خیر کی ہمیشہ توفیق ملتی رہی ہے۔ باندھی سے 1982 میں میرا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا۔ تو اپنی نسبتی بہن کے دو بیٹوں کو حیدرآباد میں ملازم کروایا۔ ایک کو تو کپڑے بھی اپنے دیے اور کرایہ بھی اس کا خود ادا کیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ بچوں سمیت جرمنی میں ہے اور اپنے تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کر چکا ہے۔

اسی طرح ایک عزیز نوجوان جس نے میٹرک کیا تھا اور بے کار پھر رہا تھا اسے حیدرآباد بلا کر ملازم بھی کروایا اور اسے مزید تعلیم کے حصول کا مشورہ بھی دیا۔ چنانچہ اس نے بی اے کیا اور اسے کینیڈا میں احمدی لڑکی کا رشتہ مل گیا۔ آج وہ کینیڈا میں رہ رہا ہے۔ رحمان آباد باندھی میں میری اہلیہ نے تین چار لڑکیوں کو سلائی کا ہنر سکھا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنایا۔

جب سندھ سے ربوہ منتقل ہوئے تو جیکب آباد سے ایک بیٹی اور داماد بے بسی کی حالت میں آ گئے۔ ان کے دو بچوں ایک بیٹے اور ایک بیٹی کو گھر میں رکھا اور تعلیم دلوانے کی کوشش کی۔ لڑکی تو مڈل سے قبل تعلیم چھوڑ گئی۔ اسے امور خانہ داری کے ہنر سے آراستہ کر کے تقریباً تین لاکھ روپے اپنی گرہ سے خرچ کر کے اس کی شادی کی۔ رہا لڑکا تو اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ مزید بی کام میں داخلہ لیا لیکن بی کام نہ

کر سکا اور نوکری کر لی۔ میں نے اس کی تعلیم ،خوراک اورلباس کے لیے اپنی جیب سے روپیہ خرچ کیا۔اس کی نوکری کے دوران بھی اس کی آمدنی سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اب وہ جرمنی پہنچ گیا ہے۔

محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے بعض مخلص کارکنان

جماعتی امور کی طرف واپس آتے ہیں۔محترم حاجی صاحب کا پہلا گاؤں مکمل طور پر سیم کی نظر ہوگیا۔زمین پانی میں ڈوب گئی۔نیا گاؤں پہلے گاؤں سے کچھ فاصلہ پر ایک بلند جگہ تھی جس میں پانی کوئی نو دس فٹ نیچے تھا وہاں آباد کیا گیا۔اپنے لیے نئے گھر کی بنیاد رکھی جس میں بیس پچیس کمرے، درمیان میں دو بڑے کمرے جن کے درمیان ڈیوڑھی تھی۔ بے تحاشا اخراجات اٹھے لیکن اجتماعات اور جماعتی کاموں میں اخراجات کی آپ نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ ہاں آپ کو بہت مخلص نوجوان کارکنان کی خدمات حاصل تھیں جن کا قدرے ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے۔

ا۔سیٹھ محمد یوسف صاحب

آپ نواب شاہ میں بہت بڑے کریانہ مرچنٹ اور عمدہ قسم کے باسمتی چاولوں کا تھوک و پرچون کا کاروبار کرتے تھے۔ان کے والد خود احمدی ہوئے تھے۔ جماعتی امور میں وقت اوراخراجات دونوں کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ راہِ مولا میں قربان ہونے کے وقت بطور امیر ضلع خدمت کی توفیق پا رہے تھے۔

۲۔سیٹھ محمد اسحٰق صاحب

یوسف صاحب کے بڑے بھائی تھے اور کاروبار مشترکہ تھا۔نوابشاہ میں مہمان نوازی کا انتظام ان کے پاس تھا جسے بخوبی نبھا رہے تھے۔ پانچ وقت نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے کاروبار کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

۳۔ چوہدری محمد اسلم صاحب مرحوم

ان کے دوسرے بھائی تو دیہہ ماکھنڈ میں زمیندار تھے۔ان کی بھی وہاں زمین تھی۔لیکن باندھی شہر میں کریانہ وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے۔ جماعتی کاموں کے لیے ہر وقت مستعد تھے۔شہر کی جماعت کے صدر بھی تھے۔

۴۔ چوہدری عبدالرزاق مرحوم

بھریا روڈ میں کمیشن ایجنٹ اور کاٹن جنز تھے۔ بہت اچھے کاروباری تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مالی فراخی سے بھی نوازا ہوا تھا۔ جماعتی کاموں میں بلا تامل اخراجات کے لیے ہر وقت تیار تھے۔راہِ مولا میں قربان ہونے کے وقت آپ امیر ضلع تھے۔

۵۔ چوہدری عبدالحمید مرحوم

یہ محراب پور میں کمیشن ایجنٹ کا کام کرتے تھے۔ جماعتی اجتماعات میں خدمت کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ بڑے مخلص اور مستعد تھے اور اپنی جماعت کے صدر تھے۔

۶۔ چوہدری محمد دین صاحب

گوٹھ شاہ دین میں ان کی اور ان کے بھائیوں کی زمین تھی۔ یہ بھی ہر جماعتی آواز پر ہمیشہ ہی لبیک کہتے تھے۔

۷۔ چوہدری شاہ محمد صاحب ساکن جماپور

نہایت باہمت، مخلص، مہمان نواز اور جماعتی خدمت کے لیے ہمیشہ چوکس رہتے تھے۔ان کے بھتیجے ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب اور برادرم مختار احمد صاحب نیز چوہدری رستم علی صاحب جو چوہدری شاہ محمد صاحب کے چچا تھے، ان کی اولاد اور دیگر احباب جماعت اجتماعات اور جلسوں میں بھرپور شرکت کرتے۔ اس جماعت کو یہ بھی خصوصیت حاصل تھی کہ یہاں حضرت مولوی عطاء اللہ صاحب (رفیق) حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی موجود تھے جن کا وجود جماعتی پروگرام میں باعث برکت ہوتا تھا۔

بہت دعا گو بزرگ تھے۔

۸۔احباب جماعت احمدیہ قمرآباد

1950ء سے 1960 کی دہائی میں یہ جماعت قائم ہوئی۔ان میں سے سب سے پہلے مکرم ومحترم حاجی قمرالدین صاحب چانڈیو جو علاقہ کے معززترین دوست سمجھے جاتے تھے، نے بیعت کی۔پھران کے بھائی حاجی کریم بخش صاحب اوران کے بیٹے عبدالہادی نے بیعت کی۔

۹۔(ہومیو) ڈاکٹرفقیرمحمد صاحب

یہ باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔یہاں کلینک چلاتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے دست شفا بخش رکھا تھا۔بکثرت مریض آتے۔یہ بھی احمدی ہو گئے۔اسی طرح **قاضی غلام محمد صاحب جو ٹیچر تھے**، انہوں نے اوران کے دو بھائیوں محمد حسن صاحب اور عبدالرحمٰن صاحب نے بھی بیعت کی سعادت پائی۔نہایت مخلصین کی جماعت ہے۔ اب تو یہاں سے متعدد نوجوان زندگیاں وقف کر کے سلسلہ کی خدمت کر رہے ہیں۔ بہرحال جماعتی کاموں اوراجتماعات میں بھرپور شرکت کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص میں برکت دےاوردینی ودنیوی حسنات سے نوازے۔آمین

جماعت احمدیہ ماہی جو بھان (کمال ڈیرو)

حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کے زمانہ میں یہ جماعت قائم ہوئی۔اس میں **حضرت ماسٹرمحمد پریل صاحب** (رفیق) حضرت مسیح موعودعلیہ السلام کا وجود باجود موجود تھا۔آپ کے ایک بیٹے مکرم بشارت احمد صاحب بشیر واقف زندگی تھےاور بیرون ملک خدمات کی سعادت سے بہرہ ور تھے۔بہرحال کچھ عملی طور پرانتظامات میں حصہ لینے والےاور کچھ حاضری بڑھانے والےاوردعائیں کرنے والے بہت سے احباب موجود تھے۔ضلع سکھراورضلع خیرپور سے بھی بہت سے احباب جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔

سکھر سے مکرم و محترم ماسٹر قریشی عبدالرحمٰن صاحب جو بعد میں اضلاع جیکب آباد، شکار پور، سکھر کے امیر بھی بنے، تشریف لایا کرتے تھے۔نہایت خوش الحانی سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اردو اور فارسی کلام پڑھا کرتے تھے۔انصار کی میوزیکل چیئر کا مقابلہ بڑی دلچسپی سے کرایا کرتے تھے۔آپ بھی راہ مولا میں قربان کیے گئے۔

روہڑی

روہڑی میں بھی جماعت قائم تھی۔ یہاں سے بہت سے احباب اجتماعات کی رونق بنتے تھے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔روہڑی سیمنٹ فیکٹری میں بھی جماعت قائم تھی۔ضلع سکھر کی جماعتیں تو پنجاب و سندھ کے بارڈر تک موجود تھیں۔مثلاً کموشہید کی جماعت اگرچہ مختصر سی تھی لیکن قریباً سندھ کی حدود کے آخر پر تھی۔ چوہدری مقبول احمد صاحب یہاں صدر اور زمیندار تھے۔ڈاہر کی اور میر پور ماتھیلو کی کھاد فیکٹریوں میں بھی جماعتیں قائم تھیں۔ان تمام جماعتوں کے احباب جلسوں اور اجتماعات میں شمولیت سے رونق بڑھاتے تھے۔

ارشد کی بیعت

ایک سال جلسہ سالانہ سے واپس ہیڈ کوارٹر گیا تو جماعت اسلامی باندھی کے امیر کے بھانجے نے بیعت کر لی۔ میں نے امیر کو کہا آپ کا ایک عزیز ہم نے چھین لیا ہے۔ پوچھا کون؟ میں نے کہا ارشد۔ بڑے تعجب سے پوچھا ارشد نے بیعت کر لی؟ میں نے کہا ہاں کر لی۔ اس پر کہنے لگا وہ ہٹ جائے گا۔ ابھی اس نے دوسری طرف والا معاملہ نہیں دیکھا۔ میں نے کہا کیوں اس کے ساتھ وہ معاملہ کرو گے جو مکہ کے کفار مسلمان ہونے والوں کے ساتھ کرتے تھے۔تو خاموش ہو گیا۔ میں باندھی شہر سے اپنے گھر کو جا رہا تھا کہ اتفاقاً مجھے ارشد مل گیا۔ میں نے محمد حنیف امیر جماعت

اسلامی والا واقعہ اسے بتایا۔ کہنے لگا مولوی صاحب میں نے حضرت مرزا صاحب کی کتابیں قرآن شریف کے ساتھ ملا ملا کر پڑھی ہیں۔ مجھے آپؑ کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس واقعہ کے بعد ارشد کے دوسرے بھائی بھی جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس کا ایک بھائی پنجاب چک نمبر 30/11L میں سیکرٹری مال تھا۔ اسے پتہ چلا کہ میں اب وقف جدید میں معلمین کو پڑھاتا ہوں تو ملنے کے لیے آیا اور ارشد کے متعلق بھی بتایا کہ وہ احمدیت پر مضبوطی سے قائم ہے۔ پس اس نشہ کو کوئی ترشی نہیں اتار سکتی۔ موت تک قائم رہتا ہے۔

ماسٹر سکندر میمن کی بیعت

ماسٹر سکندر میمن دریا خان مری میں سکول ٹیچر تھا، احمدی ہو گیا۔ دریا خان مری ضلع نواب شاہ اب ضلع نوشہرو فیروز سندھ میں مین لائن کوٹ لالو سٹیشن کے پاس ہے۔ یہاں دو تین اور احمدی بھی تھے۔ انہوں نے مل کر ایک گھر میں نماز با جماعت ادا کرنا شروع کر دی اور (نداء) بھی دینے لگے۔ غیر احمدی احباب کو اشتعال آیا اور

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

والا معاملہ ہو گیا۔

شہر والے پولیس سٹیشن چلے گئے۔ تھانے دار نے احمدی احباب کو بازار میں طلب کر لیا۔ میں بھی وہاں تھا۔ مخالفین نے کہا یہ مسلمان نہیں ہیں۔ اس لیے اذان نہیں دے سکتے۔ میں نے تھانیدار صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ یہاں سے اگر سو بھیل (ہندوؤں کی ایک ذات) جمع ہو جائیں اور ایک مسلمان کو پکڑ کر کہیں کہ تو بھی بھیل ہے تو کیا وہ مان لے گا۔ تھانیدار نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا کہ اگر

سومسلمان اکٹھے ہوکرایک ہندو کو کہیں کہ تو مسلمان ہے تو کیا وہ مان لے گا۔ جب ہم اپنے آپ کو (مومن) کہتے ہیں تو یہ کون ہیں ہمیں غیر (مومن) کہنے والے اور ساتھ ہی اکبرالٰہ آبادی کا شعر بھی تھانیدار کو سنا دیا۔ وہ تو کھسیانہ سا ہوگیا اور ہم سے حفظ امن کے پروانہ پر دستخط کروا کر لے گیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس سارے معاملہ کی پشت پر کون ہے۔ گوٹھ امام بخش کے احمدیوں کا ایک غیر احمدی رشتہ دار اس تحریک کو لیڈ کر رہا تھا۔ چنانچہ وہاں غلام نبی ڈاہری صاحب کا اثر و رسوخ تھا۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب ان سے ملے تو اس نے لوگوں کو پُرامن رہنے اور مخالفت پر مائل نہ ہونے پر مائل کرلیا۔

دریا خان شہر میں دعوت الی اللہ کی ایک نشست

میں دریا خان کی مختصر سی جماعت کے دورہ پر تھا کہ سیٹھ محمد صادق صاحب نے اپنے ایک دوسرے کاروباری سیٹھ کو گفتگو کی دعوت دے دی۔ اس نے کہا یہاں آجائیں۔ چنانچہ وہاں پہلے سے ایک مولوی کو بلا لیا گیا تھا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مرزا صاحب کا حیات مسیحؑ کے بارہ میں وہی عقیدہ تھا جو ہمارا ہے۔ میں نے عرض کیا وہ دعویٰ سے پہلے تھا۔ درمیان میں کوئی اور گفتگو ہوئی جو اَب یاد نہیں رہی تو مولوی صاحب کہنے لگے آپ نے میرا اشکال حل نہیں کیا۔ میں نے کہا مولوی صاحب قرآن مجید میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى

اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

اس اشکال کو حل کریں۔ مولوی صاحب کوئی جواب نہ دے سکے۔ چنانچہ وہ سیٹھ جس نے ہمیں دعوت دی تھی کہنے لگا مولوی صاحب ان کا جواب مسئلوں سے نہیں

ٹکوسلوں سے دیا جاسکتا ہے وہ میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔اس پر بات ختم ہوگئی۔

غیر از جماعت خاتون کی خواب

ایک دن گھر میں میری اہلیہ صبح صبح کام کاج میں مصروف تھیں کہ گاؤں کی ایک خاتون خورشید بی بی آکر میری اہلیہ سے کہنے لگی کہ میری بہو کے بچے نہیں بچتے اور مجھے خواب آئی ہے کہ میری بہو کی دوائی آپ کے پاس ہے۔ میری اہلیہ نے کہا کہ آپ لوگوں کو یقین نہیں۔ کہنے لگی مجھے یقین ہے۔ چنانچہ اسے ربوہ سے دوائی ''حب اٹھرا'' منگوا کر دی گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی بہو کے ہاں صحتمند بچے پیدا ہونے لگے اور ہم نے انہیں ترقی کرتے ہوئے دیکھا۔

تہجد میں کوتاہی اور ایک معصومانہ سوال

ایک دفعہ میں کچھ عرصہ تہجد کی ادائیگی سے قاصر رہا۔ایک دن میری دوسری بیٹی بڑی معصومیت سے کہنے لگی ابا جان آپ رات کو اٹھ کر جو نماز پڑھتے تھے وہ اب کیوں نہیں پڑھتے۔ مجھے اس کوتاہی پر سخت افسوس ہوا اور اس کا تدارک بھی کیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بچے ہمارے رات کے اعمال کے بھی نگران ہیں۔اس میں قارئین کے لیے ایک سبق بھی ہے۔

اچھی تربیت اولاد کے ثمرات

اپنے بچوں کو حسن اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے نہ صرف فکر مند رہا بلکہ ان کی تربیت بھی کی۔ ایک دن میں باندھی شہر میں ایک سائیکل مرمت کرنے والے کی دکان پر گیا۔اس کا نام صوبہ تھا۔اس نے کہا مولوی صاحب آپ کا بیٹا آتا ہے تو سب

سے پہلے وہ مجھ سے کام کروالیتا ہے۔متعدد گاہک کہہ رہے ہوتے ہیں اوصوبے میری سائیکل ٹھیک کر،اومستری میرا کام کر۔آپ کا بیٹا کہتا ہے چچا جان ذرہ میری سائیکل ٹھیک کر دیں تو مجھے بڑی شرم آتی ہے اور میں سب سے پہلے اس کا کام کر کے اسے فارغ کر دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کتنے ادب سے کام کے لیے کہتا ہے۔

دعوت الی اللہ

ایک دفعہ ایک مولوی فاضل عابد شاہ نام محترم حاجی صاحب سے کسی کام کے سلسلہ میں ملنے کے لیے آئے اور گفتگو شروع ہوگئی۔ کہنے لگے آپ مرزا صاحب کو کیا مانتے ہیں۔عرض کیا امام مھدی اور مسیح موعود مانتے ہیں۔شاہ صاحب کہنے لگے میرا ایمان ہے کہ امام مھدی آئے گا تو خانہ کعبہ میں کھڑے ہوکر ساری دنیا کو عربی زبان میں پکارے گا اور ساری دنیا سمجھ جائے گی کہ یہ امام مھدی کی آواز ہے۔ میں نے عرض کیا جو نہ مانے گا؟ فرمانے لگے اسے تلوار کے زور سے منوائے گا۔ میں نے کہا شاہ صاحب یہ ظلم ہے۔ کہنے لگے کیوں؟ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو تلوار اٹھائی تھی۔ میں نے عرض کیا شاہ صاحب! یہ آپ کا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ناپاک حملہ ہے۔کیا قرآن مجید عربی زبان میں نہیں؟ اگر ہے تو کیا ساری دنیا نے اسے سمجھ لیا؟ نیز کیا مھدی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑے ہوں گے کہ ان کو فی الفور ساری دنیا والے مان لیں گے۔ جبکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اب تک نہیں مانا۔ اور آپ نے کہا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تلوار اٹھائی تھی۔ کیا آپ کے ساتھ فتح کا پہلے دن سے وعدہ نہیں تھا۔ پھر آپ تیرہ سال تک مکہ میں کیوں مظالم برداشت کرتے رہے اور تلوار نہ اٹھائی۔آخر وہ علاقہ چھوڑ کر کئی سومیل دور مدینہ تشریف لے گئے۔آپ کہتے ہیں کہ مہدی تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کرے گا۔حضور شاہ

صاحب میرے گھر میں میری بندوق پڑی ہے۔اس میں کارتوس بھر کر آپ کی چھاتی پر رکھوں کہ آپ احمدی ہوتے ہیں یا نہیں تو کیا یہ ظلم نہیں ہوگا۔اگر ظلم ہے تو بندوق کی جگہ تلوار رکھ دینے سے ظلم ہٹ جاتا ہے کیا؟اس پر وہ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ علماءسوء نے لوگوں کی عقلوں پر بھی دبیز پردے ڈال دیے ہیں۔اللہ رحم کرے۔

نواب شاہ اور خیر پور دونوں ضلعوں کی جماعتیں میرے نواب شاہ آنے کے وقت میرے حلقہ تربیت میں تھیں۔پھر قریباً تین سال بعد حلقہ میں دو مربی ہو گئے اور مکرم مولانا نصر اللہ خان صاحب کا ہیڈ کوارٹر نوابشاہ مقرر ہوا۔ساری جماعتوں کو دو حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ریلوے لائن کے قریب والی جماعتیں خاکسار کے حلقہ میں تھیں اور نیشنل ہائی وے کے قریب والی جماعتیں بشمول نوابشاہ محترم مولانا نصر اللہ خان صاحب کے حلقہ میں تھیں۔

ضلع وار امارتوں کا قیام

حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے ڈویژنل امیر منتخب ہوتے ہی ایک سال پورے ڈویژن کی جماعتوں کا حلقہ کے مربیان اور مکرم مولانا غلام احمد فرخ صاحب کو ہمراہ لے کر تفصیلی دورہ کیا اور ہر جماعت کے متعلق معلومات حاصل کیں اور کہنے لگے یہ تو بہت بڑا کام ہے۔میں اب عمر کے لحاظ سے اور اپنے زمیندارانہ مشاغل کے لحاظ سے حقیقی طور پر جماعتی امور کو بخوبی انجام نہیں دے سکوں گا۔یہ بات حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی عرض کر دی اور ساتھ ہی ضلع وار امارت کے قیام کی درخواست کی۔حضورؒ نے تجویز بنا کر بھیجنے کا حکم دیا۔اس پر خیر پور الگ امارت کے قیام کی تجویز پیش کی گئی اور لاڑکانہ میں الگ امارت کی۔جبکہ سکھر،جیکب آباد بعد میں شکار پور اضلاع کی ایک امارت قائم کرنے کی تجویز حضور کی خدمت میں پیش کرنے کی تجویز

پیش کر دی گئی۔حضور رحمہ اللہ نے اس کی منظوری دے دی۔ چنانچہ مرکز کی منظوری سے تینوں حلقوں میں امارت کا انتخاب کروایا گیا۔

ضلع لاڑکانہ میں مکرم علی انور صاحب ابڑو امیر ضلع منتخب ہوئے۔

ضلع خیر پور میں مکرم ومحترم چوہدری غلام محمد صاحب چیمہ گوٹھ غلام محمد نز درانی پور امیر ضلع منتخب ہوئے۔

اضلاع سکھر، جیکب آباد اور شکار پور کے محترم قریشی عبدالرحمٰن صاحب ساکن منزل گاہ سکھر امیر منتخب ہوئے اور ضلع وار نظام نے کام شروع کر دیا۔

نیز ضلع نوابشاہ میں بھی حلقہ وار امارت قائم کی گئی۔ان کا بھی انتخاب کروایا گیا۔ لیکن یہ نظام زیادہ دیر نہ چل سکا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک حلقہ میں حاجی قمرالدین صاحب اور دوسرے حلقہ میں مکرم حکیم محمد موہل صاحب ساکن گوٹھ ماہی جو بھان (کمال ڈیرو) امیر منتخب ہوئے تھے اور ایک حلقہ حاجی صاحب کے زیر امارت تھا۔اب قمر آباد میں الگ مربی صاحب کا تقرر کر دیا گیا تھا۔اور حلقے کافی محدود ہو گئے تھے لیکن اجتماعات اور جلسے بھر پور شان وشوکت سے ہوتے تھے۔احباب بڑی بڑی دور سے سارے ڈویژن سے تشریف لاتے۔انتظامات میں حاجی صاحب محترم ہر طرح کی سہولت مہیا کرتے لیکن کسی نقص اور کوتاہی کو برداشت نہ کرتے۔ مجھے بھی تین دن رات مہمانوں کی ہر طرح خدمت اور آرام کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنا ہوتا تھا اور میرے اہل خانہ بھی مہمانوں کی خدمت میں مستعد رہتے۔

میرا حیدر آباد تبادلہ

1982ء میں میرا تبادلہ نوابشاہ سے حیدر آباد کر دیا گیا۔ میں نے درخواست کی کہ بچوں کے تعلیمی سال تک مہلت دی جائے۔ ادھر حیدر آباد سے بھی ایسی ہی

درخواست کی گئی۔ میرا خیال ہے کہ بعض دوسری جگہوں سے بھی مہلت کی درخواست کی گئی۔ لیکن جب حضور انور کی خدمت میں نظارت اصلاح و ارشاد کی طرف سے مہلت کے لیے عرضداشت پیش کی گئی تو حضور نے فرمایا یہ تبادلہ کرتے وقت سوچنا تھا اب اس پر عمل کریں۔ چنانچہ مجھے تار دیا گیا کہ فوراً حیدرآباد پہنچو۔ لیکن وہ تار کہیں راستے میں ہی رہ گیا اور مجھے نہ ملا۔ اتنے میں بھریا روڈ سے ٹیلیفون آیا کہ محترم مولانا عبدالمالک خان صاحب ناظر اصلاح و ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے فوراً بھریا روڈ ملے۔ میرے پاس ففٹی موٹر سائیکل تھی۔ اس پر سوار ہوا اور بھریا روڈ پہنچ گیا۔ مولانا عبدالمالک خان صاحب اور مولانا غلام باری سیف صاحب جماعتوں کے دورہ کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں نے کہا اچانک آپ آ گئے۔ کوئی اطلاع ہی کی ہوتی۔ فرمانے لگے میں نے تو آپ کو حیدرآباد بھیج دیا تھا اور فوراً جانے کے لیے تار دیا تھا۔ عرض کیا تار نہیں ملا۔ فرمانے لگے اب ہمارے ساتھ دورہ تو کرو۔ پروگرام کچھ اس طرح کا تھا کہ کرونڈی والوں نے جلسہ کے لیے مرکز کو لکھا تھا لیکن کرونڈی کا جلسہ ابھی تین روز بعد تھا۔ ادھر نوابشاہ میں بھی جلسہ تھا وہاں بھی خطاب کرنا تھا اور وہ بھی ایک روز بعد میں تھا۔ میں نے عرض کیا کہ سردست آپ باندھی میرے ہمراہ چلیں۔ کل آپ کو بروقت نوابشاہ جلسہ میں پہنچانا میری ذمہ داری اور وہاں سے کرونڈی بھی میں لے کر آؤں گا۔ وہ مان گئے۔ اب بھریا روڈ سے باندھی تک ٹرانسپورٹ کے لیے کرونڈی سے ایک دوست کی ڈاٹسن آئی ہوئی تھی، وہ میرا عزیز تھا۔ اس کو میں نے فون پر بتا دیا کہ اس طرح مجھے آپ کی گاڑی کی ضرورت ہے اور تیل میں ڈلوا دوں گا۔ اس نے بھی بخوشی اجازت دے دی۔ چنانچہ رحمان آباد باندھی حاجی صاحب کی قیام گاہ پر آ گئے۔ حاجی صاحب بھی بڑے خوش ہوئے۔ مہمانوں نے رات قیام کیا۔ صبح ناشتہ کے بعد ان کو نئی گاڑی بیاسی ماڈل میں سوار کرا کر نوابشاہ لے گیا۔ جلسہ کے بعد

واپس رحمان آباد تشریف لے آئے۔ اب روزانہ بعد دوپہر مع ڈرائیور گاڑی ہمیں مل جاتی اور مطلوبہ جماعتوں کا دورہ کر کے واپس رحمان آباد آجاتے اور جس جماعت میں بھی جاتے لوگ شکایت کرتے کہ مرکز نے ہم سے مربی نذیر احمد رہان کو لے لیا ہے۔ قریباً بارہ روز دورہ کے بعد محترم ناظر صاحب واپس تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے فرما گئے کہ ابھی یہاں ہی رہو میں حضور کی خدمت میں تبادلہ کینسل کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت مولانا نے حضور انور رحمہ اللہ کی خدمت میں تبادلہ کینسل کرنے کی درخواست دی تو حضور نے اسے منظور نہ فرمایا اور میں حیدرآباد اکیلا ہی چلا گیا۔ بچے یہاں ہی رہے۔ محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب سے اتنے گہرے تعلقات ہو گئے تھے کہ فرمانے لگے آپ بچوں کو یہاں رکھیں گے تو میرے پاس آتے جاتے رہیں گے اور میں آپ سے مشورے کر سکوں گا۔ بچوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔ میں نے کہا کہ آنے والے مربی صاحب کو مکان کی ضرورت ہو گی۔ کہنے لگے مکان تو میرا ذاتی ہے۔ اس جیسا مکان مربی صاحب کو دے دوں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ دوسری طرف حیدرآباد کے مربی صاحب کے لیے مکان خالی کرنا بڑا مشکل تھا۔ ان کی بیٹی ماسٹر کے فائنل سال میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم مکان خالی کر کے ہال کی دوسری طرف رہائش اختیار کر لیتے ہیں تا کہ بچی کا سال سہولت سے گزر سکے اور اس کی تعلیم مکمل ہو سکے۔ میں نے عرض کیا کہ میں دوسرے حصہ میں رہائش اختیار کر لیتا ہوں آپ کے اہل خانہ اس مکان میں رہ رہے ہیں ان کو تکلیف ہو گی۔ چنانچہ وہ ایک سال تک اس مکان میں رہے۔ سال بعد جب انہوں نے اپنی سہولت کے ساتھ مکان خالی کیا تو میں نے اس میں رہائش رکھی۔ جس پر مربی صاحب اور ان کے اہل و عیال بہت خوش تھے۔ الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خاطر یہ ادنیٰ سی قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

حیدرآباد کے دوستوں نے میرے ساتھ ابتداءً ہی بڑا اچھا سلوک کیا۔مکرم میر نور احمد صاحب تالپور امیر صاحب مقامی اور امیر ضلع تھے۔رانا محمد اسداللہ صاحب پرانے واقف کار تھے۔اسی طرح بابو عبدالغفار صاحب مرحوم نے بھی بہت عمدہ تعاون کیا۔ (حیدرآباد ضلع اور سندھ کے دوسرے اضلاع کے رہنے والے بابو عبدالغفار صاحب مرحوم سے خوب واقف ہیں) مربی محمد اشرف ناصر صاحب چونکہ دل کے مریض تھے اس لیے ان کو کراچی تبدیل کر دیا گیا اور پھر وہ کراچی میں بہت خوش بھی رہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی وفات اور بیعت خلافت رابعہ

مجھے حیدرآباد گئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔سخت گرمی کا موسم تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی طبیعت بہت خراب تھی۔آپ اسلام آباد میں زیر علاج تھے۔رات کو اطلاع ملی کہ حضور کا اسلام آباد میں وصال ہو گیا ہے۔

جیسے ہی احباب کو خبر ملی (بیت الذکر) آنا شروع ہو گئے اور فوری طور پر ربوہ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک ویگن کرایہ پر لی گئی۔قریباً صبح چار بجے سے قبل ویگن بھر کر ربوہ روانگی ہوئی۔میں بھی ویگن میں سوار تھا۔راستہ میں شدید گرمی تھی۔ بہرحال رات گئے ربوہ پہنچے۔اب یہ تو یاد نہیں کہ قیام کہاں کیا تھا۔بہرحال صبح صبح حضور کے جسد خاکی کے ربوہ پہنچنے پر زیارت کی اور پھر انتخاب خلافت کے فوراً بعد بیعت خلافت رابعہ کی۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کا سرتاجِ خلافت سے مزین کیا اور قافلۂ احمدیت کو پھر سالارِ کارواں میسر آیا اور کارواں غلبۂ (دینِ حق) کی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔الحمدللہ

حضور سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی اور پھر اسی ویگن میں سندھ روانہ ہو گئے۔راستہ میں شدید گرمی تھی۔سکھر روہڑی پہنچ کر کچھ دیر سوئی گیس کے آفس میں

چوہدری رشید احمد صاحب نے وزٹ کیا اور میر نور احمد صاحب نے بحیثیت لیبر ڈائریکٹر وزٹ کیا۔ یہاں سے چل کر مورو ایک مِڈ وے ایئر کنڈیشننگ ہوٹل میں تھوڑی دیر ٹھہرے۔ میں وہاں سے امیر صاحب سے اجازت لے کر باندھی چلا گیا اور اہل خانہ کو خلافت رابعہ کے قیام کی خبر دی اور دوبارہ حیدرآباد چلا گیا۔ عزیزم رفیق احمد ان دنوں حیدرآباد ایک ٹیکنیکل ادارے میں پڑھ رہا تھا اور اسے یرقان ہو گیا۔

مولانا عبدالمالک خان صاحب کے متعلق ایک خواب

انہی دنوں ایک خواب دیکھا کہ ایک میز کے گرد چار کرسیاں ہیں۔ جن کی سیٹیں بھی بید کی بجائے لکڑی کی ہیں اور سامنے ایک آفس میز ہے جس پر سفید لیکن قدرے میلا کپڑا پڑا ہے۔ چار آدمی کرسیوں پر بیٹھے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے مولانا عبدالمالک صاحب کی عمر ایک ہفتہ باقی ہے اور آنکھ کھل گئی۔ پریشان ہوا کہ بیمار تو رفیق احمد ہے اور خواب یہ آرہی ہے۔ اتنے میں میرا داماد خالد مجھے پوچھتا ہے کہ خالو جان آپ پریشان کیوں ہیں۔ میں نے اس کو خواب سنایا اور صدقہ بھی دیا۔ چنانچہ ٹھیک ایک ہفتہ بعد مولانا کے حادثۂ جانکاہ کی خبر مل گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

میرا بلڈ پریشر اور دیگر عوارض

انہی ایام میں میرا بلڈ پریشر جو بہت عرصہ سے میرے ساتھ تھا، بہت بڑھ گیا اور 190/130 تک جا پہنچا۔ چنانچہ حیدرآباد میں ایک ہارٹ سپیشلسٹ چوہدری علی محمد صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے ادویہ تجویز کیں اور باقاعدگی سے کھانے کو کہا۔ ادویہ کا استعمال شروع کر دیا اور نفسیاتی طور پر بھی اپنے آپ کو مریض سمجھنا شروع کر دیا۔ جس سے کام پر برا اثر پڑا۔ تاہم ضلع کی بعض جماعتوں کا دورہ بھی کیا۔ چنانچہ ٹنڈو جام، بشیر

آباد، سنجر چانگ وغیرہ جماعتوں کے علاوہ ٹنڈو غلام علی اور بعض اور جماعتوں کا دورہ کیا جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں۔

بلڈ پریشر نے مجھے ذہنی طور پر بھی متاثر کیا اور میری قوت کار پر بھی یہ اثر انداز ہونا شروع ہو گیا۔ کچھ غذائی پابندیاں، کچھ دوائی کی باقاعدگی کی فکر۔ بہرحال 1982ء سے بلڈ پریشر کی دوائی کا باقاعدہ استعمال شروع کیا اور روزانہ ناشتہ سے قبل دوا سامنے رکھوا کر ناشتہ کرتا اور یہ عمل 2009ء تک باقاعدگی سے جاری رہا اس وقت تک اس میں شاید ہی کوئی ناغہ ہوا۔ کیونکہ 2009ء میں سینہ میں درد ہوا تو طاہر ہارٹ انسٹیٹیوٹ میں داخل ہو کر معائنہ کروایا۔ انجیو گرافی تجویز ہوئی۔ انجیو گرافی کے عمل سے گزرا تو بتایا کہ اب آپ کی انجیو پلاسٹی ہو گی۔ چنانچہ انجیو پلاسٹی میں ایک سٹنٹ ڈالا گیا۔ ایک شریان کھول دی گئی اور ایک قدرتاً چالو ہو گئی۔ لیکن ایک شریان کو بند ہی رہنے دیا گیا اور آج تک اسی طرح چل رہا ہے۔ انجیو پلاسٹی کے بعد دو سال تک مختلف اوقات میں مختلف تکالیف ہو جاتی رہیں۔ کبھی نبض کی حرکت زیادہ تیز ہو جاتی، کبھی دل کی دھڑکن بے قاعدہ ہو جاتی جس کا وقتاً فوقتاً طاہر ہارٹ میں علاج ہو جاتا رہا۔ اب بھی کئی سال سے باقاعدگی سے دونوں وقت کھانے سے پہلے اور بعد جو ادویہ کھانی ہوتی ہیں ان میں ذرہ بھی غفلت نہیں کرتا۔

اب تو شوگر کا مرض بھی لاحق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے دوائی سے ہی ضبط میں ہے۔ انسولین نہیں لینی پڑتی۔ شوگر کے بد اثرات سے بھی نظر وغیرہ اللہ کے فضل سے محفوظ ہے۔ بلڈ پریشر بھی بالکل کنٹرول میں ہے لیکن آرتھرائٹس کے باعث پیدل چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ سائیکل سے بھی تکلیف ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اڑھائی سال تک گاڑی کی سہولت میسر رہی لیکن آفاق احمد جو میرا نواسہ ہے اس کے جرمنی جانے کے باعث گاڑی فروخت کر دی اور اب نقل وحرکت کے لیے بہت محتاج ہے۔

میرے بعض خواب

الہام کا مزہ تو قادیان میں 1947ء میں چکھ چکا تھا۔ رؤیاءِ صالحہ صادقہ کی نعمت سے بھی اللہ تعالیٰ نے سرفراز کیا۔ متعدد خواب اللہ تعالیٰ کے فضل سے دیکھے ان میں سے چند ایک تحریر کرتا ہوں۔

انبیاء کرام کی بعثت کا زمانہ روحانیت کے انتشار کا زمانہ ہوتا ہے اور ہر کس و ناکس اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس روحانی انتشار سے مستفید ہوتا ہے۔ آغاز جوانی میں جب سولہ سال کی عمر میں قادیان گیا ہوں، حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور (رفقاء) حضرت مسیح موعودؑ کی انتشار روحانیت کے باعث قادیان کی فضاؤں میں مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے حصہ عطا فرمایا۔

قادیان مدرسہ احمدیہ میں داخل ہوا تو خواب میں دیکھا میری بھینس مرگئی ہے اور اسے گھر سے گھسیٹ کر باہر لے جایا جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر کی گئی تو سوتیلی والدہ شدید بیمار ہو کر پھر صحتیاب ہو گئیں۔

اسی طرح قادیان کے ایامِ قیام میں خواب میں دیکھا کہ (بیتِ) نور کے پاس برگد کے درخت کے نیچے کچھ انبیاء علیہم السلام صف بستہ ہیں۔ لیکن صف کی شکل انگریزی حرف L کی شکل میں ہے اور پہلی صف کے درمیان حضرت مسیح موعود علیہ السلام موجود ہیں۔

مولانا عبدالمالک صاحب کی عمر کے متعلق خواب کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جو بعینہٖ پورا ہوا۔

میری پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد اہلیہ کو اندرونی تکلیف ہو گئی۔ کراچی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے علاج کیا تو اللہ تعالیٰ نے صحت دے دی۔ بیوی کرونڈی

تھی۔ میں چھٹیاں گزار کر واپس آیا تو بیوی کو کراچی معائنہ کے لیے لے جایا گیا۔ ادھر میں لاہور میں پڑھتا تھا۔ میں نے خواب میں اسے امید سے دیکھا تو اہلیہ کے خط سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ خواب میں اہلیہ کے سر پر دوپٹہ دیکھا تھا۔ چنانچہ بیٹی پیدا ہوئی۔

ایام قیام لاہور میں محترم شیخ ریاض محمود صاحب سوداگر چرم سے خاصی دوستی تھی۔ لاہور سے آنے کے کچھ عرصہ بعد ان کی شادی ہوئی۔ ایک دن خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ ایک دو روز بعد الفضل میں ان کے بیٹے کی پیدائش کی خبر شائع ہوگئی۔

رفیق احمد میرے بڑے بیٹے کی شادی کے بعد اس کی بیوی امید سے تھی اس نے لکھا ابا جان دعا کریں اللہ تعالیٰ بیٹا دے۔ میں نے خواب میں بیٹی کی پیدائش دیکھی، اسے لکھ دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بیٹی دی۔ اسی طرح دو سال بعد اس کی بیوی پھر امید سے تھیں۔ اس نے پھر خط لکھا دعا کریں بیٹا ہو۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ بیٹی ہوئی ہے۔ اسے قبل از وقت خط لکھ دیا۔ اس وقت میں تو باہر فیلڈ میں تھا۔ وہ ربوہ میں تھا۔ باہر سے گھر آیا۔ دروازے کے اندر میرا خط پڑا ملا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں پھر بیٹی کی پیدائش کی خبر تھی۔ خط اپنی والدہ کی گود میں پھینک کر کہنے لگا (اِک تے ابا جی دیاں خواباں نے ماریا)۔ چنانچہ دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔

میں ملتان میں مربی تھا۔ رفیق احمد جرمنی جا چکا تھا۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ میں نے خواب میں اس کی بیوی کو امید سے دیکھا اور خواب میں بیٹا پیدا ہونے کی خبر تھی۔ اسے بتا دیا گیا کہ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیٹا پیدا ہوگا۔ سو الحمد للہ بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انیق احمد ہے اور واقف زندگی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مربی بن چکا ہے۔

مولانا عبدالباسط صاحب شاہد مدرسہ احمدیہ میں تعلیم کی ابتداء سے خاکسار کے دوست ہیں۔ ساری زندگی گہرے مراسم رہے ہیں۔ یہ حیدر آباد میں تھے اور میں

باندھی میں تھا۔ میں حیدرآباد کسی کام سے آیا۔ رات ان کے ہاں قیام تھا۔ یہ اس وقت بیرون پاکستان فریضۂ (دعوت الی اللہ) ادا کر کے کچھ عرصہ پہلے ہی آئے تھے۔ دوستانہ مذاق میں ان سے خاندان میں کسی اضافے کی بنیاد کا دریافت کیا۔ رات ان کی بیٹھک میں سویا۔ خواب میں دیکھا کہ ان کی اہلیہ صاحبہ امید سے ہیں اور سر ننگا ہے۔ نماز کے وقت ملاقات میں عرض کیا کہ آپ تو ٹال رہے تھے اب اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے تو اقرار کر لیا۔ یہ بھی ان کو بتا دیا کہ اب انشاء اللہ بیٹا پیدا ہوگا۔ چنانچہ اپنے وقت پر آصف باسط جو آج کل ایم ٹی اے کا وائس چیئر مین ہے اور قبل ازیں پروگرام ''راہِ ھدٰی'' کی میزبانی کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہے، پیدا ہوا تھا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باعث پاکستانی روپے کی قیمت انتہائی کم ہونے کے باعث مہنگائی کا مغربی پاکستان میں سیلاب آ گیا۔ الاؤنس ابھی بھی حسبِ سابق تھے۔ اہل خانہ نے شکایت شروع کر دی کہ اب گزر نہیں ہوتی۔ میں نے گھر والوں کو کہا کہ گندم اور آٹا موجود ہے۔ لکڑی بھی موجود ہے۔ روٹی پکا کر نمک اور مرچ کے ساتھ بھی کھائی جا سکتی ہے۔ گاؤں میں ایسے غریب بھی ہیں جن کو بعض اوقات ایک وقت بھی کھانے کو نہیں ملتا۔ پس جو ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

کچھ دن کے بعد خواب میں ایک خاتون کو اپنا منہ چومتے دیکھا۔ گھبرا کر بیدار ہوا اور سوچا مجھے یہ خواب کیوں آیا۔ تھوڑی دیر بعد سو گیا تو بتایا گیا کہ اس کی تعبیر دنیا ملنی ہے۔ چنانچہ میں نے اہل خانہ کو بتایا کہ آج پیسے ملیں گے کہنے لگے کہاں سے۔ میں نے کہا یہ مجھے بھی پتہ نہیں۔ کچھ دیر بعد دو مریض آ گئے۔ ان میں سے ایک کا علاج تین چار دن چلنا تھا۔ اس نے سولہ روپے اور دوسرے مریض نے دس روپے دیے۔ کل چھبیس روپے مل گئے اور میں نے سمجھا خواب پورا ہو گیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ابھی مزید بہت کچھ دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ علاقہ میں وبائی ملیریا پھیل گیا۔ مریض میرے پاس اس

کثرت سے آئے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور اتنے پیسے ملے کہ ہم سات افراد اس سال سندھ سے جلسہ سالانہ میں شامل ہوئے۔ مریضوں سے بہت کم پیسے لیتا تھا۔ بعض اوقات ان کو دودھ وغیرہ کے لیے اپنے پاس سے بھی پیسے دے دیتا تھا اور اب مستقل طور پر مریضوں کی آمدورفت جاری رہتی۔ بعض جو ناشتہ کے وقت صبح صبح آجاتے ان کو اہلیہ محترمہ چائے بھی پلاتی تھیں۔

ایسے ہی ایک سال کرونڈی میں رمضان المبارک گزارنے کا موقع ملا اور اعتکاف کی سعادت بھی ملی۔ ایک رات کو سویا ہوا تھا کہ آیت

وَمَا لِیَ لَا اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَاِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ

زبان پر جاری ہو گئی۔ فوراً اٹھا، وضو کیا اور نوافل ادا کیے۔ الحمدللہ

ان خوابوں کو لکھنے میں سخت تردد تھا لیکن دراصل بتانا یہ مقصود تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے انتشار روحانیت نے میرے جیسے نالائق اور گناہ گار کو بھی اپنے جلو میں لے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر احمدی کو اس کا کم و بیش ضرور تجربہ ہے۔ جو ان لوگوں کے لیے نمونہ ہیں جو مالک الملک خدا کو گونگا بہرہ بت قرار دے کر اہل قبور سے مرادیں مانگنے کے درپے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ جبکہ کتنا ہی مبنی برحقیقت یہ شعر ہے

وہ خدا اب بھی بناتا ہے جسے چاہے کلیم
اب بھی اس سے بولتا ہے جس سے وہ کرتا ہے پیار

اس عاجز نے تو بارہا تجربہ کیا ہے کہ جس چیز کی حقیقی ضرورت ہے لیکن خواہش نہیں کی اس نے محض اپنے فضل سے عطا کر دی۔ پس اے احمدی! اٹھ اور انکسار، تذلل، عاجزی سے اللہ کی بارگاہ میں جبین نیاز جھکا کر دیکھ کہ کیسے کیسے فضل اور نعماء روحانی و جسمانی کا مورد بنتا ہے۔

بیرون پاکستان نہ جانے کا سبب

بعض اوقات یہ سوال سامنے آیا ہے کہ آپ پاکستان سے باہر کس کس ملک میں خدمات سلسلہ بجالا چکے ہیں۔اس سلسلہ میں عرض ہے کہ میں نے اپنی زندگی وقف کی تھی اوراپنے آپ کوسلسلہ کے حوالے کر دیا تھا۔ مجھے بیرون پاکستان بھیجنا سلسلہ کے امور سر انجام دینے والوں کا کام تھا۔ میں نے کبھی بھی انکار نہ کیا نہ سوچا۔اس سلسلہ میں جو کچھ مجھے معلوم ہوسکا وہ یہ ہے کہ میں نے 1964ء سے 1967ءتک سندھی زبان بولنا سیکھ لی تھی اوراس وقت سندھ میں جناب مولانا غلام احمد فرخ صاحب اور میرے سوا سندھی بولنے والا کوئی مربی دستیاب نہیں تھا۔ایک بار معلوم ہوا جب ربوہ میں طبیہ کالج کھلا ہے تو حضرت میر داؤد احمد صاحب نے مجھے یہاں بلانے کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے درخواست کی تھی جو نامنظور کر دی گئی اور فرمایا کہ اسے وہاں رہنے دو۔

اسی طرح ایک موقع پر محترم مولانا عطاء اللہ کلیم صاحب جو سیکرٹری حدیقۃ المبشرین تھے، سے رحمت بازار میں محترم حکیم محمد اسلم فاروقی صاحب کی دکان پر ملاقات ہوئی۔ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب شناسا تھے خود ہی فرمانے لگے رہان صاحب آپ باہر نہ گئے؟ میں نے عرض کیا جناب بات یہ ہے کہ آپ دراز قد تھے اور میرا قد چھوٹا تھا۔آپ جب بھی کسی کو باہر بھیجنے کے لیے انتخاب کرتے آپ کی نظر مجھ سے گزر کر آگے چلی جاتی۔فرمانے لگے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے میں نے دو بار آپ کا نام نظارت اصلاح وارشاد کو پیش کیا ہے مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ ہمارے پاس متبادل سندھی زبان بولنے والا مربی نہیں ہے اس لیے یہ نہیں اور جس کو چاہیں لے لیں۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں کہ نا معلوم بیرون ملک میری کون سی کمزوریاں عیاں ہوکر باعث شرمندگی بنتیں۔اللہ تعالیٰ نے نہ جانے کتنے گناہوں کی ستاری فرما

دی۔ وقف کرنا تھا اور صدق سے نبھانے کی کوشش کرنی تھی، وہ جاری ہے۔

حیدرآباد کے مخلصین

حیدرآباد تبادلہ کے وقت محترم میر نور احمد صاحب تالپور لیبر ڈائریکٹر امیر مقامی حیدرآباد تھے۔ نہایت شریف النفس جماعتی امور سے وسیع واقفیت رکھنے والے مرکز اور اہل مرکز کی بے حد عزت کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ حیدرآباد میں میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا جو بعض اوقات جماعتی خدمات میں حارج ہو جاتا۔ اس کے باوجود ضلع اور شہر کے مختلف حلقوں میں اور جماعتوں میں دورہ کی توفیق ملی جس سے تربیت کے ثمرات مرتب ہوئے۔

بابو عبدالغفار صاحب فوٹو سپیڈ کمپنی رسالہ روڈ حیدرآباد کے مالک تھے اور اپنے فن میں ماہر تھے۔ جماعتی امور میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ مربیان کی دیکھ بھال اور ان کو آرام پہنچانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔ چوہدری نعمت اللہ صاحب اس وقت سے واقف تھے جب میں احمد نگر میں زیر تعلیم تھا اور یہ لائلپور کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ جماعتی امور میں بھرپور تعاون کرنے والے، نہایت نیک، نمازی اور تہجد گزار تھے۔ اچھی خاصی زمینداری بھی رکھتے تھے۔ چندہ جات میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ مجھے ان کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

رانا عطاء اللہ صاحب اسسٹنٹ لیبر ڈائریکٹر تھے اور ہمیشہ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب، چوہدری نعیم احمد صاحب، ڈاکٹر محمود احمد صاحب وٹرنری ڈاکٹر، ماسٹر منصور احمد صاحب اور میجر داؤد احمد کاہلوں صاحب نمایاں مخلصین جماعت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب اور بابو عبدالغفار صاحب کو اللہ تعالیٰ کی راہ

میں جان قربان کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ان کی جانی قربانی کی تفاصیل مختلف جماعتی کتب اور رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

لجنات میں دعوت الی اللہ کے لحاظ سے سرفہرست شاہدہ اخوند صاحبہ تھیں جو ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب اخوند مرحوم کی صاحبزادی اور مکرم ماسٹر محمد اسلم صاحب کی اہلیہ تھیں۔ خاوند بھی شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے اور خود بھی شعبہ تعلیم سے ہی وابستہ تھیں۔ دعوت الی اللہ کے لیے لوگوں کے گھروں میں بھی بے خطر چلی جاتی تھیں۔ میں جب تک حیدرآباد تھا ہفتہ میں دو بار کچھ سندھی احباب کو بلا کر ان کی تواضع بھی کرتیں اور مجھے بلا کر ان سے گفتگو بھی کرواتیں۔ ایک بار مجھے ہمراہ لے کر سہون شریف کے پاس ایک بستی میں دعوت الی اللہ کے لیے گئیں اور ان کو جلسہ سالانہ پر چلنے کی دعوت دی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنی دلیر داعیہ الی اللہ ہیں۔ انگلستان کے جلسوں میں بھی اپنی جمع شدہ پونجی خرچ کر کے شریک ہوتیں۔ پردہ کی بہت پابند اور امور شرعیہ پر عمل پیرا۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر، صحت اور اخلاص میں برکت دے۔ معلوم ہوا ہے کہ لجنہ کے مختلف عہدوں پر شہر اور ضلع میں کام کرتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ آپا ناصرہ صاحبہ زوجہ چوہدری نعمت اللہ صاحب اور آپا ثریا صاحبہ زوجہ چوہدری رشید احمد صاحب انجینئر سوئی گیس بہت فعال کارکنات لجنہ اماء اللہ حیدرآباد شہر تھیں۔ آپا ناصرہ صاحبہ تو اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپا ثریا صاحبہ اور آپا شاہدہ اخوند صاحبہ کی عمر اور صحت اور اخلاص میں بے حد برکت عطا کرے۔ آمین

ہاں مکرمہ و محترمہ بشریٰ داؤد صاحبہ کا ذکر نہ ہو سکا وہ سلسلہ کے لیے ہر قسم کی مالی، وقتی اور دیگر قسم کی قربانیوں کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔ وہ آجکل اپنے میاں میجر ریٹائرڈ چوہدری داؤد احمد صاحب کاہلوں کے ہمراہ کینیڈا میں مقیم ہیں۔ میجر صاحب سے ایک بار ربوہ دفاتر میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔

مکرم ومحترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب صدیقی

محترم ڈاکٹر صاحب ڈویژنل امیر حیدرآباد ڈویژن، ساکن میرپورخاص بڑے دبنگ امیر ڈویژن تھے، تمام سٹیٹس کے معاملات کو سنبھالنے والے بہت پایہ کے آدمی تھے۔ واقفین زندگی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان سے تعارف اور ملاقات میرے حیدرآباد جانے سے قبل ہی کی تھی۔ ایک دفعہ جماعت احمدیہ مہدی آباد اور جماعت احمدیہ گوٹھ عبدالسلام کے کئی مریض جن کو اپنے علاقہ میں علاج کی مشکلات پیش آرہی تھیں مجھے ہمراہ لے کر میرپورخاص محترم ڈاکٹر صاحب سے علاج کروانے کے لیے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام مریضوں کو دیکھا۔ ان کے ضروری ٹیسٹ کروائے اور ادویہ دیں۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب ان مریضوں کے علاج کے اخراجات کیا ہیں؟ بل لے لیں۔ فرمانے لگے **آپ کے ساتھ آئے ہیں ان سے کوئی بل نہیں لینا**۔ گویا مربی کا اتنا احترام کیا کہ مربی کے ساتھ آنے والے احباب سے کوئی فیس اور معائنہ جات لیبارٹری، ایکسرے وغیرہ کی بھی کوئی قیمت نہیں لی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کا دورۂ حیدرآباد و تھرپارکر

مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حیدرآباد اور تھرپارکر میں موجود احمدیہ سٹیٹس کے دورہ پر تشریف لاکر حضور ناصرآباد میں قیام فرما ہوئے تو حیدرآباد سے بھی دو ویگن عورتوں مردوں سے بھر کر حضور کی زیارت کے لیے ناصرآباد پہنچے۔ اغلبًا اسی دورہ میں حضور حیدرآباد بھی تشریف لائے اور مجلس سوال و جواب کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا جس میں حضور نے غیر از جماعت احباب کے بہت سے سوالات کے جوابات عطا

فرمائے اوراسی دورہ میں میر پور خاص میں بھی مجلس سوال و جواب کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا اور بہت سے غیراز جماعت احباب جن میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والےلوگ موجود تھے، نے سوالات کیےاور حضورؒ نے ان کے تشفی بخش جوابات عطا فرمائے۔حضور کوسوالات کے جوابات دینے کی اس قدر مہارت تھی اور علمی لحاظ سے آپ کا مرتبہ اتنا بلند تھا جس کا تصور کرنا مشکل ترین امر ہے۔

اسی مجلس سوال و جواب سے قدرے قبل چوہدری نعمت اللہ صاحب سے دریافت کیا مربی صاحب کا نواب شاہ سے یہاں آ کر دل لگ گیا ہے تو چوہدری صاحب نے جواباً عرض کیا حضور وہ بیمار ہیں۔ کیونکہ میرا بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔کچھ دن ہسپتال میں داخل رہااور چوہدری عظمت اللہ صاحب برادر چوہدری نعمت اللہ صاحب نے بڑی خدمت کی۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔

میرا ضلع بدین کی جماعتوں کا دورہ اور نوابشاہ تبادلہ

انہی ایام میں مرکز سے ضلع بدین کے مربی صاحب کے ہمراہ ضلع بھر کی جماعتوں کا دورہ کرنے کا ارشاد ملا۔ چنانچہ مکرم سمیع اللہ قمر صاحب مربی سلسلہ احمدیہ اور خاکسار نے بدین، گولارچی، ٹنڈو باگو، اور خدا آباد کی دور دراز جماعتوں کا دورہ کیا۔الحمدللہ۔ٹنڈو باگو میں مکرم کرنل ریٹائرڈ محمد حیات قیصرانی صاحب سے اچانک ملاقات ہوگئی جو وہاں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں مقیم تھے۔فرقان فورس کی کچھ یادیں تازہ ہوگئیں۔عظیم، جری اور بہادر شخص تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ میں آباد ہو گئے۔ایک رات تین چوروں نے دارالصدر میں اندھیر نگری مچائی تو کرنل صاحب اور صالح محمد صاحب سابق باڈی گارڈ حضور نے آگے بڑھ کر ان کو للکارا اور ایک چور تو جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

فروری1984ء میں میرا تبادلہ حیدر آباد سے نوابشاہ شہر ہو گیا۔ اغلبًا ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب امیر شہر تھے۔ ان کے مکان واقع ملک کالونی میں رہائش کی جگہ ملی۔ اکیلا ہی رہتا تھا۔ نماز کے لیے شہر میں محمود ہال آنا ہوتا تھا۔ جماعت کی مخالفت زوروں پر تھی۔ ہر ممکن طریق سے مخالفت کی جا رہی تھی۔ مختلف جگہوں پر کرائے کے قاتلوں کے ذریعہ اہم احبابِ جماعت سکھر کو راہِ مولا میں قربان کیا جا رہا تھا۔ اسی عرصہ میں وہ آرڈیننس جاری کیا گیا جس کی رو سے کوئی احمدی نہ کلمہ پڑھ سکتا ہے، نہ السلام علیکم کہہ سکتا ہے، نہ نماز (بیت الذکر) سے باہر کسی کھلی جگہ پڑھ سکتا ہے، نہ اذان دے سکتا ہے وغیرہ۔ اگر کوئی احمدی اس کی خلاف ورزی کرتا تو اسے بلا چون وچرا جیل میں ڈال دیا جاتا۔ بعض احمدیوں کو سینہ پر کلمہ طیبہ کا بیج لگانے کے باعث بدترین پولیس تشدد برداشت کرنا پڑا۔ ہماری (بیوت الذکر) سے قرآن مجید کی آیات اور کلمہ طیبہ کو بالجبر پولیس کی طاقت سے مٹایا گیا۔ اور اس کام کو اسلام کی عظیم خدمت قرار دیا گیا۔ یوں اپنے زعم میں احمدیت کو مٹانے کی بے مثال سعی کی گئی۔ لیکن خدا تعالیٰ کے فضل سے احمدیت کا کارواں ایک لمحے کے لیے بھی کہیں رکنے نہ پایا۔ خلیفۂ وقت کی گرفتاری کا منصوبہ بنا کر خلافت احمدیہ کو ختم کرنے کی ٹھان لی گئی۔ ان ایام میں جماعت احمدیہ کے افراد نہایت کرب میں مبتلا رہے اور اپنے رب کے حضور عاجزانہ تضرعات میں مصروف تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خلیفۂ وقت کو بحفاظت تمام پاکستان سے انگلستان لے گیا۔ اس کی تفصیلات جاننے کے لیے حضور کی سوانح عمری ایک مرد خدا کا مطالعہ بے حد مفید ہوگا۔

احمدیوں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ سالارِ کارواں اب پہلے سے بڑھ کر آزاد اور کھلم کھلا اشاعت احمدیت میں جُت گیا ہے۔ دوسری طرف جماعتہائے احمدیہ پاکستان کو ہر طرح بے بس کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جا رہا

تھا۔لوگوں کو احمدیوں کا ہر طرح سوشل بائیکاٹ کرنے کی ہدایات جاری کی جارہی تھیں۔ پانی بند کیے جارہے تھے۔ دوکانداروں کو اشیاءضرور یہ احمدیوں کے ہاتھوں فروخت کرنے سے منع کیا گیا تھا۔دکانوں پر بورڈ آویزاں کردیے گئے کہ کسی مرزائی کوسودا فروخت نہیں کیا جائے گا۔اہم افراد کی نقل وحرکت کی جاسوسی کی جاتی تھی۔ متعدد شہروں میں کئی احمدی راہِ مولا میں قربان بھی کردیے گئے۔سندھ میں سکھر میں قریشی عبدالرحمٰن صاحب کوراہِ حق میں قربان کیا گیا۔نجم الحق صاحب وکیل پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

پھر 87-1986ء میں دوافرادراؤ خالد سلیمان صاحب اور ماسٹر قمرالحق صاحب دن دہاڑے سکھر میں راہِ مولا میں قربان کردیے گئے۔پنوعاقل میں چوہدری محمود احمد صاحب کو،اسی طرح لاڑکانہ میں بھی متعدد احمدیوں کوراہِ مولا میں قربان کیا گیا۔ الغرض یہ ایام احمدی احباب پر بڑے کٹھن اور ایامِ ابتلاء تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ کوسرخرو ہوکر نکلنے کی توفیق دی ہے۔سندھ میں راہِ مولا میں قربان کیے جانے والوں کی ایک فہرست حسبِ ذیل ہے جس سے احبابِ جماعتہائے سندھ کی آزمائش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

راہِ مولا میں قربان ہونے والے احبابِ سندھ از 19 فروری 1982ء

۱۔چوہدری مقبول احمد صاحب پنوعاقل ضلع سکھر	19 فروری 1982ء
۲۔ماسٹر عبدالحکیم ابڑو صاحب وارہ ضلع لاڑکانہ	16/اپریل 1983ء
۳۔چوہدری عبدالحمید صاحب محراب پور ضلع نوابشاہ	10/اپریل 1984ء
۴۔قریشی عبدالرحمٰن صاحب سکھر	یکم مئی 1984ء
۵۔ڈاکٹر انعام الرحمٰن انور صاحب سکھر	15/مارچ 1985ء

۶۔ چوہدری عبدالرزاق صاحب بھریا روڈ ضلع نوابشاہ	7/اپریل 1985ء
۷۔ محمود احمد اٹھوال صاحب پنوعاقل سکھر	29 جولائی 1985ء
۸۔ سید قمر الحق صاحب سکھر	11/مئی 1986ء
۹۔ راؤ خالد سلیمان صاحب سکھر	11/مئی 1986ء
۱۰۔ بابو عبدالغفار صاحب حیدر آباد سندھ	9/جولائی 1986ء
۱۱۔ ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب حیدر آباد	9/جون 1985ء
۱۲۔ ڈاکٹر منور احمد اٹھوال صاحب سکرنڈ	14/مئی 1989ء
۱۳۔ ڈاکٹر عبدالقدیر جدران صاحب قاضی احمد	2/اگست 1989ء
۱۴۔ ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب نوابشاہ	28/ستمبر 1989ء
۱۵۔ نصیر احمد علوی صاحب دوڑ نوابشاہ	17/نومبر 1990ء
۱۶۔ عبدالرحمٰن باجوہ صاحب کراچی	28/اکتوبر 1994ء
۱۷۔ دلشاد حسین صاحب کچھی لاڑکانہ	31/اکتوبر 1994ء
۱۸۔ سلیم احمد پال صاحب کراچی	10/نومبر 1994ء
۱۹۔ انور حسین ابڑو صاحب انور آباد لاڑکانہ	19/دسمبر 1994ء

۲۰۔ مبارک احمد شرما صاحب شکار پور (74ء میں لگے زخموں سے) 3/مئی 1995ء

۲۱۔ مظفر احمد شرما صاحب شکار پور	12/دسمبر 1997ء
۲۲۔ ماسٹر نذیر احمد صاحب بھگیو نواب شاہ	10/اکتوبر 1998ء

نوٹ: سیٹھ محمد یوسف صاحب کریانہ مرچنٹ اور چوہدری محمد اکرم صاحب کو ان احباب کے بعد بلکہ عزیزم مقصود احمد ولد محمد ادریس ساکن کرونڈی جو مولوی عبدالحق صاحب نور کا پوتا تھا، کو بھی مذکورہ فہرست کے بعد راہِ مولا میں قربان کیا گیا ہے۔

لیکن ان تمام تر قربانیوں کے باوجود احمدی احباب کے پائے ثبات میں ادنیٰ سی

بھی لغزش نہیں آئی۔ بلکہ وہ نہایت شان سے ان پر آشوب ابتلاؤں سے سرخرو ہو کر نکلے ہیں۔ان کو دیکھ کر دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔واہ کیا شانِ احمدی ہے۔مقتل میں بھی استقامت کا پہاڑ نظر آتے ہیں۔اس بہیمانہ مخالفت پر ایک اور زاویۂ نگاہ سے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

کیا احمدی احباب جو خاموشی سے ان مخالفین کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن رہے ہیں،ان میں قوت مدافعت نہیں ہے؟ یقیناً ہے اور مخالفین سے بڑھ کر سرفروشی کی قوت احمدی رکھتے ہیں۔احمدی مخالف کے اگر دو ہاتھ ہیں تو کیا احمدی کو قدرت نے دو ہاتھ عطا نہیں کیے۔کیا ہمارے نظام کے پاس ایسے نو جوان نہیں جو ان مخالفین کو ان کے گھروں سمیت جلا سکیں۔کیا احمدی نو جوانوں کو دو بوتل پٹرول میسر نہیں آ سکتا۔یقیناً اس کا جواب اثبات میں ہے اور شہروں کے شہر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں لیکن ایک احمدی کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی مکی زندگی کا نمونہ ہے اور احمدیت کی غرض و غایت دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے حقیقی دین کی اشاعت ہے اور اس نظام میں ظالم اور مظلوم ہم مرتبہ قرار نہیں پا سکتے۔پس احمدی اپنا تن من دھن تو قربان کر سکتے ہیں لیکن ظلم و بربریت کی داستانیں رقم کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوں گے۔اس لیے مخالف جس طرح چاہے آزمالے ہمیں اس قول میں یقیناً سچا پائے گا اور اس وقت سے لے کر جب سے اسے احمدیوں کو واصل حق کرنے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے مخالفین نے اس بارے میں ہمارے پائے ثبات میں ذرہ سی بھی لغزش نہیں دیکھی جو اس بات کی مضبوط ترین شہادت ہے کہ احمدیوں کا قدم صدق و ثبات اور استقامت کے بلند مینار پر قائم ہے اور وہ حقیقی معنوں میں اپنے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ستاروں کی مانند آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیھم کے نقش قدم پر مضبوطی سے قائم ہیں اور بڑی سے بڑی آزمائش بھی انہیں جادۂ

استقامت سے منحرف نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ جماعت کی ان قربانیوں کو قبول فرمائے اور سارے جہان میں اسوۂ رسولؐ کے ذریعہ حقیقی امن وسلامتی قائم ہو جائے۔ آمین۔

نواب شاہ سے کرونڈی اور کرونڈی سے سکھر تبادلہ

نوابشاہ سے میرا تبادلہ گجرات کر دیا گیا۔ میں نے ناظر صاحب کی خدمت میں کچھ مہلت کے لیے لکھا تو انہوں نے طلب فرمایا۔ میں ربوہ آ گیا۔ کئی روز ربوہ رہا آخر میرا تبادلہ کرونڈی ضلع خیر پور کر دیا گیا۔ چنانچہ کرونڈی پہنچ گیا اور جماعتی امور کی انجام دہی میں مصروف ہو گیا۔

انہی ایام میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے کشف فرائی ڈے دی ٹینتھ دیکھا۔ لوگوں نے اس کشف سے یہ مراد لینا شروع کر دیا کہ حضور واپس پاکستان آ جائیں گے۔ میں نے خواب میں دیکھا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ میرے کمرے میں تشریف لائے ہیں اور کمرے میں بچھی چارپائی کی پائنتی کے سیرو پر پاؤں زمین پر رکھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ آپ نے موتیا رنگ کی اچکن پہنی ہوئی ہے اور شلوار سفید ہے اور سفید پگڑی ہے، اچکن قدرے میلی ہے۔ حضور کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ حضور کی ابھی واپسی نہیں۔ چنانچہ یہ خواب پورا ہو گیا۔

جماعتی لحاظ سے ابھی تک مخالفت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ رانی پور میں چوہدری منور احمد چیمہ صاحب ایڈووکیٹ پر چاقو سے حملہ کیا گیا حالانکہ وہ لوگ اپنے علاقہ میں وسیع تعلقات اور رعب و دبدبہ والے تھے تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کو زندگی دی۔

مرکز میں اغلباً ناظر صاحب اصلاح وارشاد بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ سید احمد علی شاہ صاحب مرحوم نائب ناظر تھے۔ ان کا خط ملا کہ ہر ماہ ایک جمعہ سکھر میں پڑھاؤ۔ کچھ دنوں بعد ہر ماہ دو جمعے پڑھانے کا ارشاد ملا۔ پھر تین جمعے ہر ماہ سکھر

پڑھانے کی ہدایت ملی جس پر عمل ہوتا رہا۔آخر 1985ء میں میرا کرونڈی شہر سے سکھر تبادلہ کر دیا گیا۔ بچے بدستور رحمان آباد تھے۔محترم حاجی صاحب نے مربی صاحب کے لیے متبادل مکان کا انتظام کر دیا ہوا تھا جو میرے والے مکان سے بڑا اور بہتر سہولتوں سے آراستہ تھا۔

میں ابھی کرونڈی میں ہی تھا کہ سکھر میں محترم قریشی عبدالرحمٰن صاحب سابق امیر جماعت ہائے احمدیہ اضلاع سکھر، جیکب آباد وشکار پور کے دو بیٹوں ناصر احمد اور رفیع احمد کو جیل میں بند کر دیا گیا۔اسی طرح جماپور کے بعض احباب کو بھی سکھر پولیس لائن میں پولیس لے گئی۔ کچھ لوگ جماپور کے ادھر ادھر بھاگ گئے۔ مجھے جیسے ہی معلوم ہوا سخت دوپہر کو ایک موٹر سائیکل پر سوار ہو کر کرونڈی سے جماپور پہنچا۔احباب سے مل کر ان کا حال احوال دریافت کیا۔ جماپور سے چوہدری شاہ محمد صاحب کے بیٹے ایوب کو جیل میں بند کر کے تشدد کیا گیا۔ان کا قصور کسی نے بھی نہیں بتایا۔ضلع میں پنوعاقل میں بھی پر تشدد واقعات کے رونما ہونے کا ہر لمحہ خدشہ تھا۔

سکھر شہر اور ضلع جماعتی لحاظ سے خطرات سے دوچار تھے۔سکھر میں رہائش کے لحاظ سے (بیت الذکر) کے ساتھ ایک کوارٹر تھا۔اس میں رہنا شروع کیا۔ جماعت احمدیہ سکھر کی (بیت الذکر) اور قریب کے احباب کی حفاظت کے لیے کراچی سے خدام وانصار پر مشتمل گروپ ہر جمعرات کی شام تک پہنچ جاتا تھا۔وہ کھانے کا انتظام بھی اپنا خود کرتے تھے۔ اخراجات جماعت احمدیہ کراچی ادا کرتی تھی۔ اگر مقامی احمدی احباب نے گھر سے باہر جانا ہوتا تھا تو دو تین خدام حفاظتی طور پر ساتھ جاتے۔ اگر ملازم پیشہ کوئی دوست ہوتے تو ان کو حفاظت میں وہاں چھوڑ کر آتے۔ واپسی کے وقت بھی وہ قبل از وقت وہاں جا کر ان کو ہمراہ لے کر آتے۔ مقامی احباب صرف جمعہ کے دن ہی (بیت الذکر) آتے یا قریب ترین گھروں کے مالک روزانہ آجاتے۔

بحیثیت مربی خاکسار نمازوں کے بعد درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیتا۔حلقہ میں مندرجہ ذیل جماعتیں موجود تھیں۔

ا۔روہڑی۔۲۔پنو عاقل۔۳۔گھوٹکی۔۴۔ڈہرکی۔۵۔گوٹھ عنایت اللہ۔۶۔کمو شہید۔۷۔شکارپور۔۸۔جیکب آباد۔

ہر ماہ ان جماعتوں کا تربیتی دورہ کرتا۔ایک دفعہ ایک تعلیمی کورس مرکز کی طرف سے تمام احباب جماعت مع خواتین پڑھانے کے لیے دیا گیا۔چنانچہ مختلف جماعتوں میں متعدد ایام قیام کر کے موزوں وقت پر خواتین بچوں اور بڑوں کو وہ مسائل یاد کروانے کی کوشش کی گئی۔اس سلسلہ میں ایک ایک جماعت میں چار چار روز بھی قیام کرنا پڑا۔

اس طرح تمام افرادِ جماعت سے مضبوط روابط قائم ہو گئے۔مخالفت کا یہ عالم تھا کہ مکرم شیخ عبدالماجد صاحب ایک کالج میں پروفیسر تھے،لڑکے ان سے پڑھنے کو تیار نہ تھے۔چنانچہ وہ روزانہ کالج میں حاضری لگاتے اور کچھ عرصہ وہاں رہتے اور واپس آجاتے۔میں روزانہ ایک بار فون کر کے ان کی خیریت معلوم کرتا۔

سکھر کے بعض اہم امور

سکھر کے ایک ہائی سکول میں بم دھماکے سے کمرے کی چھت گر گئی۔اس کی تحقیق کے لیے پولیس نے کارروائی شروع کی اور سکول کے چپڑاسی کو گرفتار کرلیا گیا۔اس نے دورانِ تفتیش اقرار کیا کہ اس نے ایک صندوقچی کمرے میں رکھی ہے اور یہ صندوقچی مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب نے دی تھی۔اب پولیس بجائے ہیڈ ماسٹر کو گرفتار کرنے کے چپڑاسی پر تشدد کر رہی تھی کہ تم کسی قادیانی کا نام لو۔اس نے کہا مجھے ہیڈ ماسٹر نے دی تھی۔انہوں نے پھر اس پر تشدد کیا۔وہ بندۂ خدا تشدد برداشت کرتا رہا

لیکن اس نے اپنے بیان سے انحراف کر کے کسی احمدی کا نام نہیں لیا۔ پولیس چاہتی تھی کہ وہ بم کیس گرفتار شدہ احمدیوں پر ڈال دیا جائے جن میں جماپور، محراب پور اور سکھر کے قریشی ناصر احمد، قریشی رفیع احمد اور مظفر احمد ولد محمود عالم شامل تھے۔ لیکن پولیس اس میں ناکام رہی اور چپڑاسی سے مطلب کا بیان حاصل نہ کر سکی۔ ہیڈ ماسٹر چونکہ جماعت اسلامی کا تھا جو ضیاء الحق کی سپورٹر تھی اس لیے اسے ماخوذ نہ کیا گیا۔

ایک بار چوہدری لطیف صاحب ڈی آئی جی سے ملے کہ یہ ظلم ہے کہ آپ احمدیوں پر ظلم کرنے والوں میں سے کسی کو گرفتار نہیں کر رہے۔ چوہدری لطیف صاحب چوہدری شاہ محمد صاحب آف جماپور کے بیٹے تھے اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے ان کو امیر اضلاع سکھر، جیکب آباد اور شکار پور مقرر فرمایا تھا۔ ڈی آئی جی نے صاف کہا کہ ہمیں قاتلوں اور سازش کرنے والوں کا بخوبی علم ہے لیکن حکومتی ہدایات کے باعث ہم کارروائی کرنے سے معذور ہیں۔ انہی دنوں محترم امیر صاحب نے حفاظتی لحاظ سے یہ ہدایت جاری فرمائی کہ جب کہیں گھر سے باہر دورہ وغیرہ پر جانا ہو تو دو آدمی خدام میں سے ساتھ لے کر جایا کرو اور واپس آنے سے قبل بھی اطلاع دیا کرو کہ فلاں وقت آنا ہے تا کہ خدام کو بھیج دیا جایا کرے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر دشمنوں نے مجھے مارنا ہی ہے تو پھر دو حفاظت کرنے والے بے چاروں کی جان کیوں جائے کیونکہ قاتل پھر صرف مجھے ہی نہیں ماریں گے بلکہ موقع کے دونوں گواہوں کو بھی ختم کریں گے۔ اس لیے مجھے اکیلے ہی آنے جانے دیں تا کہ میری وجہ سے دو اور جانیں تو ضائع نہ ہوں۔ اس پر خاموش ہو گئے اور میں اکیلا ہی آتا جاتا رہا۔ سکھر شہر میں رہتے ہوئے تو ایسے ہی لگتا تھا جیسے جیل میں بی کلاس کاٹ رہے ہیں۔

سکولوں میں چھٹیاں ختم ہوئیں تو مکرم ماسٹر قمر الحق صاحب نے سکول جانا شروع کیا۔ مخالفین تو جیسے تاک میں تھے۔ ایک دن وہ سکول گئے اور خیریت سے واپس

آ گئے۔ دوسرے روز راؤ قمر سلیمان جو ایک نو مبائع احمدی نوجوان تھا وہ ماسٹر صاحب کے ہمراہ جا رہا تھا کہ گھر سے تھوڑے فاصلے پر مخالفین نے جو گھات میں تھے، حملہ کر دیا۔ راؤ قمر سلیمان کراٹے سے ان کا مقابلہ کرتے رہے مگر آخر کار دشمنوں نے ان کو راہِ مولا میں قربان کر دیا۔ مکرم قریشی تنویر احمد صاحب ابن قریشی ناصر احمد صاحب نے آ کر اطلاع دی کہ دونوں کو راہِ مولا میں قربان کر دیا گیا ہے۔ قاتل دن دہاڑے قتل کر کے آرام سے فرار ہو گئے۔ کسی نے ان کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر پولیس کارروائی کے بعد دونوں کے جسدِ خاکی کو (بیت الذکر) لے آئے۔ کراچی سے کچھ ماہرین آئے۔ انہوں نے ان دونوں کے اجسام کو ایئر ٹائٹ بکسوں میں بند کیا اور لاشوں کو مرکز روانہ کیا گیا۔ یہ سب کچھ میری موجودگی میں ہوا اور اب صورتحال یہ تھی کہ گھر سے باہر جا کر واپس آنے کا کوئی یقین نہ تھا۔ کراچی کے خدام گھریلو اشیاء لا دیتے تھے جو استعمال کر لی جاتی تھیں۔ اب اضلاع جیکب آباد، شکار پور اور سکھر کے امیر چوہدری عبداللطیف صاحب ابن چوہدری شاہ محمد صاحب ساکن جماپور تھے۔ نوجوان اور جوشیلے احمدی تھے۔ مالی طور پر بھی مضبوط پوزیشن کے مالک تھے۔ جیپ سواری کے لیے ان کے پاس تھی۔ جماعتوں کا دورہ بھی کرتے۔ بعض اوقات مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ہاں اب سکھر میں ایک کی بجائے دو مربی متعین ہو گئے تھے۔ دوسرے مکرم سمیع اللہ قمر صاحب مربی سلسلہ متعین تھے۔ ہم دونوں سکھر میں رہتے تھے۔ ایام قیام سکھر میں عبدالمجید خان صاحب ابن عبدالواحد خان صاحب ساکن روہڑی اغلباً ڈویژنل قائد سکھر تھے وہ ان حالات میں بھی خدام کا ڈویژنل اجتماع کرانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک رحمان آباد باندھی کے سوائے کوئی موزوں جگہ نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ہمراہ لے کر محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے پاس جانے کا پروگرام بنایا۔ وہاں پہنچے۔ اغلباً دفع 144 کا بھی نفاذ تھا۔ حاجی صاحب کی

خدمت میں مقصدِ حاضری بیان کیا۔فرمانے لگے بھئی اجتماع کا تو خدام الاحمدیہ والوں نے فیصلہ کرنا ہے۔میں ان کی جگہ قائد ہوتا تو کر ڈالتا۔میرے دو لڑکوں کی تھوڑے دن ہوئے شادی ہوئی ہے میں نے ان کی دعوت ولیمہ نہیں کی۔دعوت ولیمہ کے کارڈ تقسیم کر کے اجتماع کر لیتے ہیں۔چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور ان حالات میں بھی محترم حاجی صاحب کی مہربانی سے اجتماع منعقد کر لیا گیا۔

سکھر سے ملتان

سکھر سے میرا تبادلہ ملتان ہو گیا اور سمیع اللہ صاحب قمر کو تحریک جدید بھیج دیا گیا۔مربی صاحب ملتان مکرم قریشی سفیر احمد صاحب ربوہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ملتان جانے کا پروگرام بنایا۔شام کو ملتان پہنچ کر مکرم امیر صاحب مقامی اور ضلع کو فون پر اپنے آمد کی اطلاع دی اور رات کو ہی سندھ سامان لانے کے لیے روانہ ہو گیا۔سندھ میں محترم حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور بتایا کہ اب ملتان تبدیلی ہو گئی ہے۔کہنے لگے ٹھیک ہے بچوں کی دیکھ بھال ہوتی رہے گی۔آپ دل لگا کر خدمت کریں۔چنانچہ گھر سے کھانا پکانے کا سامان اور بستر لے کر ملتان پہنچ گیا۔ملتان حسین آگاہی (بیت الذکر) میں مکرم نذیر احمد سانول صاحب خادم (بیت) تھے۔نوجوان اور ہوشیار ملتانی تھے۔اتفاق سے رانا نصیر احمد نام ایک نوجوان جس سے سکھر میں واقفیت ہوئی تھی، یہ حفاظتی سکواڈ میں سکھر آیا تھا، وہ بھی ملتان سٹیٹ لائف میں ملازم تھا اور (بیت الذکر) میں رہتا تھا۔بعض اور نوجوان جن میں سے بعض ملازم تھے اور بعض طالبعلم تھے وہ بھی (بیت الذکر) میں رہتے تھے۔کھانا باہر ہوٹل سے کھاتے تھے۔میں نے پہلے دن مکرم چوہدری نعمت علی صاحب جو لوکل باڈیز کے آڈیٹر تھے اور مجھے بہاولپور تقرر کے زمانہ سے جانتے تھے ان کے ہاں کھایا۔ایک

وقت (بیت الذکر) والوں نے کھانا دیا۔ پھر میں نے بازار سے کھانا منگوانا شروع کر دیا۔ صدر صاحب حلقہ بڑے بزرگ اور حضرت چھجو خان صاحب (رفیق) حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صاحبزادے تھے۔ اب معمر ہو چکے تھے۔ محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اغلباً ڈویژنل انسپکٹر تعلیم کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ بڑے دلیر کارکن تھے۔ لوگوں نے مجھے ڈرایا کہ اس بابے سے بچ کر رہنا۔ لیکن ان کے ساتھ چل کر دیکھا نہایت مخلص، ہمدرد اور مہربان شخص تھے۔ وہ سلسلہ کا کام چاہتے تھے اور مربی کو لوگوں کے لیے نمونہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ان کا نام چوہدری رشید احمد خان صاحب تھا۔ یقیناً یہ ایک عمدہ تصور تھا۔ نعمت علی صاحب حلقہ کے سیکرٹری مال تھے۔ ایک دن میں باہر سے (بیت الذکر) میں آیا تو ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ اس سے علیک سلیک ہوئی اور پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ کہنے لگا میں تو آپ کا داماد ہوں کیونکہ میں آپ کے بھائی محمد شفیع ساکن راہوالی کا داماد ہوں۔ مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ اور یہ بہت کام کا آدمی ثابت ہوا۔ اسی طرح میرے علم میں تھا کہ چچا جان محمد شفیع صاحب نمبردار 147 ر۔ب ضلع فیصل آباد کی دو بیٹیاں ملتان بیاہی ہوئی ہیں ان کی تلاش کی مگر معلوم نہ ہو سکا۔ ایک دن ایک دوست اپنے آٹھ نو سال کے بیٹے کو ہمراہ لے کر میرے کمرے میں اوپر آئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا ہمیں پہچانتے ہیں؟ ہم تو آپ کے اپنے عزیز ہیں۔ میری سمجھ میں بات نہ آسکی۔ آخر ان سے معذرت کے ساتھ تفصیل پوچھی تو کہنے لگے میرا نام محمد یوسف چٹھہ ہے اور یہ میرا بیٹا طاہر ہے۔ ان دونوں کو اٹھ کر گلے ملا۔ یہ چچا جان کا چھوٹا داماد تھا۔ چند دن بعد میری چھوٹی بہن نسیم اختر بھی ملنے آگئی اور پھر گھر آنے کی تاکید کر کے چلی گئی۔ ان کی وجہ سے مجھے ملتان چار سال بہت آرام ملا ہے۔ اسی طرح بھائی کے داماد رشید احمد نام میرے کپڑے گھر سے دھلا کر استری کر کے لا کر دیتے رہے۔ گاہے گاہے اپنی بھتیجی سے ملنے ان کے

ہاں چلا جاتا۔ بہرحال ملتان میں اجنبیت سے دو چار نہ ہونا پڑا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اللہ تعالیٰ ان سب عزیزوں کو جزائے خیر عطا کرے۔ آمین

ملتان تبادلہ کے وقت اس لحاظ سے فکرمند تھا کہ ساری سروس سندھ میں گزری ہے۔ پنجاب میں اٹھنے بیٹھنے اور ملنے جلنے کے آداب سے واقفیت نہیں۔ نیز ملتان میں چوٹی کے امیر صنعتکار، بڑے بڑے جاگیر دار اور تاجر موجود ہیں۔ نہ جانے ان کے معیار پر پورا بھی اتر سکوں گا یا نہیں۔ اسی طرح مخالفین احمدیت کا بھی ملتان گڑھ ہے۔ ختم نبوت والے دونوں دھڑوں کے دفاتر ملتان میں ہیں۔ میں تو علمی طور پر بھی کمزور ہوں۔ اس احساس کو دور کرنے کے لیے ایک کارگر گُر سامنے آگیا کہ دعا ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ چنانچہ تہجد تو ادا کرتا ہی تھا۔ اب دن کو بھی کمرہ بند کر کے نوافل میں مقبول جماعتی خدمت کی توفیق ملنے کے لیے دعا میں لگ گیا۔ چند ہی دنوں میں اللہ تعالیٰ نے اس احساسِ کمتری سے نکلنے کی توفیق دے دی اور میں نے درس وتدریس اور تقاریر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ الحمد للہ

اب معلومات کے حصول کے لیے غیر از جماعت بعض احباب بھی (بیت الذکر) آنے شروع ہو گئے۔ ایک دن ایک چھ فٹ کا جسیم نوجوان آیا وہ عیسائیت سے شدید متاثر تھا اور بپتسمہ لیا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اسے (دین حق) کی تعلیم سے بخوبی روشناس کرایا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے چند دن میں ہی وہ بیعت کر کے جماعت میں شامل ہو گیا۔ اب وہ اپنے دوسرے دوستوں کو بھی میرے پاس لے آتا۔

اسی طرح ایک دن ایک نوجوان مرزا عبدالرحمٰن صاحب کا بتوسط مرکز حصول معلومات کے لیے خط ملا۔ اس سے رابطہ کیا گیا۔ چند دن زیر دعوت رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسے قبول احمدیت کی توفیق دی اور پھر وہ بھی پُر جوش داعی الی اللہ بن گیا۔ مقامی طور پر پانچوں نمازوں کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا۔ حلقہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ احباب

کی رہائش دور دور تھی۔ کچھ دوست (بیت الذکر) سے قریب کاروبار کیا کرتے تھے۔ ان کو تحریک کی تو وہ ظہر وعصر میں آنے شروع ہو گئے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

ضلع ملتان کی جماعتیں

نذیر احمد سانول صاحب چونکہ ضلع وار نظام کے کارکن بھی تھے اس لیے جماعتوں سے بھی واقف تھے۔ جماعتیں ضلع کی مختلف سمتوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں۔

جماعت احمدیہ کوٹھے والا

ٹاٹے پور ریلوے سٹیشن اور قصبہ سے قریب دیہاتی جماعت تھی۔ احباب زمیندار تھے۔ یہ کئی حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ گوٹھ بشیر احمد، چک نمبر 1 ہانس بھی اسی جماعت کے دو حصے تھے۔ اسی طرح ایک اور حلقہ بھی تھا یہاں چوہدری محمد شریف صاحب سیکرٹری مال ضلع کا بھی قیام تھا۔ ان کے بھائیوں اور رشتہ داروں پر مشتمل جماعت تھی۔ جماعت کی اپنی (بیت الذکر) تھی۔ اچھے مخلص دوست تھے۔ لیکن محمد شریف صاحب تو واقفین زندگی کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے تھے اور ہر رنگ میں ان کی معاونت کرتے تھے۔ یہاں لجنہ کی تنظیم بھی قائم تھی۔

چاہ احمدیاں والا

چھٹہ قوم کے افراد پر مشتمل یہ جماعت ہے۔ احباب زمیندار ہیں۔ بہت پرانی جماعت ہے۔ میں نے والد صاحب سے بچپن میں اس جماعت کا نام سنا تھا۔ یہاں قریب ہی چک چھٹہ ہے۔ یہاں چوہدری محمد شفیع صاحب نمبردار کی دو بیٹیاں بیاہی ہوئی ہیں۔ چوہدری صاحب کے داماد کا نام بھی محمد شفیع تھا جو فوت گئے ہیں۔ ان کے بھائی اور دوسرا بیٹا احمدی نہیں۔ ایک بیٹا محمد یوسف احمدی ہے۔ لیکن ان کی رہائش

ملتان چوک خونی برج کے پاس ہے۔

بستی بابا اللہ دتہ

ملتان سے دنیا پور جانے والی سڑک پر ملتان سے چند میل کے فاصلہ پر پرانی جماعت ہے۔

چک گلزار

بستی بابا اللہ دتہ سے قریب ہی اسی سڑک پر چک گلزار میں مخلصین کی مختصر سی جماعت قائم ہے۔ یہاں رشید احمد صاحب اور خوشی محمد صاحب دو بھائی اوران کی اولاد پر مشتمل جماعت ہے۔

دنیا پور

تحصیل ہیڈ کوارٹر بھی ہے اور بہت پرانی جماعت ہے۔ زیادہ تر شیخ برادری پر جماعت مشتمل ہے اور کچھ مغل صاحبان بھی ہیں۔

چک نمبر 366

ملتان سے بہاولپور جاتے ہوئے (یہ جماعت اب ضلع لودھراں میں واقع ہے۔اس وقت ملتان میں تھی) چوہدری عبدالرحمٰن صاحب جن کی اولاد بہت تعلیم یافتہ تھی۔ انور حسن صاحب۔ انوارالحسن صاحب۔ محمد اکرم صاحب اور پروفیسر سلطان احمد صاحب، ان کے صاحبزادے ہیں۔اب اغلباً صرف سلطان صاحب زندہ ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری فیملی بھی اچھی تعلیم یافتہ ہے جن پر یہ جماعت مشتمل ہے۔ زمیندار بھی ہیں۔

چک نمبر 390

چک نمبر 112 بہاولپور والی سڑک سے ایک سڑک کوٹلی کبیر کو جاتی ہے۔اس پر کچھ فاصلہ پر یہ چک واقع ہے۔اکثر یہاں احمدی ہیں۔(بیت الذکر) ہے۔مخلصین

پر جماعت مشتمل ہے۔

چاہ بی بی والا

کوٹلی کبیر سے تھوڑے فاصلے پر یہاں احباب جماعت آباد ہیں۔ یہ لوگ ضلع نوابشاہ لاکھا روڈ سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ سارے پہلے وہی واقف کار تھے۔

لودھراں شہر

یہاں بھی پرانی جماعت قائم ہے۔ تھوڑے فاصلہ پر چاہ جت والا میں علیحدہ خاندان آباد ہے۔ بہرحال لودھراں کی جماعت کا حصہ ہیں۔ بہت پہلے یہاں سے ایک معلم وقف جدید صوفی کریم بخش صاحب تھے اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہاں کے پانچ مربیان کرام ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ مکرم جمال الدین شمس صاحب، مکرم منور احمد قمر صاحب، مکرم احمد فراز صاحب، مکرم بابر سلیم صاحب، مکرم مدثر سلیم صاحب

چک نمبر 344

یہ جماعت بھی دنیا پور والی سڑک سے ہٹ کر قائم ہے۔ دوستوں کی رہائش دو مختلف جگہوں پر تھی۔ اب ایک حصہ تو ربوہ منتقل ہو چکا ہے۔ چک میں چوہدری عبدالشکور اور اس کا بھائی رہتے ہیں۔ چوہدری عبدالشکور نمبردار اور گریجوایٹ ٹیچر ہیں اور اگست 2017ء میں ریٹائر ہونا ہے۔

ملتان شہر

ملتان شہر کی جماعت کافی بڑی ہے اور متعدد حلقوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً حلقہ حسین آگاہی جو بستی بابا صفراء اور خونی برج تک ممتد ہے۔

گلگشت کالونی: یہاں علیحدہ (بیت الذکر) اور مربی حلقہ کا انتظام ہے۔

حلقہ صدر: حلقہ حسن آباد، حلقہ کھاد فیکٹری، حلقہ بیت السلام

مربی کا ہیڈ کوارٹر (بیت) حسین آگاہی میں تھا۔ اور مربی صاحب کی رہائش کا انتظام (بیت الذکر) کی چھت پر ایک چھوٹا سا کوارٹر بنا کر اس میں کیا گیا تھا، جس میں ایک چھوٹا سا کچن تھا۔ خادم (بیت الذکر) موجود تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نوجوان بھی اپنی ضرورت اور (بیت الذکر) کی حفاظت کے پیش نظر رہائش پذیر تھے۔ جس میں چوہدری محمد افضل چیمہ نیشنل بنک میں ملازم تھے۔ خالد ایک طالبعلم تھا جو جلّہ ارائیں کا رہنے والا تھا۔ جہاں کے مولوی امام الدین صاحب رہنے والے تھے۔ مولوی امام الدین صاحب انڈونیشیا کے ابتدائی (مربیان) میں سے تھے۔ علاوہ ازیں بعض اور نوجوان بھی تھے جن کے نام اس وقت لوحِ حافظہ میں محفوظ نہیں۔ ہاں رانا نصیر احمد بھی (بیت الذکر) میں رہائش پذیر تھا۔ مربی کو اپنے کھانے کا انتظام خود کرنا ہوتا تھا۔ بعض لڑکے ہوٹل سے کھا لیتے تھے۔ حلقہ شہر کے صدر جماعت مکرم ومحترم چوہدری رشید احمد خاں صاحب تھے جو اس وقت اندرون بوہڑ گیٹ الانگ پر رہائش پذیر تھے۔ حلقہ میں لجنہ کی بھی فعال تنظیم قائم تھی۔ خدام الاحمدیہ والے بھی مستعد تھے۔

ان تمام تنظیموں کے ساتھ رابطہ کر کے انہیں مزید فعال بنانے کی کوشش کی۔ مکرم ڈاکٹر محمد شفیق سہگل صاحب امیر شہر اور امیر ضلع بھی تھے۔ چوہدری بشیر احمد صاحب المعروف جنکو ڈرائی کلینرز نائب امیر اور چوہدری عبدالشکور صاحب ریٹائرڈ واپڈا سیکرٹری مال تھے۔ باقی حلقہ جات کی تنظیمیں الگ الگ تھیں۔

اتنی بڑی جماعت لیکن مہمان نوازی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ صرف حسین آگاہی میں مرکزی نمائندگان کی مہمان نوازی جماعتی سطح پر کی جاتی تھی۔ جماعت ملتان میں مکرم ومحترم ملک عمر علی صاحب کھوکھر رئیس ملتان کا خاندان بھی ملتان کی اہم ترین شخصیات میں شامل اور جاگیردار رہے۔ مکرم ملک عمر علی صاحب کے صاحبزادگان میں مکرم ملک فاروق صاحب سابق امیر ضلع ملتان، ملک محمد زبیر صاحب اور ملک محمد

طارق صاحب ملتان میں مقیم ہیں۔شہر میں مکرم ملک فاروق صاحب کا کافی اثر ورسوخ ہے اور شہر سے کچھ فاصلہ پر بہت بڑے رقبہ کے مالک ہیں۔اسی طرح شیخ برادری بھی شہر میں وسیع کاروبار کی مالک ہے۔ مثلاً محترم امیر صاحب ڈاکٹر محمد شفیق سہگل صاحب، ان کے بھائی مکرم میاں محمد انور صاحب (اب فوت ہو گئے ہیں) سالویکس گھی فیکٹری کے مالک تھے۔ حسین آگاہی میں مکرم شیخ محمد منیر صاحب کے صاحبزادگان شیخ تنویر احمد صاحب، نصیر احمد صاحب، توقیر احمد صاحب، اور فیاض احمد صاحب موٹر سائیکل سپیئر پارٹس کے اچھے خاصے بڑے کاروباری اور مخلص احمدی ہیں۔اسی طرح شیخ محمد اشفاق صاحب جو کاٹن بروکر ہیں، بہت مخلص اور قربانی کرنے والے احمدی ہیں۔الغرض یہ تو چند احباب کے نام ہیں، جماعت کا ہر فرد ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک گوہر آبدار ہے۔ میرے ساتھ ہر احمدی نے جماعتی امور میں نہایت عمدگی سے تعاون کیا ہے۔ ہاں (بیت) حسین آگاہی کی زمین مکرم سیٹھ اللہ جوایا صاحب مرحوم نے عطیہ دی تھی۔ اب ان کے ایک صاحبزادے حافظ عبدالمالک صاحب جو میرے زمانہ طالبعلمی میں احمد نگر میں زیر تعلیم تھے۔وہ بھی (بیت الذکر) کے قریب ہی رہائش پذیر تھے اور میرے ساتھ ہر قسم کے تعاون کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔آمین۔اسی طرح شیخ تنویر احمد صاحب اور ان کے بھائی بھی ہمہ وقت ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار رہتے تھے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔اب بھی ان کے ساتھ تعلقات قائم ہیں۔ظہر وعصر کی نمازوں کی رونق ان سے تھی۔اور احسان نا شناسی ہو گی اگر میں ان سطور میں اپنے محسن چچا کی بیٹی نسیم اختر، ان کے میاں چوہدری محمد یوسف صاحب چٹھہ کا ذکر نہ کروں جنہوں نے میرے ساتھ مربی سلسلہ کے ساتھ ساتھ ایک قریبی عزیز سے بھی بڑھ کر ایام قیام ملتان میں سلوک کیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ ان کے ساتھ تعلقات مہر ومحبت آج بھی

نہایت گرم جوشی سے قائم ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔آمین

اسی طرح عبدالمجید خان صاحب، عبدالرؤف صاحب اور عبدالغفور خان صاحب کا تعاون بھی بہت عمدہ اور مثالی تھا۔دعوت الی اللہ کے کام میں میری ہر طرح معاونت کرتے تھے۔ چوہدری بشیر احمد صاحب بھی نہایت عزت واحترام سے پیش آتے تھے۔الغرض ملتان شہر ہو یا ضلع کے احباب جماعت سب نے ہی میرے ساتھ مثالی تعاون کیا ہے اور مجھے بھی شہر اور ضلع میں درس وتدریس، اور تربیت احباب کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے فضل سے خدمات کی توفیق ملی ہے۔ایک دفعہ مرکز سے حکم ملا کہ ضلع میں جلسہ ہائے سیرت النبیؐ کیے جائیں۔ چنانچہ دورانِ سال اللہ تعالیٰ کے فضل سے ضلع میں 56 جلسہ ہائے سیرت النبیؐ کے انعقاد کی توفیق ملی۔لجنہ کے اجلاس میں بھی تربیتی تقاریر اور دروس کی توفیق پاتا رہا۔رمضان المبارک کے ایام میں نماز فجر کے بعد بیت الذکر حسین آگاہی میں قرآن مجید کا اہتمام کے ساتھ درس جاری رہا۔پانچوں نمازوں کی باجماعت ادائیگی جاری رکھی گئی۔علاوہ ازیں مختلف حلقہ جات میں لجنات قرآن کریم کے درس کا اہتمام کرتی تھیں۔شہر میں دن بھر میں چار چار جگہ بھی درس قرآن مجید دیتا رہا۔جس سے احباب جماعت اور لجنات پر عمدہ تربیتی اثرات مرتب ہوئے۔ان دروس کی تیاری میں ہمیشہ تفسیر کبیر از حضرت مصلح موعود کو پیش نظر رکھا۔

جبکہ ابھی تک ضیاء الحق کے آرڈیننس کے اثرات تھے۔(بیت الذکر) حسین آگاہی کے گیٹ سے پولیس گردی کے ذریعہ کلمہ طیبہ مٹایا گیا۔(بیت الذکر) کے اردگرد کے لوگ اگرچہ ظاہری مخالفت نہ کرتے تھےلیکن چند ایک کے علاوہ کھل کر حمایت بھی نہیں کرتے تھے۔(بیت الذکر) کے قریب ایک شخص نانو کی چائے کی دکان تھی اسے سوشل بائیکاٹ کے لیے کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور علی الاعلان (بیت الذکر) میں ضرورت اور مطالبہ کے وقت چائے بنا کر بھیجتا رہا۔

مربیانہ وقار کا ایک چھوٹا سا واقعہ

ملتان کے امیر محترم ڈاکٹر محمد شفیق سہگل صاحب صنعتکار تھے۔ مالی فراخی تھی، مربیان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دن فون پر صبح آٹھ بجے مجھے اپنے مکان پر پہنچنے کا پیغام دیا۔ میں صبح وقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ اندر سے باہر آئے تو کہنے لگے آپ نے ناشتہ کرنا ہوگا۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ کہنے لگے کیوں۔ میں نے کہا آپ نے مکان پر آنے کا کہا تھا ناشتے کا نہیں اس لیے میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ کہنے لگے آئندہ جب بھی آئیں ناشتہ یہاں کریں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہوں نے ناشتہ کے وقت گھر بلایا ہے اور ناشتہ کے لیے نہیں کہا تو میں ناشتہ کر کے کیوں نہ جاؤں اگر وہاں نہ جانا ہوتا تو بھی ناشتہ کرنا تھا۔ بہرحال مربیانہ وقار کو پیش نظر رکھ کر ایسا کیا گیا۔

ایک غیر از جماعت نوجوان محمد عمر بھٹہ سے تعلقات

ایک دن مجھے قیام گاہ (بیت) حسین آگاہی میں محمد عمر بھٹہ نامی ایک شخص کا خط ملا کہ میں نے انٹر کا امتحان دیا ہے اور میں قادیانیت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے میرے پتہ پر لٹریچر ارسال کرو۔ جواباً اسے میں نے لکھا کہ آپ کا خط ملا براہِ کرم مندرجہ ذیل پتہ پر بالمشافہ ملیں۔ اور پتہ (بیت الذکر) کا تھا۔ چنانچہ ایک دن ایک دبلا پتلا نوجوان اوپر قیام گاہ میں آیا اور میرا خط دے کر دریافت کیا کہ کیا یہ آپ کا خط ہے اور آپ مربی ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ میری رہائش (بیت الذکر) کی چھت پر دو کمروں پر مشتمل تھی جو آگے پیچھے تھے۔ میں کمرے میں چارپائی پر بیٹھا تھا اور یہ دروازے میں کھڑا بغور کمرے کے اندر اور باہر جھانک رہا تھا۔ آخر مجھے پوچھتا ہے کہ آپ کے پاس اسلحہ نہیں ہے؟ میں نے فوراً کہا ہاں ہے۔ وہ پیچھے کمرے میں

ہے۔آخر وہ میرے کمرے میں اندر آیا۔کتابوں کی الماری میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ اسے ''آجکل'' رسالہ جس پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خوبصورت تصویر تھی ، ملا۔ تصویر دیکھ کر بہت حیران سا ہوا اور صاحب تصویر کی تفصیل چاہی جس کے بارہ میں اسے بتایا گیا کہ ہمارے موجودہ امام اور خلیفہ ہیں۔اور پھر اسلحہ والے سوال کو دہرایا۔ میں نے اسے پھر کہا کہ ہاں ہے، وہ پچھلے کمرے میں ہے۔ کہنے لگا مجھے تو نظر نہیں آتا۔میں نے کہا ہاں وہ آپ کو نظر نہیں آ سکتا۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔دیکھو وہ مصلیٰ کے اوپر جائے نماز بچھا ہوا ہے، ہمارا اسلحہ وہ ہے۔کیا مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی گردنیں کاٹتے تھے یا دعاؤں سے ان کے اذہان اور قلوب کو تبدیل کیا کرتے تھے۔تلوار اور اسلحہ کے زور سے آپ جسم و جان کا رشتہ تو منقطع کر سکتے ہیں۔ خیالات تبدیل نہیں کر سکتے۔خیالات دعا اور دلیل سے بدلتے ہیں۔تشدد سے اگر خیالات تبدیل کیے جا سکتے تو حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ کے خیالات کفار کے تشدد کے نتیجہ میں ضرور بدل جاتے۔آخر مجھے کہنے لگا میں پان لے آؤں۔میں نے کہا لے آئیں۔تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔اس سے تشدد کے خلاف کچھ دیر گفتگو ہوئی۔سپاہ صحابہ اور شیعوں کے قتل و غارت کے بارہ میں اس سے پوچھا کہ آج تک اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔سوائے دونوں طرف کی خواتین کے بیوہ اور بچوں کے یتیم ہونے کے۔کیا شیعہ کو سنی ختم کر سکیں گے۔کیا شیعہ سنیوں کو ختم کر سکیں گے۔اگر نہیں تو پھر اس قتل و غارت کا نتیجہ سوائے خاندانوں کی تباہی کے اور کیا نکلا ہے یا نکلے گا۔بعد میں اس نے بتایا کہ وہ سپاہ صحابہ کا سرگرم رکن ہے۔پھر اس نے میرے پاس آنا شروع کر دیا۔ایک دن ''اسلام میں اختلافات کا آغاز'' کتاب مطالعہ کے لیے لے گیا۔پڑھ کر بہت خوش ہوا۔تاہم آہستہ آہستہ وہ سپاہ صحابہ کی تنظیم سے دور ہوتا گیا اور یہ نواں شہر ملتان میں کڑی افغاناں کا رہنے والا تھا۔مجھ سے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے خطبات کی

پچاس عدد کیسٹس لے کر گیا۔ کچھ لٹریچر بھی لے گیا۔ اس کا باپ اور باقی خاندان سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مرید تھے۔ باپ کو جب بیٹے کے پاس احمدیہ لٹریچر کا پتہ چلا تو کہنے لگا جس نے یہ لٹریچر پڑھا وہ مرزائی ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔ بہر حال اب وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اکثر کالج کے لڑکوں کو لے کر (بیت الذکر) میں میرے پاس آ جاتا تھا جس سے دعوت الی اللہ کا موقع مل جاتا تھا۔

میں چونکہ ملتان میں تنہا رہتا تھا اور کھانا خود بناتا تھا اس لیے آنے والوں کی مہمان نوازی بھی خود ہی کرتا تھا۔ ایک دن عمر بھٹہ مہمانوں کی آمد اور ان کی تواضع وغیرہ دیکھ کر پوچھنے لگا آپ کو تنخواہ کتنی ملتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھٹہ صاحب یہ ہمارا راز ہے ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ اس لیے آپ یہ سوال نہ کرو۔ وہ بضد ہوا کہ میں نے پوچھنا ہی پوچھنا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اگر میں نے بتایا تو آپ نے مجھ پر جھوٹ کا الزام لگا دینا ہے۔ کہنے لگا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا مجھے پتہ ہے کہ ایسا ہو گا۔ اگر آپ نہ پوچھیں تو بہتر ہو گا۔ وہ پھر بضد ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ 23 صد روپے ملتے ہیں۔ اس وقت مجھے یہی الاؤنس ملتا تھا۔ سنتے ہی کہتا ہے میں نہیں مانتا۔ میں نے کہا کہ پھر وہی ہوا ناں کہ مجھ پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ کہنے لگا میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں لیکن یہ میری سمجھ سے باہر ہے کہ آپ اتنے الاؤنس میں گزر کیسے کرتے ہیں۔ جبکہ آپ کے بچے بھی آپ سے علیحدہ رہتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں آپ کو یہ سمجھ نہیں آ سکتی کیونکہ آپ کا اس کوچہ سے گزر نہیں ہوا۔ یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ گزر کس طرح ہوتی ہے۔ بھٹہ صاحب کیا آپ نے صبح صبح اپنے آشیانوں سے اڑنے والے پرندوں کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح خالی پیٹ ہوتے ہیں اور پھر جب شام کو واپس آشیانوں میں آتے ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں، کیا یہ درست ہے۔ کہنے لگا کہ ہاں۔ میں نے کہا کہ

''وہ خدا جو جانوروں کو بھوکا نہیں مارتا، اس کے دین کے لیے اگر کوئی شخص زندگی وقف کرے گا تو کیا وہ اس کے بچوں کو بھوکا مارے گا۔ ہرگز نہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ متقی کو ایسے طور پر رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا۔ ابھی یہ بات چیت جاری تھی کہ ایک احمدی نوجوان لنگڑا آم کی ایک پیٹی اٹھائے ہوئے اوپر ہمارے پاس آ گیا اور کہنے لگا مربی صاحب ہم نے نئی کوٹھی بنوائی ہے اور اس میں آم کا درخت لگایا ہے۔ آج اس سے پہلا پھل اترا ہے۔ والد صاحب نے کہا ہے کہ جاؤ اسے مربی صاحب کی خدمت میں پیش کر کے آؤ۔ دوسری طرف اگلے روز عید تھی اور عید کے بعد میں نے ربوہ بچوں کے پاس آنا تھا۔ میں نے کہا بھٹہ صاحب! بتاؤ میں نے ان کو پیغام بھیجا تھا کہ بچوں کو آم چاہئیں۔ نہیں بلکہ میرے خدا کو میرے بچوں کی ضرورت کا علم تھا اس نے ان کو تحریک کی کہ جاؤ میرے بندے کو آم دے کر آؤ اس نے کل بچوں کے پاس جانا ہے۔ اس پر وہ بہت حیران ہوا کہ ان لوگوں کا خدا تعالیٰ پر کتنا پختہ یقین ہے۔ آم بھیجنے والے میاں محمد انور سہگل صاحب اور لے کر آنے والے ان کے بیٹے محمد طاہر سہگل تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

چنانچہ عمر بھٹہ کا میرے ساتھ اچھا مضبوط تعلق قائم ہو گیا۔ اب وہ ربوہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر گھر والوں اور سپاہ صحابہ والوں کی مخالفت سے بھی گھبراتا تھا۔ ایک دن مجھ سے دریافت کیا کہ ربوہ میں کوئی ہوٹل ہے۔ میں نے عرض کیا ہاں ہے۔ کہنے لگا کتنے افراد کی اس میں گنجائش ہو گی۔ میں نے کہا کم از کم دو ہزار افراد اس میں قیام کر سکتے ہیں اور مزید یہ کہ ہوٹل میں قیام و طعام مفت ہے۔ اس پر بڑا حیران ہوا۔ بہرحال جب تک میں ملتان میں رہا اس نے مضبوط تعلق رکھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے ملتان میں بڑے بڑے امیر خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعت میں شامل تھے لیکن بجٹ بہرحال کم تھے۔ ایک دن گلگشت کالونی کی (بیت

الذکر) میں مَیں درس القرآن دے رہا تھا۔ اتفاق سے

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَھُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ

والی آیات آ گئیں تو حاضرین کو مخاطب کر کے چندے کی تحریک کی۔ جس کا الحمدللہ اچھا اثر پڑا۔ ملتان میں بڑے بڑے کاروباری شیخ برادری کے مبائعین کے علاوہ غیر مبائعین کی بھی کافی تعداد تھی۔ جن کی اگلی نسلیں احمدیت سے منحرف ہو رہی تھیں۔ انہی میں مغیث اے شیخ بھی تھے اور بعض بڑی عمر کے غیر مبائعین، مبائعین کی مجالس میں بھی آتے تھے لیکن بیعت خلافت کی ان کو سعادت نہ مل سکی۔

1987ء سے 1991ء تک میرے عرصہ قیام ملتان بلکہ پاکستان بھر میں جماعت کی مخالفت کی آگ خوب بھڑکائی گئی تھی اور ضیاء الحق نے تو اپنی تمام توانائی جماعت کے خلاف استعمال کرنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ کبھی جماعت احمدیہ کو کینسر قرار دیتا تھا اور کبھی ان کو اسلام قبول کر کے سینے سے لگنے کی دعوت دیتا تھا لیکن بہتر سے زیادہ فرقوں کے مختلف اسلام میں سے کس اسلام کو قبول کیا جائے اس کی طرف کوئی رہنمائی نہیں کرتا تھا۔ ایک طرف جماعت کے خلاف ہر طرح کی اذیتوں کی آگ بڑے زور سے بھڑکائی جا رہی تھی۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے فرشتے سعید روحوں کو کھینچ کھینچ کر احمدیت میں شمولیت کے لیے لا رہے تھے۔ میرے 1988ء کے سال میں اللہ کے فضل سے بیس کے قریب احمدیوں کے اسماء گرامی میری 1988ء کی ڈائری میں موجود ہیں جن کو بیعت کر کے جماعت میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی طرح بعض کمزور احمدیوں سے رابطہ کر کے ان کو جماعت کی تنظیم سے وابستہ کرنے کی توفیق ملی۔ مشکلات و مصائب کے دریاؤں کو سلامتی سے عبور کرتے ہوئے دیکھتے ہی دیکھتے 17 اگست 1988ء کا دن آ گیا جس میں ایک بار پھر ایک عظیم نشان ظاہر ہوا اور احمدیوں کے لیے اذیت و تکالیف کا ایک باب بند ہو گیا۔

جماعت احمدیہ کی مخالفت کے تین ادوار

میں نے جماعت احمدیہ کی مخالفت کے تین دور اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

مخالفت کا پہلا دور

1953ء میں پنجاب میں جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دیے جانے کے لیے احراری مولویوں کو جو سرے سے قیام پاکستان کے علی الاعلان مخالف تھے، جماعت کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا۔ ایک زوردار تحریک جماعت کی مخالفت میں چلائی گئی۔ علماء کو خریدا گیا۔ پنجاب بھر کے اخبارات کو جی بھر کر نوازا گیا اور جماعت کی مخالفت میں متواتر لکھنے پر آمادہ کیا گیا۔ احمدیوں کے گھر جلائے گئے۔ اموال لوٹے گئے۔ کاروبار تباہ کیے گئے اور اس سب شیطنت کے لیے ختم نبوت کے مقدس نام اور مقام کو استعمال کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ صرف نوائے وقت اخبار جس کے مدیر و مالک اس وقت حمید نظامی مرحوم تھے، وہ دولت کے لالچ میں نہ آیا اور برابر سچائی اور حقیقت کی عکاسی کرتا رہا۔ اس نے عدالتی تحقیقات میں بھی سچائی کے اظہار کو ڈنکے کی چوٹ واضح کیا۔

گورنر پنجاب نے خلیفۂ وقت کی ذات والا صفات پر ہاتھ ڈالنے کے خواب دیکھے۔ لیکن خدائے واحد و یگانہ جس نے جماعت احمدیہ کو دنیا بھر میں (دین حق) کا جھنڈا سب جھنڈوں سے اونچا لہرانے کے لیے قائم کیا ہے، وہ اپنی جماعت کے لیے دوڑ کر آیا اور مخالفین کے تمام منصوبے دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گئے۔ گورنر خلیفۂ وقت کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے خواب دیکھتے دیکھتے اپنی گورنری سے ہاتھ دھو بیٹھا بلکہ ہمیشہ کے لیے بساط سیاست سے یوں غائب ہوا کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اسی طرح وزیر اعلیٰ جو اس وقت تحریک کی کامیابی کی کامل امید پر خود کو مستقبل کا وزیر

اعظم پاکستان دیکھنے کے سپنے دماغ میں سجائے بیٹھے تھے ایوانِ اقتدار سے باہر دھکیل دیے گئے اور زندگی بھر بساط سیاست کے مردود مہرے ہی تصور ہوئے۔

لوٹنے نکلے تھے جو امن و سکونِ بے کساں
خود انہی کے لُٹ گئے حسن و شباب زندگی

مخالفت کا دوسرا دور

1953ء کے فسادات پنجاب کے بعد 1958ء میں کمانڈر انچیف پاکستان محمد ایوب صاحب نے پاکستان میں مارشل لاء لگا دیا اور پھر مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں حصوں کی صوبائی حکومتوں کو ایک ایک اکائی میں بدل دیا۔ اب صوبائی حکومتیں ختم کر دی گئیں اور مغربی اور مشرقی پاکستان قرار دے دیا گیا۔ دوسری طرف ہندوستان نے پاکستان پر 1965ء میں حملہ کر کے حملہ کے دن ہی شام کو لاہور پہنچ کر نا ؤ نوش کے جشن کا اعلان کیا لیکن اسے یہ حملہ لوہے کے چنے چبانے سے بھی بہت مہنگا پڑا۔ دنیا بھر میں اس کی خوب رسوائی ہوئی۔ مگر ایوب خان کے بعد یحییٰ خان کے دور میں پاکستان دو نیم ہو گیا۔ اب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ تاہم رہے سہے پاکستان میں بھرپور سیاسی ڈھانچہ استوار ہوا۔ ایک وفاقی جمہوری آئین مرتب ہوا جس میں ذوالفقار علی بھٹو جس کو اقتدار کے ایوانوں تک رسائی کے لیے جماعت احمدیہ نے ہر طرح بھرپور مدد کی تھی، وزیر اعظم پاکستان قرار دیا گیا۔

اقتدار کے حصول کے بعد بھٹو نے اپنے آپ کو عالمی سطح پر منوانے کے لیے امت مسلمہ کی وحدت کا ڈول ڈالا اور پاکستان میں ایک اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز کو روبعمل لانے کی سعی کی گئی جس میں شاہ فیصل کو امت مسلمہ کا سربراہ اور خلیفۃ المسلمین قرار دلوانا مقصود تھا لیکن اس پر اتفاق کا حصول ممکن نہ ہو

سکا اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ خلیفہ تو خدا بناتا ہے۔ ساتھ ہی خلافت احمدیہ کو ختم کرنے کی تجویز بھی طے پائی۔ چنانچہ ایک بار پھر احمدیوں کے خلاف آگ بھڑکانے کا فیصلہ ہوا۔ احمدیوں کو ان کے گھروں سمیت جلایا جانے لگا۔ ان کا اس قدر سخت سوشل بائیکاٹ کیا گیا کہ ان کے پاس کسی بھی طرح ضروریات زندگی نہ پہنچ پائیں۔ گھروں پر پہرے دار مقرر کیے گئے کہ اہل خانہ کو گھر سے باہر نکل کر کسی بھی چیز کے حصول کی کوشش سے قطعی طور پر محروم رکھا جائے۔ احمدیوں کی (بیوت الذکر) کو جلا دیا گیا۔ تحریک کا بنیادی مقصد تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو عوامی مطالبہ قرار دے کر اس کی راہ ہموار کی جائے وغیرہ۔

جماعت کی ہزاروں ایکٹرز مین سراسر ظلم کی راہ سے قومیالی گئی جس کا کوئی قانونی جواز نہ تھا اور یہاں تک کہا گیا کہ جماعت احمدیہ کے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی پکڑا دوں گا اور یہ بھی بڑ ہانکی گئی کہ میں ان کے ساتھ وہ کروں گا جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ تحریک کے نتیجہ میں احمدیوں کے کاروبار تباہ کروائے گئے، گھر جلائے گئے۔ الغرض جو بھی ہو سکا کروایا گیا اور بزعم خویش جماعت کی تباہی اور بربادی کو یقینی بنا دیا گیا۔ خلافت احمدیہ کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والوں کو یہ علم نہ تھا کہ خلیفہ خدا بناتا ہے۔ ساری دنیا بھی مل کر کسی کو خلیفہ بنانا چاہے تو وہ نہیں بنا سکتی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہو اور جس کو خدا خلیفہ بناتا ہے ساری دنیا بھی اس کی مخالفت کرے تو اسے کوئی خلافت سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ پس خدا کی تقدیر ظاہر ہوئی اور خلافت احمدیہ کو مٹانے والے خود مٹ گئے۔ اور جماعت کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی پکڑانے کے خواب دیکھنے والے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوئے جو ان کو نہ ملی۔

جو خدا کا ہے اسے للکارنا اچھا نہیں
ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے روبہِ زار و نزار

مخالفت کا تیسرا دور

تیسرا دورِ مخالفت وہ تھا جس میں جماعت احمدیہ کے خلاف آرڈیننس جاری کیا گیا۔ جس میں کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے، السلام علیکم کہنے، سینہ پر کلمہ کا بیج لگانے، اذان دینے وغیرہ کے متعلق سزاؤں کا قانون بنایا گیا اور اپنے زعم میں یہ گمان کیا گیا کہ اس طرح جماعت کی ترقی رک جائے گی۔ بلکہ بہت سارے لوگ احمدیت سے منحرف ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس خدائے ذوالعرش کا فعل کیا ہے۔ جماعت احمدیہ اب دنیا کے 210 سے زیادہ ممالک میں پھیل چکی ہے۔ یورپ کے ایوانوں میں (دین حق) اور احمدیت کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ اسلام کے پُر امن مذہب ہونے کی عالمی سطح پر آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ ہر سال لاکھوں لوگ دنیا کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں احمدیت کی آغوش میں آ رہے ہیں اور خلافت احمدیہ کے ٹھنڈے سائے تلے روحیں تسکین پا رہی ہیں۔ یہ شجرہ طیبہ جس کی جڑیں زمین کے پاتال تک اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، ہر لمحہ اور ہر آن تازہ بتازہ روحانی پھل دے رہا ہے۔ کیا مشرق اور کیا مغرب اور کیا شمال اور کیا جنوب، دنیا کی تمام اطراف سے سعید روحیں کھنچی چلی آ رہی ہیں۔ یہ وہ خلافت الٰہیہ ہے جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کر رہا ہے جسے نہ کوئی چھین سکتا ہے اور نہ ہی اللہ کے سوا کوئی دے سکتا ہے۔ پس اے غور کرنے والو غور کرو اور آزما کر دیکھو کہ یہی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے جس کے قیام کا وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان والی روایت میں دیا تھا کہ

ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ

پس اس خلافت سے وابستہ ہو کر چمٹ جاؤ کہ خدا تمہیں قبول کرے گا اور اپنی محبت تمہارے دلوں میں ڈالے گا۔ نہ دنیا بھر کے مولوی، نہ دنیا بھر کے حکمران، نہ ظلم و

ستم کے خوگر جہادی ہمارا کچھ بھی بگاڑ سکیں گے۔ اگر ہمارا خدا تعالیٰ سے پختہ تعلق ہو۔ اے اللہ تو ہمارا ہے۔ ہم تیرے ہیں۔ ہم تیرے ہیں۔ ہم تیرے ہیں۔ تیرا فضل چاہتے ہیں۔ تیری مغفرت اور تیرا رحم وکرم چاہتے ہیں۔ تو ہمیں یہاں بھی سرخرو کر اور آخرت میں بھی اپنی پناہ اور رحمت کے سایہ میں لے لے۔ آمین

پس ہم نے بھی دیکھا اور دنیا بھر کے لوگوں کی نظروں سے یہ بات مخفی نہیں رہی۔ اہل پاکستان بھی اس سے بے خبر نہیں کہ کسی بھی شخص یا جماعت کی مخالفت جماعت احمدیہ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکی اور نہ کر سکے گی۔ انشاء اللہ۔ باقی قربانیاں تو الٰہی جماعتوں کا فخر اور کامیابی کی ضمانت ہوتی ہیں۔ قربانی کے بغیر تو کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ احمدیوں کو ناٹ مسلم قرار دینے والا فیصلہ جس پر خوشی سے بغلیں بجائی گئی تھیں اور جماعت احمدیہ کے نیست و نابود ہونے کی امیدیں باندھی گئی تھیں، اس کے متعلق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جنہوں نے از خود خلیفۃ المسلمین بن کر افرادِ خاندان اور چند مزید افراد سے بیعت بھی لی تھی، اس بات کا اقرار کیا ہے کہ 1974ء کا فیصلہ احمدیوں کو ذرہ بھی نقصان نہیں پہنچا سکا اور پھر اس کی خود ساختہ خلافت المسلمین بھی ہوا میں اس طرح اڑ گئی کہ اس کا نام ونشان بھی مٹ گیا۔ اور خود امیر المومنین بننے کے سپنے دیکھنے والے خدا تعالیٰ کی قہری تجلی کا شکار ہوئے۔

فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُوۡلِی الۡاَبۡصَارِ

افغانستان میں بھی قیام خلافت کا ڈول ڈالا گیا جو دنیا کو امن وسکون مہیا کرنے کی بجائے دنیا کا امن برباد کرنے اور قتل و غارت گری، انسانی خون سے ہولی کھیلنے اور دہشت گردی کے ذریعہ اموال و املاک کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ جبکہ خدا کی قائم کردہ خلافت امن واستحکام اور اشاعت دین کی ضامن ہوتی ہے جس کی واضح مثال خلافت احمدیہ ہے۔

قادیان کا مبارک سفر 1988ء

1988ء کا سال میرے لیے خوشیوں کی بہت بڑی نوید لے کر آیا۔ اس سال کئی سال کے بعد قادیان کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے لیے پاکستان سے وفد کی شمولیت کی ہندوستان کی حکومت نے اجازت دے دی۔ جیسے ہی یہ بات میرے علم میں آئی میں نے فی الفور اس کے لیے مرکز پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ پاسپورٹ میرے پاس موجود تھا۔ ربوہ آیا۔ ناظر صاحب خدمت درویشان کی خدمت میں قافلہ میں شمولیت کی اجازت چاہی۔ ناظر صاحب نے فرمایا کہ ایک ہفتہ کی اجازت ملی ہے وہ بھی اس طرح کہ پہلے قافلہ دہلی جائے گا وہاں سے پنجاب کا انٹری پرمٹ لے کر قادیان آئے گا اور قادیان سے واپس دہلی جائے گا اور پھر براستہ اٹاری پاکستان آئے گا۔ ایک ہفتہ میں سے قریباً چھ دن اس طرح گزر جائیں گے۔ صرف ایک دن قادیان میں قیام کے لیے ملے گا۔ اس لیے جانا مفید نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تو ایک دن کہتے ہیں مجھے ایک گھنٹہ بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار پر حاضری کے لیے مل جائے تو میں اسے سعادت سمجھوں گا۔ اس پر اجازت دے دی۔ وہاں سے ناظر صاحب اصلاح وارشاد کی خدمت میں اجازت کی سفارش کے لیے حاضر ہوا کیونکہ صدر صاحب صدر انجمن احمدیہ نے اصل اجازت دینی تھی۔ انہوں نے دریافت کیا کہ آپ ناظر صاحب خدمت درویشان سے ملے ہیں انہوں نے کیا کہا۔ میں نے ان کے ساتھ گفتگو کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے بھی بآسانی سفارش کر دی۔ ملتان میں ایک دوست شیخ نصیر احمد صاحب بھی تیار تھے۔ ان کو فون کر کے ربوہ بلا کر ان کا پاسپورٹ بھی جمع کروا دیا۔ باقی کرنسی وغیرہ کا انتظام کیا۔ ویزہ مل گیا۔ معین تاریخ پر لاہور پہنچے۔ خاکسار کو امیر قافلہ مقرر کر دیا گیا۔ ریل سے اٹاری پہنچے۔ شام

تک امیگریشن وغیرہ سے فارغ ہو کے وہاں سے گاڑی میں سوار ہو کر دہلی روانگی ہوئی۔ ان ایام میں پنجاب میں سکھ اپنے مطالبات کے لیے فساد برپا کر رہے تھے۔ اس لیے پنجاب بھر کے کسی ریلوے سٹیشن پر گاڑی نہ رکی اور صبح صبح دہلی پہنچ گئے۔ قادیان کے بعض احباب بھی انتظام کے لیے دہلی پہنچے۔ گاڑی سے اترنے پر انہوں نے پاسپورٹ جمع کر لیے۔ اپنے آدمی ہمارے سامان کے پاس حفاظت کے لیے مقرر کر دیے اور ہمیں کہا کہ جاؤ دہلی کی سارا دن سیر کر کے شام کو واپس آ جاؤ۔ رات کی گاڑی سے واپس امرتسر روانہ ہوں گے۔ چنانچہ احبابِ قافلہ گروپ بنا کر سٹیشن سے باہر نکلے تو وہاں ٹورسٹ بسیں کھڑی تھیں جو پندرہ پندرہ روپے فی کس لیتے تھے اور دن بھر دہلی کے اہم مقامات کی سیر کروا کر شام کو سٹیشن پر چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک بس میں ہم دس بارہ احباب سوار ہو گئے۔ دن بھر دہلی کا لال قلعہ، قطب صاحب کی لاٹ، اندرا گاندھی کا میوزیم، برلا مندر، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء اور بعض دیگر اہم جگہیں دیکھ لیں۔ ایک ہوٹل کے لان میں مَیں نے احباب کو نماز جمعہ پڑھائی۔ اس دن جمعہ تھا۔ دہلی میں ایک ظروف سازی کا کارخانہ بھی دیکھا جس میں پیتل اور تانبے کے برتنوں پر نقش ونگار بنائے جاتے ہیں۔ ایک اہم چیز جو دہلی میں دیکھی کہ سارے شہر میں سوائے ہندوستان کی اپنی بنائی ہوئی موٹر کار کے جس کو ایمبسڈر کا نام دیا گیا تھا شاید ہی کوئی کار نظر آئی ہو۔ اگر آئی بھی تو وہ بھی بہت پرانے ماڈل کی۔ اس سے ہندوستانیوں کی قومیت پرستی کا بڑا ثبوت ملتا ہے۔ بسیں بھی ٹاٹا وغیرہ کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں۔ جبکہ پاکستان میں نت نئے ماڈل کی پرتعیش گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آتی ہیں اور شوقین لوگ لمبی لمبی گاڑیوں کی خریداری میں مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں جس کے نتیجہ میں پاکستان اقتصادی طور پر ہندوستان سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

کھانے کے لیے ایک ہوٹل پر گئے وہاں ابلے ہوئے چاول اور دال وغیرہ تھی۔

دال کو جس خوردنی تیل سے بگار لگائی گئی تھی وہ اتنا بودار تھا کہ اسے کھانا مشکل ہو گیا۔ دہلی سٹیشن سے باہر کے ہوٹلوں پر بھی کھانے کا معیار پاکستان کی نسبت انتہائی کمتر درجے کا تھا۔ دن بھر دلی دیکھی، دلی والے دیکھے۔ شام کو واپس سٹیشن پر آئے تو زبردست خوشخبری ملی کہ ہندوستانی حکومت نے درویشوں کی درخواست پر پاکستان سے آنے والے قافلہ کے افراد کو واپسی پر اٹاری سے پاکستان جانے کی اجازت دے دی ہے جس کے نتیجہ میں اہل قافلہ کو پانچ دن قادیان میں قیام کی اجازت مل گئی۔ وہ تسلی سے جلسہ میں شریک ہو سکے۔

چنانچہ رات کی گاڑی سے سوار ہو کر صبح کو امرتسر اور وہاں سے بسوں میں سوار ہو کر قادیان پہنچ گئے۔ اہل قافلہ کو مدرسہ احمدیہ میں ٹھہرایا گیا۔ مجھے اور نصیر کو تو میرا بھانجا شمس الدین ابن مولوی فیض احمد صاحب قریب ہی جماعتی کوارٹرز میں اپنے گھر لے گیا۔ سالوں بعد بڑی آپا سے ملاقات ہوئی۔ بعارضہ فالج بیمار ہیں۔ لیکن ہوش و حواس درست ہیں۔ والدہ کی وفات کے بعد میری پرورش میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بہت خوش ہوئیں۔ باقی بچے بھی خوش ہوئے۔ بہنوئی نے دوسری شادی کر لی ہوئی ہے۔ وہ دوسری بیوی کے ساتھ اسی گھر میں ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ قادیان 32 سال بعد دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ پاکستان بننے سے قبل جلسہ ہائے سالانہ پر والد صاحب کے ساتھ آتا تھا تو قادیان کی گلی گلی سے واقف ہو چکا تھا۔ الغرض (بیت) مبارک، بیت الفکر، بیت الدعا، بیت الریاضت، ان تمام جگہوں میں جی بھر کے دعائیں کیں۔ جلسہ کی کارروائی سنی۔ سٹیج پر بیٹھا تھا۔ اس کی تصویر بھی ٹیلی کاسٹ ہو گئی۔

سیالکوٹ سے ترک وطن کے بعد قادیان میں آباد ہونے والی سردار ستنام سنگھ باجوہ کی فیملی احمدیوں سے گہرے روابط رکھتی ہے۔ اس نے جلسہ سالانہ کے مہمانوں کو چائے پر بلایا۔ خاکسار بھی بحیثیت امیر قافلہ پاکستان شریک ہوا۔ شکریہ ادا کرتے

ہوئے خاکسار نے باہمی میل جول اور مہر ومحبت کے اس طرزِ عمل کو خوب سراہا جس کا حاضرین پر بہت اچھا اثر پڑا۔

ایک نماز فجر کے بعد نماز باجماعت کی اہمیت پر (بیت) اقصیٰ میں درس بھی دیا۔ پاکستان سے شریک جلسہ ہونے والے احباب کا (بیت الذکر) میں تعارف بھی کروایا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب سے بھی ملاقات کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ اس مقدس سفر سے 22 دسمبر 1988ء کو براہ اٹاری واپس پاکستان آیا۔ نصیر احمد ملتان روانہ ہو گیا اور میں رات گئے ربوہ آ گیا۔ لاہور میں خوب بارش ہو رہی تھی۔ اب اہل ربوہ جو وقت کی قلت کے پیش نظر پس و پیش کرتے ہوئے نہ گئے وہ یقیناً پیچھے رہ جانے پر متاسف تھے۔

وذالک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء

سفر قادیان جس نے دہلی بھی دیکھنے کا موقع فراہم کیا اور آثار قدیمہ دیکھ کر فاعتبروا یا اولی الابصار کا مفہوم سمجھنے میں مدد کی۔ نیز قادیان کے مقدس مقامات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جلوے قلب و روح کی طمانیت اور افزائش ایمان کا باعث بنے۔ اب تک یہ کیفیت روحانیت میں بالیدگی اور تازگی کا احساس قائم رکھے ہوئے تھی۔ الحمدللہ۔ الحمدللہ کہ اس مبارک و مقدس سفر کی اس نے توفیق دی۔

قادیان سے واپسی کے ساتھ ہی 1988ء اپنی جلو میں ایک پر ہیبت نشان لیے رخصت ہو رہا تھا۔ ضیاء الحق اپنے امیر المؤمنین بننے اور پاکستان میں خودساختہ اسلام کے نفاذ کے منصوبے باندھتے ہوئے جماعت احمدیہ کے افراد کے خلاف ظلم و جور کی کہانیاں تحریر کرتے کرتے اور جماعت کے عزم و استقلال کی چٹان کے ساتھ سر ٹکراتے ٹکراتے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا اور اپنے پیچھے افراد جماعت کے بنیادی حقوق کی تلفی کا مکروہ قانون چھوڑ گیا۔

بھٹو اور ضیاء الحق اور ان کے ہمنوا مولویوں نے جماعت احمدیہ کو مالی طور پر مفلوج کرنے کے جوخواب دیکھے تھے اب وہ چکنا چور ہو رہے تھے۔ احمدی دھڑا دھڑ بیرونی ممالک کی طرف ہجرت کر رہے تھے جس کے نتیجہ میں ایک طرف پاکستان بہترین ٹیلنٹ رکھنے والی افرادی قوت سے محروم ہو رہا تھا تو دوسری طرف جماعت کے مالی وسائل میں زور شور سے اضافہ ہو رہا تھا۔ تیسری طرف ایک ملک میں احمدیوں کو ختم کرنے کے آرزومند انہیں دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلتے ہوئے بڑی حیرت اور حسرت سے دیکھ کر کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔ اور احمدی

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ

کے نظارے دیکھ رہے تھے۔ واہ اللہ تیری بھی کیا شان ہے۔ ایک طرف تو تُو اپنے دوستوں پر ان کے دشمنوں کو کتوں کی طرح مسلط کر دیتا ہے تو دوسری طرف تیری خاص آنکھ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

شجر احمدیت کی دوسری صدی کا آغاز

1988ء کے اختتام کے ساتھ ہی شجر احمدیت اپنی عمر کی دوسری صدی کا آغاز کیا چاہتا ہے اور خدا کی تقدیر دنیا بھر میں (دین حق) کے غلبہ کے لیے کیسے کیسے عظیم الشان انتظام کر رہی ہے۔ یہ سب اہل بصیرت دیکھ رہے ہیں مگر شب کوری اور اندھراتا کے مریض اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ 1988ء کے سال کا اختتام احمدیوں کی مختلف النوع بے شمار قربانیوں کو اپنے جلو میں لیے نخل احمدیت زندگی کے سو سال پورے کرتے ہوئے اپنے سن بلوغ کے آغاز میں پوری شان وشوکت اور تمکنت سے داخل ہوا۔ احمدی احباب خوشی سے اچھلنے لگے اور بے اختیار تسبیح وتحمید اور درود شریف کا ورد کرتے ہوئے صدقات وخیرات میں پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اللہ تعالیٰ کے

دین کی عالمگیر اشاعت کے لیے اموال و جائیدادوں کے علاوہ اپنے بچے اور بچیاں بھی وقفِ نو کی تحریک میں دھڑا دھڑ خلیفۂ وقت کی خدمت میں پیش کرنے لگے۔ یوں یہ قافلہ پہلے سے بھی زیادہ مستعدی اور تیزی سے (دینِ حق) کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا جذبۂ بے اختیار لیے رواں دواں ہوا اور آج حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی زیرِ سرکردگی پوری آب و تاب اور شان و شوکت سے رواں دواں ہے۔ اور جماعت احمدیہ کے ذریعہ غلبۂ دین علی الادیان کی قرآن مجید نے آج سے چودہ سو سال قبل کتنی حقیقی اور پیاری تصویر کھینچی ہے۔

ذٰلِکَ مَثَلُهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَمَثَلُهُمۡ فِی الۡاِنۡجِیۡلِ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیۡظَ بِهِمُ الۡکُفَّارَ . (الفتح: 30)

ترجمہ: یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور ان کی مثال انجیل میں ایک کھیتی کی طرح ہے جو اپنی کونپل نکالے پھر اسے مضبوط کرے پھر وہ موٹی ہو جائے اور اپنے تنے پر کھڑی ہو جائے۔ کاشتکاروں کو خوش کر دے اور کفار کو غیظ و غضب میں مبتلا کرے۔

اہلِ علم و عرفان اور تقویٰ کے لیے کتنی پیاری مثال ہے۔ جب آج سے سو سال قبل تخمِ احمدیت زمین میں بویا گیا ایک نرم و نازک کونپل نکلی جس کی حفاظت اور آبیاری اور پرورش کے لیے 23 مارچ 1989ء کو چالیس اہلِ ایمان نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر عہد باندھا۔ کونپل کے نکلتے ہی مخالفانہ آندھیاں بھی زور و شور سے چلنے لگیں اور شجرِ احمدیت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے بلند بانگ دعاوی کیے گئے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اس درخت کی حفاظت کی اور بڑھتے بڑھتے یہ ایک سو سال کی عمر کو پہنچ کر اپنے تنے پر مضبوطی سے کھڑا ہو گیا اور مخالفین آج تک غیظ و غضب سے پیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ نہ کر سکے اور نہ کچھ کر سکیں گے۔ جتنی بار چاہیں مخالفت کی آگ جلا

کر اس میں احمدیوں کو جلانے کی کوشش کر دیکھیں جماعت ہر بار ہر مخالفت سے نہ صرف سرخرو ہو کر نکلے گی بلکہ پہلے سے بڑھ کر جان، مال، وقت، عزت اور جذبات کی قربانی کے لیے ہر لمحہ تیار ہو گی اور ہرگز نہیں تھکے گی نہ ماندہ ہو گی حتیٰ کے (دین حق) کو تمام دنیا پر غالب آجائے اور دنیا میں امن و آشتی اور شرف انسانیت کا قیام اور دنیا سے مصنوعی پیدا کیے گئے دکھوں کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

اب محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعت احمدیہ دوسری صدی کے آغاز کے پہلے سال 1989ء میں داخل ہو چکی تھی۔ اس سو سال میں ہماری کم از کم تین نسلیں کام آچکی تھیں۔ پرانی نسلوں کی باقیات اور نئی نسلوں کو ان کے ماضی و حال اور مستقبل سے روشناس کرانے کے لیے، آگہی اور شعور بخشنے کے لیے بلیغ کوششوں کا آغاز ضروری تھا۔ جس کے لیے مرکز نے مختلف جماعتوں میں جلسہ ہائے صد سالہ جوبلی کرنے کا پروگرام بنایا۔ ضلع ملتان کی جماعتوں کے سنٹرز مقرر کر کے قریبی جماعتوں کو وہاں جمع کیا جانا طے ہوا اور ساتھ کھانے کا بھی انتظام کرنے کی ہدایت ملی۔ چنانچہ ضلع ملتان میں ملتان شہر، دنیا پور، چک نمبر 366، لودھراں، چک نمبر 344 میں جلسوں کا پروگرام بنایا گیا۔ ان جلسوں میں مختلف مقررین نے سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، سیرت حضرت مسیح موعود علیہ السلام، اختلافی مسائل، اعتراضات کے جوابات وغیرہ موضوعات پر مفصل تقاریر کیں۔ بعض غیر از جماعت احباب بھی شریک جلسہ ہوتے رہے۔ کھانا بلا تخصیص تقسیم ہوا اور ان جلسوں کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی ہوئی۔ ان جلسوں میں مجھے بھی مختلف موضوعات پر تقاریر کی سعادت ملی۔ الحمد للہ۔ دورانِ سال رمضان المبارک کے ایام میں بیت حسین آگاہی کے علاوہ حلقہ میں مختلف سنٹرز مقرر کر کے درسِ قرآن مجید دیا جاتا رہا۔ آنے والے احباب کے سوالات کے جوابات دیے جاتے رہے۔

(بیت) حسین آگاہی کے قریب ہی اوپر قلعہ کہنہ کی حدود میں مکرم مولانا حامد سعید

کاظمی کا مدرسہ ہے وہاں سے ایک دن تین چار طلباء (بیت) میں آ گئے۔ میری دعوت پر وہ قریب آ کر بیٹھ گئے اور احمدی عقائد دریافت کیے۔ جب سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر انہیں بریفنگ دیتے ہوئے جنگ احد کے واقعات کے بیان پر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے تو بے حد متاثر ہوئے۔

میرا شہر کے دوسرے حصوں میں جانے کا راستہ قلعہ کے اوپر سے گزرتا تھا۔ اکثر و بیشتر ان سے سرِ راہ ملاقات ہوتی تو وہ سلام ضرور کرتے۔ ملتان شہر اور ضلع کی جماعتوں کے علاوہ انہی ایام میں ایک دن امیر صاحب ڈیرہ غازی خان کا امیر صاحب ملتان کو فون آیا کہ علی الصبح نذیر احمد رہان کو ملتان سے ڈیرہ غازی خان کے لیے چلنے والی پہلی ویگن سروس پر ضرور بھیج دیں ہم بس سٹینڈ ڈیرہ غازی خان پر ان کے منتظر ہوں گے۔ چنانچہ اگلی صبح محترم امیر صاحب ملتان کے ارشاد پر ڈیرہ غازی خان روانہ ہوا۔ امیر صاحب ڈیرہ غازی خان بس سٹینڈ پر منتظر تھے وہاں سے چوٹی زیریں کی ایک جماعت جس کے صدر چوہدری بشیر احمد صاحب چیمہ ایک زمیندار تھے۔ انہوں نے اپنے ڈیرہ پر جلسہ کا انتظام کیا ہوا تھا جو ڈیرہ غازی خان سے کافی فاصلہ پر تھا۔ خیر بغیر ٹھہرے جلسہ کے لیے امیر صاحب کی گاڑی میں امیر صاحب، ان کے صاحبزادے اور دو مربیان کے ساتھ روانگی ہوئی۔ مقام جلسہ گاہ پہنچے اور قریباً دو گھنٹہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کے بارہ میں خاکسار نے پنجابی میں تقریر کی۔ بعد ازاں دو صد کے قریب غیر از جماعت احباب کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ یہاں سے واپسی پر ایک مقام پر آ کر ایک بچے کو بچاتے ہوئے ہماری کار ایک برسیم کے کھیت میں اتر کر ایک پہلو پر ہوگئی۔ قریب کے افراد نے آ کر گاڑی کو سیدھا کیا تو گاڑی بھی سٹارٹ ہوگئی اور کسی بھی فرد کو نہ تو کوئی خراش آئی اور نہ ہی کوئی ادنیٰ سا بھی نقصان ہوا۔ جس کا باعث اس سفر کے فی سبیل اللہ ہونے کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

زندگی میں اب تک دو بار روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے لیکن دونوں بار ہی محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں سفر کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ نے خراش تک سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

بچوں کی ربوہ منتقلی، بعض مشکلات اور مکان کی توسیع

1989ء کے مارچ کے آخر میں اغلباً مجلس مشاورت تھی اور اپریل کے پہلے عشرہ میں رمضان المبارک شروع ہونے والا تھا۔ میرا مکان کرایہ دار نے ربوہ میں مہربانی کرتے ہوئے خالی کر دیا تھا۔ دوسرا بچوں کو اتنی دور رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کیونکہ دونوں بیٹے گھر پر نہ تھے۔ رفیق احمد کی شادی کر دی ہوئی تھی وہ اپنی بیوی کے ساتھ ربوہ آ گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی ٹیچر تھی۔ بشیر احمد بھی حیدر آباد میں حصول تعلیم کے ساتھ ملازمت بھی کر رہا تھا۔ اس لیے محترم ناظر صاحب سے بچوں کو ربوہ منتقل کرنے کی اجازت لی جو بآسانی مل گئی اور سفر خرچ کے لیے پیشگی اور رخصت بھی مل گئی۔ چنانچہ سندھ روانہ ہوا۔ محترم حاجی صاحب کو پروگرام سے آگاہ کیا۔ دوڑ سے مکرم نثار احمد صاحب ابن چوہدری رسول بخش صاحب کا ٹرک کرایہ پر لیا۔ معین تاریخ غالباً سات اپریل کو وہاں سے سامان تو بذریعہ ٹرک ربوہ ارسال کیا اور بچوں کو بذریعہ ریل لے کر ربوہ پہنچ گیا۔ ہمشیرہ کے ہاں ایک دن قیام کے بعد اپنے مکان میں سامان وغیرہ سیٹ کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا جس میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ مثلاً افرادِ خاندان زیادہ تھے اور رہائش کے لیے صرف دو کمرے تھے۔ سامان بھی اچھا خاصا تھا۔ رفیق احمد کی شادی کا سامان بھی تھا۔ اب اس کی بیوی اور دو بچیاں بھی یہاں تھیں۔ بارش آتی تو سامان میں بعض چیزیں بھیگ جاتیں۔ تاہم ان کو چھوڑ کر خود ملتان چلا گیا۔ ان ایام میں رمضان المبارک تھا۔ (بیت الذکر) میں درس قرآن مجید اور تراویح

کا انتظام کیا۔بعض احباب افطاری کا سامان بھی کافی مقدار میں بھیج دیتے اس لیے دور سے آنے والے احباب کو روزہ کے باعث آنے سے مشکل پیش نہ آتی۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔شیخ تنویر برادران اس بارہ میں خاصا تعاون کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے۔دن کے وقت مختلف حلقہ جات میں لجنات کے لیے درس القرآن کا انتظام کر کے وہاں درس دیا جاتا رہا۔اغلباً عید کی نماز ملتان ادا کر کے وہاں سے ربوہ آیا اور بچوں سے ملا۔

ربوہ آنے سے پہلے بچوں کے لیے سردیوں گرمیوں میں نواب شاہ سے اکٹھا کپڑا خرید کر دو دو جوڑے بنا دیے جاتے تھے۔ربوہ آئے تو یہاں کے معاشرے میں ضم ہونے کے لیے مشکلات پیش آنا شروع ہو گئیں۔مثلاً کسی عزیزہ کی شادی میں شریک ہونا ہے تو مہندی کی تقریب کے لیے الگ جوڑا،شادی کے دن کے لیے الگ کپڑے اور ولیمہ کے لیے بھی الگ جوڑے کے بغیر گزارہ نہیں۔میری تین بچیاں ابھی قابلِ شادی تھیں۔ ہر تقریب پر نو جوڑے بنانا خاصا مشکل ہو گیا۔سندھ میں تو عید پر بھی ایک ہی جوڑے سے کام چل جاتا تھا۔دوسری طرف جگہ کی تنگی کا بھی مسئلہ آن پڑا۔ایک دن دفتر گیا تو مکرم نصیر احمد صاحب طارق اکاؤنٹنٹ نظارت اصلاح و ارشاد کہنے لگے اب تو تم بڑے خوش ہو۔بچے ربوہ آ گئے ہیں۔ میں نے جواب دیا آپ خوشی کا سوچ رہے ہیں میں مشکلات کا شکار ہو گیا ہوں۔دو کمرے ہیں۔سامان بھی ان میں پورا نہیں آ رہا۔ بیٹے کی بھی شادی ہوئی ہے۔ بہو کو بھی الگ کمرہ چاہیے۔ تین بیٹیاں اور ان کی والدہ کے لیے صرف ایک کمرہ ہے۔اب سامان کہاں جائے۔

نصیر صاحب نے کہا کہ مکان کے لیے قرضہ کی درخواست دو۔ میں نے عرض کیا کہ مکان تو پہلے ہی قرض لے کر بنایا گیا تھا لیکن وہ اب ادا ہو چکا ہے۔ کہنے لگے کہ اب مرمت کے لیے قرض کی درخواست دے دو۔میں نے کہا کہ کسی مرمت کی ضرورت

نہیں۔ کہنے لگے کچھ لکھو تو سہی۔ میں نے ایک درخواست صدر صاحب صدر انجمن کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھی کہ میرا کنبہ اتنے افراد پر مشتمل ہے۔ مکان چھوٹا ہے۔ رہائش مشکل ہے۔ اس سے قبل مکان قرضہ لے کر بنایا تھا وہ قرضہ ادا ہو چکا ہے۔ میرا پلاٹ بڑا ہے اور توسیع کی خاصی گنجائش ہے۔ از راہِ کرم مجھے پچیس ہزار روپے قرضہ مکان عنایت کیا جائے جو حسبِ طریق میرے الاؤنس سے وضع کر لیا جایا کرے۔ غالباً اس وقت نظارت اصلاح وارشاد کا چارج صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب کے پاس تھا۔ ان کی خدمت میں درخواست پیش کی گئی۔ انہوں نے از راہِ کرم بغور مطالعہ فرما کر ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد فرمایا۔ قرضہ تو انجمن نے اپنے قواعد کے مطابق دینا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں اگر آپ کی ہمدردی شامل ہوگئی تو ذرہ آسانی ہو جائے گی۔

حضرت صاحبزادہ صاحب نے درخواست پر صدر صاحب صدر انجمن کی خدمت میں برائے ہمدردانہ غور لکھ کر صدر صاحب کی خدمت میں بھجوا دی۔ وہاں سے درخواست نظارت مال خرچ کو گئی تو انہوں نے لکھا کہ بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ اس پر صدر صاحب صدر انجمن احمدیہ مکرم ومحترم چوہدری ظہور احمد صاحب باجوہ نے لکھا کہ جن قرضہ لینے والوں نے پہلی قسط لے کر مکان کی بجائے کہیں اور صرف کی ہے ان کی اگلی قسط روک کر اس درخواست دہندہ کو قرض دیا جائے۔ اس پر چوبیس ہزار اور نو صد کی رقم اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ ڈیڑھ سال بعد خاکسار کی ریٹائرمنٹ پر قرضہ کی رقم خاکسار کے واجبات قابل ادائیگی میں سے یکمشت منہا کر لی جائے گی۔

رقم مل گئی تو سابقہ ٹھیکیدار کو بلا کر اسے ایک کمرہ مزید بنا کر دینے کا اندازہ پوچھا۔ اس نے اندازہ بتایا لیکن ساتھ ہی مشورہ دیا کہ آپ کے نقشہ کے مطابق دو کمروں جتنا بڑا کمرہ، برآمدہ، چھوٹا کمرہ اور برآمدہ میں غسل خانہ جو بڑے کمرے کے ساتھ بھی

متعلق ہوگا۔اس کی چھتوں تک تعمیر کا کل پینتیس ہزار ہمیں دے دیں تو آپ کو سارے نقشے کے مطابق چھتوں تک دیواروں کی تعمیر اور اندر پلستر اور فرش سب کچھ بنا دیں گے البتہ چھت کا آپ نے خود انتظام کرنا ہے اور ساتھ کہا کہ یہ وقت ہے بنوا لو۔ مہنگائی دن بدن بڑھ رہی ہے یہ وقت پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ 1969ء میں ایک کمرہ جو صرف گیارہ صد روپے میں بنتا تھا اب وہ گیارہ ہزار تک پہنچ گیا ہے۔ میرے پاس تیس ہزار روپے کا انتظام تھا میں نے ٹھیکیدار کو بنیادیں کھودنے کے لیے کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا چھت کے لیے بالے اور چوکھٹوں کے لیے نیم کی لکڑی سندھ سے سسرال کے ہاں سے ربوہ لے آیا تھا۔ بہرحال مکان میں توسیع ہو گئی اور زیر تعمیر حصہ مکمل ہو گیا۔ چھت ڈال لی گئی اور کسی قدر رہائش کے قابل مکان بن گیا۔ الحمد للہ سلسلہ کی عنایت اور مکرم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب اور مکرم چوہدری ظہور احمد باجوہ صاحب کی مہربانی سے ایسا ممکن ہوا۔

قرضہ مکان بھی دو سال میں ادا ہو گیا۔ وصیت کے لیے قیمت مقرر کرائی گئی جو ساٹھ ہزار نو تعمیر شدہ حصہ کی مقرر ہوئی۔ چھ ہزار روپے کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کر دیا اور وصیت بھی ادا ہو گئی۔ اور قواعد کے مطابق خاکسار کے قرضہ کی رقم بھی منہا کر کے وصول کر لی گئی۔ بہرحال مرکز کے احسان کے ساتھ ٹھیکیدار احمد دین صاحب کا بھی خاکسار ممنون ہے کہ مکان تعمیر ہو گیا ورنہ دو سال بعد تو مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ مکان کی تعمیر کے بعد واپس ملتان چلا گیا اور خدمت سلسلہ میں مصروف ہو گیا۔

مکان کی تعمیر اور ادائیگی وصیت کے متعلق تفصیلی نوٹ

خاکسار کو 1958ء میں اغلباً نظام وصیت میں شمولیت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس سے قبل والد صاحب کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے کاغذات گھر سے

دستیاب ہوئے۔غربت کے باعث شرط اول مبلغ چار روپے کی عدم ادائیگی کے باعث والدصاحب کی وصیت داخل دفتر ہو چکی تھی۔ والدصاحب کی وفات کے بعدربوہ آیا تو تو دفتر وصیت سے رابطہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کا حصہ جائیداد ادا کردو تو وصیت بحال ہو جائے گی۔ چنانچہ جائیداد میں ایک پلاٹ تھا جو اس وقت سو روپے میں خریدا گیا تھا اوراب اس کی قیمت پندرہ صدروپے ہوگئی تھی۔اس کے علاوہ مزید گیارہ روپے چندہ آمد ان کی طرف نکلتا تھا۔والد صاحب 1/10 حصہ کے موصی تھے۔ چنانچہ 161 روپے ان کا حصہ جائیداد بنا جو میں نے آہستہ آہستہ وظیفہ سے بچت کر کے ادا کر دیا اور وصیت بحال ہوگئی لیکن یہاں صرف کتبہ ہی لگ سکا۔

1958ء میں خاکسار کو نظام وصیت میں شمولیت کی سعادت ملی۔ چندہ وصیت الاؤنس سے وضع ہوتا رہا۔1969 میں مکان بنوایا تو ساتھ ہی حصہ جائیداد کی ادائیگی کے لیے درخواست دے دی گئی۔ چنانچہ مکان اور پلاٹ کی چودہ ہزار روپے قیمت مقرر ہوئی جس کے 1/10 حصہ کی ادائیگی خاکسار کو کرنی تھی۔ نیز مکان قرضہ لے کر بنایا گیا تھا اس کے بھی تیس روپے ماہوار انجمن کو ادا کرنے تھے۔گویا چودہ روپے حصہ جائیداد اور تیس روپے واپسی قرضہ کل چوالیس روپے ہر ماہ الاؤنس سے وضع کیے جانے کی درخواست کر دی۔دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے بے حد وحساب فضل کی سینیے کہ ادھر مکان بنا کر باہر نکلا ادھر مکان پینتالیس روپے ماہوار کرایہ پر اٹھ گیا۔اس طرح آٹھ سال میں حصہ جائیداد اور قرضہ مکان بغیر کسی اضافی بوجھ کے اللہ تعالیٰ نے ادا کرنے کی توفیق دے دی۔

1969ء اگست میں تعمیر مکان کے بعد 1989ء تک اس میں ایک اینٹ بھی نہ لگ سکی۔بچوں کو ربوہ بسانے پر پھر اس میں اضافہ کیا گیا جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اور نئے تعمیر شدہ حصہ کا بھی حصہ جائیداد ادا کر دیا گیا۔

اہلیہ اور بیٹے کی نظام وصیت میں شمولیت اور میری دعا

ربوہ آباد ہونے پر اہلیہ صاحبہ نے بھی وصیت کر دی۔ چنانچہ وہ حصہ آمد تو ادا کر رہی ہیں۔ ان کے پاس کچھ زیور تھا اس کا حساب لگا کر باجازت مرکز اس کا بھی حصہ جائیداد ادا کر دیا ہوا ہے۔ خاکسار کو جو زائد آمد ہوتی ہے اس کا بھی چندہ باقاعدگی سے ادا کرنے کی توفیق وسعادت مل رہی ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

خاکسار کا بڑا بیٹا عزیزم رفیق احمد رہان ساکن جرمنی بھی نظام وصیت میں شامل ہے۔ اس نے جرمنی میں مکان بنایا ہے جس کا کئی لاکھ روپے اسے حصہ جائیداد ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ اسے سعادت عطا فرمائے گا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری ساری اولاد کو نظام وصیت میں نہ صرف شمولیت کی توفیق دے بلکہ نظام کے تمام تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ میں اور میری اولاد بھی نئی زمین اور نئے آسمان کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہوسکیں۔

یہاں میں ایک امر کا ذکر کرنے سے رک نہیں سکتا کہ 1974ء اور 1984ء میں صاحب اقتدار لیڈران نے جماعت احمدیہ کو مالی طور پر مفلوج اور بے بس کرنے کی ٹھانی اور مختلف صورتوں میں احباب جماعت کی انفرادی اور اجتماعی طور پر اقتصادیات کو بکلی تباہ و برباد کر کے جماعت کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی پکڑانے کے خواب دیکھنے لگے۔ جس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان بھی کیا گیا۔

لیکن عرش پر خدائے واحد و یگانہ جو تمام خزائن اور تمام طاقتوں کا مالک ہے ان کی ان تمام کوششوں کو تباہی و بربادی سے ہمکنار کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اور برسوں پہلے اپنے پیارے مسیح کو فرما چکا تھا کہ

”میں تیرے خالص اور دلی محبّوں کا گروہ بھی بڑھاؤں گا اور ان کے نفوس و اموال میں برکت دوں گا۔“

(تذکرہ صفحہ 112 ایڈیشن چہارم)

چنانچہ وہ احباب جماعت جن پر کافیۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا انہوں نے ہجرت کرنا شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہزاروں کی تعداد میں پاکستان کو مجبوراً چھوڑ کر یورپ میں جا کر آباد ہوئے۔ اپنے حسن اخلاق اور شدید محنت کے باعث انہوں نے مقامی کاروباریوں کے ہاں محنت و مشقت کر کے ان کے دل جیت لیے اور جماعت کے مالی وسائل میں تھوڑے ہی عرصہ میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ایک ٹی وی شو میں اینکر طارق عزیز نے اعتراف کیا کہ پاکستان کے تمام شہروں سے زیادہ زر مبادلہ ربوہ پاکستان میں آتا ہے۔ اور یہ مصرع سچ ثابت ہو گیا۔

عدو شر برانگیزد کہ خیرِ ما درآں باشد

میں ایک واقف زندگی تھا جس کے آٹھ بچے تھے جن کی تعلیم اور شادیوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مالی وسائل درکار تھے۔ چنانچہ میرا بڑا بیٹا عزیزم رفیق احمد رہان بھی مع اہل و عیال جرمنی چلا گیا۔ جس نے ہر اہم ضرورت کے موقع پر میری گرانقدر خدمت کی۔ اسی طرح ربوہ کے غریب غریب گھروں کے نوجوان بھی ملک چھوڑ گئے جس کے نتیجہ میں ان غرباء و مساکین مرکز نشینوں کو اللہ تعالیٰ نے معمولی رہائش گاہوں سے نکال کر بہترین کوٹھیوں کے مکین بنا دیا۔ آج کوئی ربوہ میں آ کر دیکھے تو سہی۔ وہ سرزمین جس پر سو فیصد کلر والی مٹی بکھری ہوئی نظر آتی تھی دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز و شاداب اور محلات جیسی خوبصورت کوٹھیوں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ پس قیامت تک حاسد شرمندہ رہیں گے۔ بہرحال یہ اس خدا کا فضل ہے جس نے جماعت احمدیہ کو قائم کیا اور یہ جماعت کی صداقت کا ایک عظیم فعلی ثبوت ہے۔

ملتان سے تبادلہ اور صدر حلقہ وسابق امیر ملتان کا تبصرہ

ملتان میں تقرری سے بہت عرصہ قبل میں یہاں کے بعض مشکل معاملات سے کسی حد تک مطلع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مکمل طور پر غیر جانبدارانہ کردار ادا کرنے کی توفیق دی۔ ایک دفعہ دو دوست میرے پاس آئے لیکن میرے طرز عمل اور گفتگو سے وہ جرأت نہ کر سکے کیونکہ ایک مربی کو تو بہرحال مرکز کی طرف سے منظور شدہ عہدیداروں کے ساتھ تعاون کرنا ہوتا ہے اور ان کے تعاون سے اپنی مساعی کو اچھے نتائج سے ہمکنار کرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ صرف تعاون باہمی کی حد تک ہونا چاہیے۔ غلامی یا حصول منفعت کا اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ خاکسار نے اس دلدل سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں سرخرو بھی کیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

ملتان سے تبدیلی پر مکرم چوہدری رشید احمد خان صاحب صدر حلقہ نے احباب جماعت کو تبادلہ سے مطلع کرتے ہوئے فرمایا۔ ہمارے مربی صاحب کا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ ''ایک مربی میں جو صفات ہونی چاہئیں وہ سب ان میں تھیں۔ بہرحال مرکز کا حکم مقدم ہے۔'' یہ تبصرہ اس بزرگ کا تھا جن کے بارہ میں ملتان تبادلہ کے وقت ان سے بچ کر رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کے محترمانہ حسن سلوک پر میں آج تک ان کے لیے اور ان کی اولاد کی روحانی وجسمانی ترقیات کے لیے دعا کی توفیق پاتا ہوں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

ایک نئی طرز کی زندگی کا آغاز

ربوہ آکر مربیانہ زندگی کی طرز بدل گئی۔ اب میری زندگی ایک دفتری آدمی کی زندگی میں بدل گئی۔ ہر صبح صبح دفتر جانے کی تیاری، وقت پر ناشتہ کرتا تا کہ بروقت دفتر

پہنچ سکوں۔ گھر میں ابھی تین بیٹیاں غیر شادی شدہ موجود تھیں۔ اپنی والدہ کی نگرانی میں میری تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھیں اور مجھے نئی طرز زندگی کے اختیار کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وقت پر ناشتہ کر کے سائیکل پر بروقت دفتر پہنچ جاتا اور فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتا۔ خاکسار کی دفتری ڈیوٹی شعبہ احتساب امور عامہ میں لگائی گئی۔ مکرم محمد سلیم صاحب شعبہ احتساب کے انچارج اور اپنے کام سے بخوبی آگاہ تھے۔ شعبہ میں مختلف نوعیت کے بے شمار کام تھے۔ میرے علاوہ بھی تین چار کارکن اس شعبہ میں موجود تھے۔ حصہ رسدی مجھے بھی متعدد کام سپرد کر دیے گئے۔ جلد ہی ان امور کی انجام دہی اوران کے طریق کار سے واقف ہو گیا۔ اور اپنے سپرد کیا گیا کام بروقت ہی انجام دینے کی ہمیشہ کوشش کی۔ نیز روزانہ دفتر ہمیشہ وقت پر پہنچا۔ آہستہ آہستہ شعبہ کا کام بڑھتا گیا اور چھٹی کے بعد شام کو بھی دفتر جا کر کام نمٹانا پڑا۔

دفتری کاموں کے علاوہ جلد ہی بعض نفلی کام بھی ذمہ داری میں شامل ہو گئے۔ مثلاً محلّہ کی لجنات میں تربیتی خطابات، محلّہ کے جلسۂ یوم خلافت، جلسہ یوم مسیح موعودؑ، جلسہ یوم مصلح موعود وغیرہ کی تقریبات میں تقاریر کرنا ہوتی تھیں۔ اسی طرح ایک رمضان المبارک میں (بیت) ناصر محلّہ دارالرحمت غربی میں پانچ پارے قرآن مجید کا پانچ دن روزانہ ایک پارہ کے حساب سے درس دیا۔ ایک سال تین پارے کا درس دیا۔ نیز محلّہ ناصر آباد غربی کی (بیت الذکر) میں کئی سال رمضان میں سارا ماہ نماز فجر کے بعد درس حدیث دیتا رہا۔ علاوہ ازیں (بیت) ناصر میں روزانہ ایک آیت کا حاضرین کو ترجمہ سکھاتا رہا۔ پانچ سال تک (بیت) ناصر میں امامت کے فرائض بھی ادا کیے۔ اس بارہ میں ہمیشہ بروقت نماز پڑھانے کے لیے (بیت الذکر) پہنچنے کی سختی سے پابندی کی اور کبھی بھی نمازیوں کو میرا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بعض اوقات پورا ماہ رمضان لجنہ میں مختصر طور پر قرآن مجید کا درس دیا جاتا رہا۔

1991ء کے تاریخی جلسہ سالانہ قادیان میں شمولیت

1991ء کا سال میرے لیے بے حد مبارک ثابت ہوا کہ اس سال اب لمبے عرصہ کے بعد مرکز کی برکات سے استفادہ کی توفیق ملی۔ نیز اس سال حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے قادیان جلسہ سالانہ میں تشریف آوری کا پروگرام تھا۔ میں نے مع اہلیہ نظام سلسلہ کو قادیان جانے کی درخواست دی۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی کی درخواست از راہِ کرم منظور کر لی گئی۔ ویزہ وغیرہ کے حصول کا تمام انتظام نظام جماعت نے کیا۔ اغلباً 18 دسمبر کو علی الصبح دفتر انصار اللہ مرکزیہ سے کچھ بسوں کا قافلہ لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ لاہور پہنچ کر پلیٹ فارم نمبر 1 پر جہاں سے ہندوستان کے لیے روانگی ہونی تھی اہل قافلہ پہنچ گئے۔ کسٹم والوں نے ضروری کارروائی کی۔ اٹاری کے ٹکٹ لیے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خدا خدا کر کے قافلہ روانہ ہوا۔ اب سرزمین پاکستان کراس کر کے گاڑی ہندوستان کی حدود میں چل رہی تھی۔ رفتار بہت کم تھی۔ ساتھ ساتھ ہندوستان کے گھڑ سوار فوجی دونوں طرف گھوڑے دوڑا کے جا رہے تھے کہ گاڑی اٹاری ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر رکی۔ مسافر کسٹم کے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ اہل قافلہ کا سامان چیک کر کے ان کو سٹیشن کے قریب بسوں پر بیٹھنے کی اجازت دی گئی۔ نماز مغرب وعشاء بھی بس میں ادا کی گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تمام بسوں کے ڈرائیورز اور کنڈکٹرز سکھ تھے۔ کوئی ہندو میں نے بسوں میں نوکری کرتے نہیں دیکھا۔

قادیان میں رہائش کے لیے میری بہن کا گھر تھا۔ وہاں چلا گیا۔ آہستہ آہستہ گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ شدید سردی کے باعث مجھے سخت کھانسی اور بخار ہو گیا۔ رش کے باعث میں نے اپنی رہائش اپنی مہمان نوازی کی جگہ منتقل کر لی۔ اہلیہ یہاں ہی رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ پہلے پہل جانے سے بیت الدعا میں دعاؤں کا کافی موقع مل گیا۔ بیت الفکر میں بھی دن بھر نوافل کی توفیق ملی۔ جس کمرہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے متواتر روزے رکھے تھے اس میں بھی قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل کی توفیق ملی۔ حضور رحمہ اللہ کی اقتداء میں نمازیں ادا کرنے کا بھی موقع ملا۔ خاکسار کی ڈیوٹی ہندوستان کے صوبہ کیرالہ سے آنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی پر بطور انچارج مہمان نواز لگائی گئی۔ خاکسار کے ہمراہ پاکستان سے اور بھی احباب ڈیوٹی کے لیے نامزد تھے جن میں سے اب صرف دو کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مولوی محمد صالح صاحب جو اس وقت مربی سلسلہ تھے، وہ تھے اور دوسرے مکرم یٰسین ربانی صاحب مربی سلسلہ کے بھائی چوہدری محمد حسین صاحب تھے۔ اس کے علاوہ قادیان کے احباب میں سے بھی تین احباب ہمارے ساتھ مہمان نواز تھے۔ بلکہ ہمارے گروپ کے انچارج بھی قادیان سے تھے۔

حضور رحمہ اللہ تشریف لائے تو حضور کا استقبال کیا گیا۔ اگلے روز حضور نے ڈیوٹی والوں کا معائنہ فرمانا تھا۔ کیرالہ والوں کی رہائش قادیان کے گرلز سکول میں تھی جو حضورؒ کی رہائش گاہ کے بالکل قریب تھا۔ چنانچہ حضورؒ نے وہاں سے ہی معائنہ شروع فرمایا۔ لائن میں مجھ سے قبل قادیان کے ہی مہمان نواز کھڑے تھے۔ ان کے بعد مجھے حضور نے شرفِ مصافحہ بخشا تو حضور نے اغلبًا پہچانا نہیں۔ فرمایا آپ؟ عرض کیا حضور نذیر احمد رہان۔ اس پر مسکرا کر فرمایا کہ آپ تو بہت بدل گئے ہیں۔ خاکسار نے ٹھوڑی پر اپنا ہاتھ رکھ کر عرض کیا کہ حضور اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ حضور اس پر مسکرا کر آگے چل دیے اور یہ اسی طرح ویڈیو میں ریکارڈ ہو چکا ہے۔

بہر حال قادیان کا جلسہ پوری شان وشوکت اور آب وتاب سے ہوا۔ روزانہ خلیفۂ وقت کی زیارت کی سعادت ملتی رہی۔ حضور ہر روز نماز فجر کے بعد بہشتی مقبرہ

تشریف لے جاتے۔ احباب راستہ پر دورویہ کھڑے ہوکر اپنے امام کی زیارت سے مستفید ہوتے۔ ایک دن احمدیہ چوک قادیان میں ڈیرہ غازی خان کے کریم بخش صاحب عرف بے وس کملا کھڑے تھے۔ میں بھی وہاں کھڑا تھا۔ چند اور احباب بھی کھڑے تھے کہ حضور سیر سے تشریف لے آئے اور یہاں رک گئے۔ کریم بخش صاحب سے نظم کی فرمائش کی انہوں نے اپنے مخصوص انداز اور لے سے اپنی پنجابی نظم پڑھنا شروع کی۔ ''رب دا پیارا طاہر وطناں تے موڑ مہاراں''اس انداز سے نظم میں حضور کی جدائی کا نقشہ کھینچا گیا تھا کہ تمام حاضرین کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ حضور کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی اور حضور وہاں سے قصرِ خلافت تشریف لے گئے۔ کیرالہ سے پانچ صد سے زیادہ مہمان آئے تھے۔ اکثر چاول پسند کرتے تھے۔ خاکسار اور ساتھی دل و جان سے صبح و شام مہمانوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ مہمان نواز اور مہمانوں میں زبان کا فرق تھا۔ تاہم نہایت محبت سے مہمان بھی پیش آئے اور ڈیوٹی والے احباب نے بھی اسے خوش بختی سمجھتے ہوئے ڈیوٹی دی۔ جلسہ بخیر وخوبی دعا پر اختتام پذیر ہوا اور دعا کے وقت تقسیم ملک سے پہلے کے جلسہ ہائے سالانہ کی آخری دعا یاد آگئی۔ حضورؒ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ خاکسار کے پاس الیس اللہ کی انگوٹھی تھی۔ وہ حضور کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ اپنے دستِ مبارک کی انگلی سے مس کر کے عطا کریں۔ حضورؒ نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن کر دو تین بار مس کر کے عطا کی جو آج تک عاجز کے پاس ہے۔

اس پیاری بستی میں والد صاحب نے بھی ایک معمولی چھوٹا سا گھر تقسیم ملک سے پہلے بنایا تھا۔ خاکسار کے دو بھائیوں استاذی المکرّم ماسٹر کمال الدین صاحب اور جلال الدین صاحب نے بھی محلّہ دارالعلوم میں حضرت قاضی محمد نذیر صاحب اور حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب کے قریب مکان تعمیر کیا تھا۔ ہمارا اور بھائیوں کا مکان

ایک ہی دس مرلہ کے قطعہ زمین کے نصف نصف پر واقع تھا۔ ایک دن اس مکان کو دیکھنے کے لیے میں اور میری اہلیہ اور بھاوج وغیرہ گئے۔ مکان من وعن موجود تھا۔ مکینوں نے ہماری بے حد عزت کی اور رہائش کی پیشکش کی۔ سکھ خواتین بھی بڑی محبت سے پیش آئیں اور چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

اللہ تعالیٰ کے فضل سے روزانہ بہشتی مقبرہ میں دعا اور (بیت) اقصیٰ اور (بیت) مبارک میں نمازوں کی ادائیگی کی توفیق ملتی رہی۔ ہندوستان میں ان دنوں کھانے کا تیل پاکستان کے معیار سے بہت کم تر تھا۔ تیل میں سے ایک مخصوص بو آتی تھی جس کی وجہ سے سالن کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پاکستان سے جاتے ہوئے بعض عزیزوں کے لیے ڈالڈا کے ڈبے تحفۃً لے گئے تھے جو انہوں نے بہت پسند کیے۔

1991ء میں ہندوستان کی کرنسی کی قیمت پاکستان سے بہت کم تھی۔ چنانچہ ایک سو پاکستانی روپے کے عوض ایک سو بیس روپے ہندوستانی مل جاتے تھے۔ اس لیے پاکستانیوں نے وہاں سے جی بھر کر خریداری بھی کی۔ از قسم کمبل اور دیگر کپڑے وغیرہ۔ بعض نے تو چاندی کے ہلکے پھلکے زیورات بھی خریدے۔ خلیفۂ وقت سے محبت کے باعث بڑی کثرت سے احباب پاکستان سے گئے ہوئے تھے اور ہندوستان سے بھی۔ قادیان کے تاجروں نے خوب کمایا اور بڑے خوش تھے۔ آئندہ سال کے جلسہ سالانہ کے لیے امیدوں کے محل بنائے بیٹھے تھے۔ قادیان کی مقدس بستی میں چودہ دن گزار کر بھاری دل کے ساتھ واپسی ہوئی۔ اٹاری تک بسوں میں اور اٹاری سے سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعہ پاکستان روانگی ہوئی۔ لاہور کسٹم کی کارروائی کے بعد بسوں کے ذریعہ اہل قافلہ ربوہ پہنچے۔ خاکسار، خاکسار کی اہلیہ، بھائی جلال الدین صاحب اور ان کی اہلیہ بخیریت گھر پہنچ گئے۔ شدید تھکاوٹ کا احساس تھا مگر دل شکر کے جذبات سے لبریز تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقدس سفر کی سعادت بخشی۔

قادیان سے واپسی اور ربوہ میں مصروفیات

ربوہ آکر پھر دفتری امور میں محویت رہی۔ وہی شعبہ احتساب اور اس کی فائلیں۔ایک بار پھر دفتری امور کی تکمیل میں دن رات بسر ہونے لگے۔اسی اثنا میں ایک روز دفاتر صدر انجمن کے برآمدے میں ناظر اصلاح وارشاد مکرم مولانا سلطان محمود انور صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ جامعہ احمدیہ میں ہم دونوں بیک وقت زیر تعلیم رہے۔کاپی کیپری بھی مل کر کی تھی۔اب اللہ تعالیٰ نے انہیں افسر بنادیا تھا اور میں ان کے ماتحت۔لیکن ان کی شفقت کہ روک کر شکوہ کیا اور کہا کہ اب تم افسر بن گئے ہو ملتے نہیں۔میں نے ازراہِ مذاق عرض کیا کہ مجھے وہاں سے واپس بلا لیں۔

انہوں نے اسے سنجیدگی سے لیتے ہوئے مجھے وہاں سے واپس بلا لیا۔بات تو مذاق میں ہوئی تھی لیکن سنجیدگی سے لے لیا گیا۔نظارت امور عامہ سے واپسی پر مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب فاضل کو ایک علمی کام کے لیے معاون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مجھے ان کے سپرد کر دیا گیا۔کام کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ حضرت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب (اللہ ان سے راضی ہو) نے بخاری شریف کی اردو میں شرح لکھی تھی جس میں سے چودہ پارے تو زیورِطبع سے آراستہ ہو گئے تھے۔ پندرہ سے انیس پارے کا ترجمہ ہو چکا ہوا تھا اب اس کو قابل اشاعت بنانے کے لیے اس پر علمی کام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مولانا محترم کے پاس جن کا مکان میرے مکان سے تھوڑے فاصلے پر تھا، جاتا۔ترجمہ شدہ مواد پر غور وفکر ہوتا۔بعض احادیث کے متعلق بعض شروح کی کتب دیکھنا پڑتیں۔بعض اوقات سیرت کی کتابوں سے مدد لینا ہوتی تھی۔اس کے لیے طبقات ابن سعد اور سیرت ابن ہشام سے بھی استفادہ کی ضرورت پیش آتی۔الغرض کوئی دو گھنٹے کے کام کے بعد مولانا صاحب دوسرے کاموں میں

مصروف ہو جاتے اور مجھے کام گھر پر لے جا کر کرنے کی ہدایت فرماتے۔ جس سے مجھے بہت علمی فائدہ ہوا۔ الحمدللہ۔ مولانا کی وفات تک یہ کام جاری رہا۔ اس کے علاوہ محلّہ میں تربیتی تقاریر کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا۔ صدر صاحب محلّہ مکرم بشیر احمد سیفی صاحب بے حد محبت وعزت اور احترام سے پیش آتے۔

صدر صاحبہ لجنہ محترمہ انیسہ فاضل صاحبہ بھی لجنہ کے اجلاسات میں تربیتی تقاریر اور دروس کے لیے اکثر و بیشتر مدعو کرتی رہتیں۔ محلّہ کی بیت میں درس وتدریس کا موقع بھی ملتا رہتا۔ ہوتے ہوتے 1994ء کا ماہِ جون آ گیا اور خاکسار کو ڈیڑھ ماہ کے لیے ضلع بہاولنگر بطور مربی جانے کا حکم ملا۔ امیر صاحب بہاولنگر نے تحصیل فورٹ عباس کے چک نمبر 223 جانے کے لیے کہا۔ چنانچہ مربی صاحب ضلع کے ساتھ پہلے ڈیرہ باجوہ پہنچے وہاں سے سخت دوپہر میں موٹر سائیکل پر چک 223 پہنچے۔ نماز جمعہ کا خطبہ دیا۔ نماز جمعہ ایک گھر پر پڑھی کیونکہ (بیت الذکر) زیر تعمیر تھی۔ وہاں چھت وغیرہ نہ تھی۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں صدر صاحب کے احاطہ میں باجماعت ادا کرنا شروع کیں۔ آہستہ آہستہ حاضری بڑھنے لگی۔ دن بھر یہاں کوئی کام نہ تھا۔ چنانچہ صدر صاحب کے مشورہ سے ڈیرہ باجوہ جہاں سایہ بھی تھا۔ احباب زیر دعوت بھی تھے۔ ناشتہ کے بعد وہاں چلا جاتا۔ دس دن کے بعد ڈیرہ باجوہ میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ یہاں چوہدری بشیر احمد صاحب باجوہ مرحوم کا گھرانہ آباد ہے۔ ان کے سرکردہ مکرم چوہدری منیر الرحمان صاحب باجوہ ایل۔ ایل۔ بی ہیں اور وسیع دینی معلومات بھی رکھتے ہیں۔ عاجزی وانکساری اور مہمان نوازی کی صفت سے بخوبی متصف ہیں۔ یہاں سے پھر تحصیل فورٹ عباس کی مختلف جماعتوں کا دورہ کیا۔ دو روز تک مروٹ اور قریبی ایک چک میں رہا اور تربیتی امور سرانجام دیے۔ اسی طرح چک 69 ملہیاں والا میں جلسہ سیرت النبیؐ کے انعقاد کی توفیق ملی۔

ایک دفعہ ہندوستان پاکستان کے بارڈر کے بالکل قریب ایک جماعت ہے وہاں بھی دورہ کیا۔ الغرض ڈیڑھ ماہ کے بعد واپسی پر چک نمبر 166 میں جلسہ سیرت النبیؐ کیا اور محترم امیر صاحب بہاولنگر کے ساتھ واپس بہاولنگر آ کر ربوہ کے لیے روانگی ہوئی اور آ کر دفتر کو دورہ کی رپورٹ دی۔ تین چار افراد کو بیعت کی توفیق بھی حاصل ہوئی۔ اس دورہ کے بعد چوہدری منیر الرحمٰن صاحب باجوہ بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کے ساتھ مستحکم دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ ان کا گھر ربوہ میں تھا۔ اکثر آتے تو کبھی مجھے بلوا لیتے کبھی خود غریب خانہ پر تشریف لے آتے۔ ہمیشہ علمی اور دینی باتیں ہی ہوتیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ دوستی آج بھی قائم ہے۔ آج کل امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے بھی فون پر بات ہوتی رہتی ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

چوہدری صاحب علمی و دینی مسائل سے خوب واقفیت رکھتے ہیں۔ جب تک فورٹ عباس میں زمینداری رہی۔ ان کے ہاں بلاخوف وخطر جلسہ ہائے جماعت احمدیہ منعقد ہوتے اور علاقہ کے احمدی احباب کے علاوہ دوسرے تعلق دار بھی شریک ہوتے۔ جلسہ کے اخراجات و انتظامات بھی ان کے ذمہ ہوتے تھے۔ مجھے بھی ان کے ہاں جلسہ اصلاح وارشاد میں بطور نمائندہ مرکز شمولیت کا موقع ملا ہے۔ امیر صاحب مکرم شیخ کریم الدین صاحب ایڈووکیٹ ہیں۔ اس سے قبل مکرم رانا محمد خاں صاحب ایڈووکیٹ ایک لمبا عرصہ امیر ضلع رہے تھے۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

تحصیل فورٹ عباس میں ایک اور علمی شخصیت کے ذکر کے بغیر میرا یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ وہ مکرم نذیر احمد صاحب خادم ساکن چک نمبر 84 ہیں۔ اکثر ان کے رشحات قلم الفضل اور لاہور کے صفحات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ آج کل ربوہ منتقل ہو گئے ہیں۔ میرا ان سے تعلق ضلع نواب شاہ میں تقرر کے وقت سے ہے۔

بہر حال قیام مرکز کے عرصہ میں مجلس انصار اللہ مرکزیہ میں مکرم و محترم مولانا محمد

اعظم اکسیر صاحب مربی سلسلہ اغلباً قائد اصلاح وارشاد تھے۔انہوں نے خاکسار کو بھی اپنے ساتھ ٹیم میں شامل کرلیا۔جس کے نتیجہ میں مجلس انصاراللہ کے تحت بیسیوں اجتماعات اور دیگر تربیتی اجلاسات میں تقاریر کی سعادت ملی اور پنجاب میں بہت سی ایسی جماعتوں یا مجالس میں جانے کی توفیق ملی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔کچھ عرصہ تک مربی دارالضیافت بھی متعین رہا۔دارالضیافت میں آنے والے غیراز جماعت احباب کو مرکز کی سیر کرانا، ان کے سوالات کے جوابات دینا اور ان کی میزبانی کے فرائض سرانجام دینا۔یہ ذمہ داری ہوتی تھی۔بعض اوقات رات گئے تک سوال و جواب کی مجلس سجی رہتی تھی۔

میرا پہلا سفر جرمنی

غالباً1994ء میں قادیان کے جلسہ سالانہ میں حضورؒ کی تشریف آوری کا پروگرام تھا۔میرے جرمنی والے عزیزوں نے زیادہ سے زیادہ اعزہ کے قادیان پہنچنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ ملاقات ہو سکے۔لیکن جلسہ سالانہ قادیان ہی ہندوستان میں طاعون کے خوف سے نہ ہوسکا۔اس پر میں نے جرمنی والے عزیزوں کو کہا کہ کیا آپ میں سے ہمیں کوئی سپانسر نہیں کرسکتا تاکہ ہم جرمنی آکر سب عزیزوں کو مل سکیں۔تحقیق پر معلوم ہوا کہ رفیع احمد کامران جس کی شادی انگلستان کی قومیت رکھنے والی خاتون سے ہوئی ہے اور وہ میرا بھانجا ہے۔صرف وہ سپانسر کرسکتا ہے۔چنانچہ اس نے مجھے اور میری اہلیہ کو سپانسر لیٹر اور متعلقہ ضروری کاغذات بھیج دیے۔ربوہ میں جس واقف حال کو کاغذات دکھائے ان میں سے بعض نے کہا کہ سورج مغرب سے طلوع ہوسکتا ہے مگر ان کاغذات پر ویزہ نہیں مل سکتا۔بظاہر مایوسی ہوئی لیکن اچانک مکرم ومحترم عبدالسلام انجم صاحب کارکن وکالت تبشیر سے ملاقات ہوئی۔انہوں نے بڑا مفید

مشورہ دیا کہ آ یئے میں آپ کو جرمن سفارتخانہ کا فون نمبر دیتا ہوں اس پر ان سے وقت لے لیں۔اور خود ویزہ فارم پُر کر کے ویزہ کے لیے کاغذات مکمل کر دیے۔

فون پر انہوں نے وقت دے دیا۔مقررہ تاریخ پر کاغذات پیش کیے۔اہلیہ ہمراہ تھیں۔میرے بھتیجے عزیزم مسعود احمد رہان جن کے پاس اسلام آباد میں ہمارا قیام تھا وہ بھی ہمراہ تھے۔قریبا ایک بجے دوپہر انہوں نے سوا دو بجے دوپہر آ کر انٹرویو دینے کا کہا۔گھر آ گئے اور مقررہ وقت پر میں اور مسعود احمد سفارتخانہ گئے۔مسعود احمد تو باہر انتظار گاہ میں رہے کیونکہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔میں اندر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر بعد مجھے اندر بلایا گیا اور انٹرویو کرنے والے جرمن دوست نے انگریزی میں سوال کیا کہ کیا آپ انگریزی جانتے ہیں میں نے عرض کیا کہ کسی حد تک جانتا ہوں لیکن اگر ترجمان ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔اس پر وہ فوراً ایک پاکستانی خاتون کو بلا لائے۔اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کیوں جرمنی جانا چاہتے ہیں۔جواباً عرض کیا کہ میں اور میری بہن صرف دو بہن بھائی زندہ ہیں۔میری ہمشیرہ بلڈ پریشر اور شوگر کی مریض ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ کی ہمشیرہ ویزہ لے کر گئی تھیں یا بغیر ویزہ کے؟

جواب: سچی بات ہے بغیر ویزہ کے گئی تھیں۔

سوال: آپ اکیلے جانا چاہتے ہیں یا بیوی بھی ہمراہ ہوگی؟

جواب: میں نے تو دونوں کے لیے درخواست کی ہے باقی آپ جس کو ویزہ دیں گے وہی جا سکے گا۔

سوال: آپ کا خرچ کون دے گا؟

جواب: میں نے عرض کیا کہ میرا بھانجا جس نے سپانسر کیا ہے اور ساتھ ہی ترجمان کو کہا کہ ان کے معاشرہ میں تو ایسا نہیں ہوتا لیکن ہمارے معاشرے میں تو ممکن

ہے۔اس کے علاوہ بھی بعض سوالات تھے جن کے جوابات سے وہ مطمئن ہو گئے اور مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد پھر بلایا اور ایک چٹ دے کر کہا پانچ روز بعد یہ چٹ لیکر آنا اور ویزہ لے جانا۔فیس تو پہلے ہی جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ پانچویں روز عزیزہ طیبہ مسعود گئیں اور پاسپورٹ جس پر ایک ماہ کا ویزہ لگا ہوا تھا لے آئیں۔ پاسپورٹ پر یہ مہر بھی ثبت تھی کہ واپس آ کر ہمیں خود ایمبیسی آ کر اپنے آنے سے مطلع کریں تا کہ آئندہ آپ کو حصول ویزہ میں سہولت ہو۔

ویزہ ملنے کے بعد سفر کی تیاری شروع ہوئی۔اس وقت تک میرا بڑا بیٹا رفیق احمد بمع بچوں کے اور بیٹی امۃ القیوم بمع بچوں اور میاں کے، تین بھانجے سلیم ،ظریف اور رفیع کامران بچوں سمیت، دو بھانجیاں عزیزہ ناصرہ اور عزیزہ اختر بچوں سمیت جرمنی میں مقیم ہو چکی تھیں۔آپا جان اور بھائی محمد شریف بھی وہاں تھے جنہوں نے زندگی کے تلخ لمحات میں مجھے پیار دیا تھا۔ان تمام خاندانوں کے اکثر افراد کے لیے میری بیٹی بشریٰ نے تحائف خرید کر ہمارا سامان سفر بڑی محنت اور سلیقہ سے تیار کیا۔ ہماری بکنگ کراچی سے پی آئی اے میں خاکسار کے چھوٹے بیٹے عزیزم بشیر احمد نے کرائی جو حیدر آباد میں مقیم تھا۔فلائٹ کراچی سے ہالینڈ اور ہالینڈ سے فرینکفرٹ تک تھی۔

چنانچہ 15 مئی 1995 سے 16 جون 1995ء تک ویزہ تھا۔ پندرہ مئی کو روانہ ہو کر فرینکفرٹ ایئر پورٹ پر اترے۔ایک مسافر مل گیا تھا جس نے باہر تک رہنمائی کی۔سامان لے کر باہر نکلے تو اکثر عزیز ایئر پورٹ پر لینے آئے ہوئے تھے۔اپنے اس وقت تک اکلوتے پوتے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ باقی سب عزیزوں سے بھی مل کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ رفیق احمد کی اپنی گاڑی میں اس کے گھر پہنچ گئے۔کھانا کھایا اور آرام کیا۔ جرمنی پہنچ کر آزادی کا ایک احساس ہوا۔تنگ ذہن متعصب ملانوں سے کچھ عرصہ تو نجات ملی۔فضا میں جس طرف نگاہ اٹھتی تھی صفائی،سبزہ اور خوبصورتی ہی نظر

آتی تھی۔ جب پہنچا ہوں تو جرمنی کی خدام الاحمدیہ کا اجتماع ناصر باغ میں ہو رہا تھا۔ حضور اجتماع میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ اجتماع میں پہنچا تو پانچ سال بعد دوبارہ خلیفۂ وقت کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ الحمدللہ

(بیت) نور فرینکفرٹ میں خاکسار نے اہلیہ سمیت حضور سے ملاقات کا شرف بھی پایا۔ دوران ملاقات حضور نے بہت پیار کی گفتگو فرمائی جسے لوحِ حافظہ سے کاغذ پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ (بیت) نور فرنکفرٹ کے جس کمرہ میں ملاقات کی سعادت ملی جیسے ہی اس کمرہ میں داخل ہوا حضور کو دیکھ کر جذبات میں ایک ہلچل سی مچی۔ آواز بھر آئی اور آنکھوں میں بھی نمی آ گئی۔ حضور نے مجھے شرف مصافحہ کے بعد بیٹھنے کا ارشاد فرمایا۔ سب سے پہلے کیا گفتگو ہوئی وہ یاد نہیں رہی البتہ چند لمحات بعد خاکسار نے اپنی اہلیہ کے بارہ میں عرض کیا کہ یہ مولوی عبدالحق صاحب نور ساکن کرونڈی کی بیٹی ہے۔ حضور ان سے ذاتی طور پر بخوبی واقف تھے۔ ان کے باغ کے آم کے ایک درخت کا پھل جو بظاہر چھوٹا تھا لیکن چوسنے میں بہت لذیذ تھا حضور کو بہت پسند تھا۔ ان کے ذکر پر فرمایا کہ ہاں اب تو ان کے تیس چالیس پوتے پوتیاں ہو گئے ہوں گے۔ میں نے عرض کیا حضور اس سے زیادہ ہوں گے فرمایا ہاں چھ سات تو میری اہلیہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے بھی ہوں گے۔ میں نے عرض کیا حضور ان کے تو آٹھ بچے ہیں۔

بعد ازاں محترم حاجی عبدالرحمٰن رئیس باندھی کا ذکر فرمایا کہ ان کا کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا انہوں نے اپنی ساری زمین اولاد میں تقسیم کر دی ہے۔ حضور نے فرمایا اپنے نام زمین کا کچھ بھی حصہ نہیں رکھا۔ میں نے عرض کیا نہیں حضور ساری تقسیم کر دی ہے۔ بعد ازاں حضور نے خاکسار سے دریافت کیا کہ حاجی صاحب مچھلی کی سجی بنایا کرتے تھے اس کا طریق اور مصالحہ وغیرہ آپ کو علم ہے۔ عرض کیا حضور مجھے تو

علم نہیں واپس پاکستان جا کر معلومات حاصل کر کے حضور کو لکھ دوں گا۔ اس پر ملاقات ختم ہوگئی۔ چنانچہ خاکسار واپس پاکستان آیا تو پتہ چلا کہ محترم حاجی صاحب کے وقت کا ایک دوست گولارچی ضلع بدین میں ہے اسے اس کا طریقہ آتا ہے۔اس پر خاکسار باندھی سے عزیزم محمد اکرم ابن محمد شفیع صاحب کو لے کر گولارچی جا کر اس فرد سے ملا اور مچھلی بنوا کر کھائی اور پھر اس کا طریق کار بذریعہ نظارت اصلاح وارشاد حضور کی خدمت میں بھجوا دیا۔حضور نے ہم دونوں میاں بیوی کو اپنے ساتھ تصویر بنوانے کا شرف عطا کیا جو تصویر آج بھی میرے گھر کی زینت ہے شام کو واپس عزیزم رفیق احمد اور خالد حسین خادم جو میرا داماد ہے ان کے ہاں آ گئے۔

اس کے بعد تو ایک ماہ تک جرمنی کی خوب سیر کی۔ بہت سے عزیزوں نے دعوت کی۔اسی طرح محمد سلیم ضیا جو میرا بھانجا ہے اور سٹڈ گارڈ رہتا ہے نے بھی دعوت کی اور وہاں ہمیں حصول پرمٹ کے بعد مرسڈیز کار، ویگن،بس وغیرہ کی میلوں ایریا کے رقبہ میں فیکٹری اور اس میں بننے والی گاڑیوں کے اجزاء اور ڈھانچے دکھائے۔سارا کام سارا نظام خود کار تھا۔ وہاں سے اس کے گھر گئے ۔ تین روز تک قیام کیا۔نہایت خوبصورت علاقہ، ہموار سڑکیں،صاف ستھرے اجلے اجلے درخت، قانون کی سختی سے پابندی کرنے والے شہری اور اہلکار۔تین دن کے بعد یہاں سے واپس رائن ہائم آ گئے اور پھر ایک دن اپنے داماد خالد حسین خادم کے ہمراہ ان کے ایک دوست کی دعوت پر گومنڈن گئے۔نہایت خوبصورت سرسبز و شاداب راستہ۔سڑک کے دائیں ہاتھ دریائے رائن رواں دواں تھا اور دریا کے ساتھ ساتھ نہایت صاف شفاف اور ہموار سڑک پر سفر جاری تھا۔سڑک کے بائیں ہاتھ ساتھ ساتھ قدرے بلند اور سرسبز پہاڑ تھے جن پر بکثرت چیل اور دیار وغیرہ کے بلند و بالا سرسبز درخت تھے۔ ہماری منزل بالکل دریا کے کنارے تین چار خوبصورت گھر تھے۔وہاں دعوت کھا کر واپس

اپنے مقامِ رہائش پر آ گئے۔ اجتماع پر بھی بہت سے دوستوں، واقف کاروں، عزیزوں سے ملاقات ہوئی جو یہاں بالکل پُرسکون زندگی بسر کررہے تھے۔ انہیں یہاں ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا۔ سلام کہنے، اذان دینے اور نماز پڑھنے پر پاکستان کی طرح تکالیف سے دوچار نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اور ہر فردِ بشر کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جن کو اسلام بنیادی انسانی حقوق قرار دیتا ہے۔ پاکستان کے بعض لیڈروں کی طرح صرف نعروں اور جھوٹے وعدوں پر نہیں ٹرخایا جاتا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

جرمنی میں احمدیوں کے لیے ہر قسم کی آزادی ہر قسم کا ضروری تحفظ ایک طرف لیکن یہاں قیام پذیر افراد کی ہماری آئندہ نسلوں کا کیا بنے گا۔ جنہوں نے جرمن بچوں کے سکولوں میں تعلیم حاصل کرنی ہے اور انہی کے ماحول میں پرورش پانی ہے جن کے رہن سہن کے طریق ان تمام پابندیوں سے آزاد ہیں جو (دینِ حق) روحانیت کی ترقی کے لیے ایک احمدی اور (مومن) کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

اس سوال نے میرے دماغ کو گھما کر رکھ دیا۔ واپس پاکستان آ کر بھی اس سوال نے پریشان کیے رکھا۔ طرفہ یہ کہ ان یورپی ممالک سے بعض آنے والوں سے جب میں نے اس سوال کا جواب چاہا تو کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ یہ 1995ء کی بات ہے آج جب میں یہ سطور قلم بند کررہا ہوں تو 2016ء ہے۔ گویا بیس اکیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ آج وقت اور تجربہ نے از خود یہ سوال حل کر دیا ہے۔

پہلا جواب تو یہ ہے کہ جماعت احمدیہ خدا تعالیٰ کی قائم کردہ جماعت ہے۔ اس کی حفاظت ہمیشہ اس نے کی ہے اور آئندہ بھی اسی نے کرنی ہے۔ اس کی تقدیر اور ارادہ سے یہ دنیا میں پھیلی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ جماعت کی بھاری تعداد یورپین

اثرات کے تحت دینی و معاشرتی تبدیلی قبول کرلے۔

نمبر2 اللہ تعالیٰ نے جماعت کی حفاظت کے لیے جماعت کو خلافت کی نعمت سے سرفراز کیا ہوا ہے جو ایمان اور عملِ صالح کی ضمانت ہے۔ چند افراد تو بگڑ سکتے ہیں لیکن اکثریت غایت مقصود کو پہنچنے سے قبل بگڑنے سے محفوظ رہے گی۔ انشاءاللہ

نمبر3 عملاً خلافت کی برکت اور نظام جماعت کی مضبوطی کے باعث اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدی مرد و زن یورپین اثرات قبول کرنے کی بجائے اپنے اثرات ان پر ڈال رہے ہیں۔

نمبر4 خلافت اور نظام جماعت سے مضبوط تعلق رکھنے والا ہر خاندان اور تمام افراد وہاں کی برائیوں سے یقیناً محفوظ رہیں گے اور تجربہ اس کا شاہد ہے۔

نمبر5 تجربہ نے بتایا کہ یورپین ممالک میں آباد احمدی احباب جن کے لیے پاکستان میں علمی، مادی اور دینی ترقی کے تمام راستے مسدود کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان احمدی احباب اور ان کی نسلوں نے شاندار علمی ترقی کی ہے جس کا نظارہ جلسہ سالانہ جرمنی اور جلسہ سالانہ انگلستان کے مواقع پر اعلیٰ تعلیمی قابلیت کی حامل طالبات وطلباء کو انعامات اور میڈلز دیے جانے کے وقت کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ میری دو پوتیاں جو عزیزم رفیق احمد رہان اور عزیزہ بشریٰ ریحانہ کی بیٹیاں ہیں شاندار تعلیمی نتائج پر میڈلز حاصل کر چکی ہیں۔

ایک پوتا عزیزم انیق احمد رہان زندگی وقف کر کے جامعہ احمدیہ جرمنی سے فارغ التحصیل ہو کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے مربی بن چکا ہے۔

پس دنیا بھر کے جامعہ ہائے احمدیہ میں واقفین زندگی کی کثرت بھی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احباب جماعت کو قوت مؤثرہ وافر مقدار میں عطا کی ہے۔ وہ دنیا کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنانے کے لیے ہر لمحہ تیار بیٹھے ہیں اور اپنوں

کی اصلاح اور تربیت کے لیے وہ اعلیٰ نمونہ اور قوت علمی و عملی سے سرشار ہیں۔

ہاں ان انتظامات کے باوجود اگر کوئی شخص خلافت اور نظام جماعت سے تعلق نہ رکھ کر اپنی بدقسمتی پر خود مہر لگاتا ہے تو ایسے افراد ہمیشہ ہی الٰہی جماعتوں میں ہوا کرتے ہیں اور جماعت سے نکلنے والوں کی جگہ اللہ تعالیٰ فرد کی جگہ جماعتیں عطا کرتا ہے۔ جماعت احمدیہ میں بھی اس کا تجربہ خلافت ثانیہ کے قیام پر ہو چکا ہے۔

جرمنی میں مجھے بلڈ پریشر کے عارضہ کے لیے کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ عزیزم رفیع احمد کامران نے ڈاکٹر سے وقت لیا۔ مقررہ وقت پر ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے۔ انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ میری باری آئی تو ڈاکٹر صاحب کمرے سے باہر میرے پاس آئے۔ مصافحہ کیا اور مجھے کمرے میں لے گئے۔ عزیزم رفیع احمد بھی ساتھ تھے۔ بلڈ پریشر چیک کیا۔ بذریعہ رفیع احمد ضروری ہدایات دے کر فارغ کیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ ڈاکٹر خود باہر مجھے لینے آیا۔ میرے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھے ساتھ کمرے میں لے کر گیا۔ پھر رخصت کرنے کے لیے بھی کمرے سے باہر آیا۔ کیونکہ میرے ذہن میں تو پاکستانی ڈاکٹروں کا تصور تھا جو دوسری بار کوئی بات پوچھنے پر مریض کو جھڑک کر رخصت کرتے ہیں۔

اب جرمنی سے واپسی کا وقت آن پہنچا۔ ایک ماہ کا ویزا تھا۔ مدت ختم ہو رہی تھی۔ ویزا کی مدت کے اندر اندر جرمنی سے رخصت ہونا تھا۔ اب بہن، بہنوئی، تین بھانجوں، ان کے اہل و عیال، بیٹا، پوتا پوتیاں، بیٹے اور نواسے نواسی اس کے علاوہ بعض اور احباب سے رخصت ہو کر فرنکفرٹ ایئر پورٹ پر پہنچے۔ پی آئی اے کے جہاز پر سوار ہوئے اور ساڑھے تین بجے صبح کراچی پہنچ کر ایئر پورٹ سے باہر آئے۔

بشیر احمد دیر سے باہر آیا۔ چنانچہ وہاں سے حیدر آباد اپنی بیٹی امۃ السلام کے پاس آئے۔ بشیر احمد بھی وہاں تھا۔ دو دن قیام کے بعد ربوہ روانگی ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کے

فضل سے بخیریت تمام گھر پہنچ گئے۔گھر میں دو بیٹیاں منتظر تھیں۔اسی طرح دوسرے عزیز بھی آ گئے۔تین چار روز بعد ایمبیسی کے منشاء کے مطابق اسلام آباد جا کر ایمبیسی میں اپنی آمد کی رپورٹ کی۔وہاں سے عزیزم مسعود احمد کے ہاں چلے گئے۔اہلیہ ہمراہ تھیں۔آرام کیا اور پھر اگلے روز ربوہ آ گئے۔الحمدللہ تمام سفر خیریت سے گزر گیا۔

جرمنی سے واپسی اور ربوہ میں مصروفیات

دفتر حاضری دی اور پھر مولانا ابوالمنیر صاحب کے ساتھ مل کر مفوضہ کام سر انجام دینا شروع کیا۔اب میری عمر پینسٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ استاد محترم فرماتے کہ مجھے سائیکل پر بٹھا کر مختلف دفاتر میں لے چلو۔کچھ عرصہ تو جیسے تیسے تعمیل ارشاد کرتا رہا لیکن آخر میرے لیے ربوہ کے اژدہام میں مولانا کو پیچھے بٹھا کر سائیکل چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ایک دن عرض کر ہی دیا کہ اب میں بھی بڑھاپے کی عمر میں ہوں میرے لیے آپ کو بٹھا کر سائیکل چلانا خالی از خطرہ نہیں۔اگر کسی وقت مجھ کمزور سے رش میں سڑک پر سائیکل پھسلی اور آپ جیسے قیمتی وجود کو چوٹ آ گئی تو اس سے بڑھ کر میری اور کوئی بدبختی نہیں ہوگی۔اس لیے براہِ کرم اب آپ تانگہ وغیرہ لے لیا کریں۔تاکہ آپ کا قیمتی وجود کسی گزند سے محفوظ رہ سکے۔بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور اس طرح میری مشکل بھی حل ہوگئی۔بہر حال ان کے ساتھ کام کرنے سے مجھے بہت علمی فائدہ ہوا۔الحمدللہ ان کی وفات تک ان کے ساتھ کام جاری رہا۔

دفتر منصوبہ بندی میں فرائض کی ادائیگی

دفتری ریکارڈ کے مطابق خاکسار دو مختلف مواقع پر مذکورہ دفتر میں مکرم ظفر احمد صاحب ظفر مربی سلسلہ کے ماتحت مخالفین کے خطوط اور مضامین کے جوابات پر مشتمل

خطوط اور مضامین ان کی ہدایت کے مطابق تیار کرتا رہا۔ یہ کل عرصہ قریباً دو سال کا بنتا ہے۔ بعض مضامین شائع بھی ہوئے۔ اس عرصہ میں میرا ملکۂ تحریر جو دبا ہوا تھا از سرِ نو ابھر آیا۔ اور مجھے سینکڑوں خطوط اور سینکڑوں صفحات پر مشتمل مضامین تیار کرنے کی توفیق ملی جن میں سے کچھ کی نقول آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں اور زیادہ تر مضامین وخطوط وغیرہ کی نقول کی فائل مذکورہ دفتر میں موجود و محفوظ ہونے کی توقع ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو ان مضامین کو کمپوز کر کے باجازت مرکز احباب جماعت کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا۔ ان سطور میں مَیں اپنے انچارج مکرم ومحترم ظفر احمد ظفر صاحب مربی سلسلہ کے حسن سلوک اور عزت واحترام پر مبنی طرز عمل کا بے حد ممنون ہوں۔ میں نے انہیں بحیثیت افسر کبھی غصہ میں نہیں دیکھا۔ اپنے تمام ساتھیوں کا احترام ان کے کردار کا اہم حصہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ ان کے حسنِ سلوک اور طرز عمل کے باعث ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے ہمیشہ ہی دعا کی توفیق مل جاتی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

حضرت مرزا مسرور احمد صاحب ایدہ اللہ کے متعلق ایک اہم واقعہ

ربوہ قیام کے دوران ایک دفعہ میری ڈیوٹی (بیت) مبارک کی صفائی کی نگرانی پر لگائی گئی۔ اس سلسلہ میں اغلباً نماز ظہر کے وقت خاکسار (بیت) مبارک میں گیا۔ کچھ لوگ سنتیں ادا کر رہے تھے۔ ان میں حضرت مرزا مسرور احمد صاحب (ایدہ اللہ) بیت مبارک کے دائیں طرف والے حصہ میں نہایت خشوع وخضوع اور گہری توجہ سے محوِ نماز تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت بڑا جماعتی کام لینا ہے۔ لیکن میں نے اس بات کا کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ خلافت خامسہ کے انتخاب سے ایک روز قبل نماز فجر کی ادائیگی کے بعد (بیت) ناصر سے نمازی

باہر آرہے تھے کہ ان میں خواجہ ایاز احمد صاحب پروفیسر جامعہ احمدیہ اور مَیں (بیت الذکر) سے نکل رہے تھے۔خواجہ صاحب کہنے لگے پتہ نہیں خلیفہ کون ہوگا۔میرے منہ سے بلاتردد نکلا۔''میاں مسرور صاحب''۔اور انتخاب کے بعد حضرت میاں مسرور احمد صاحب ایدہ اللہ ہی خلیفۃ المسیح الخامس منتخب ہوئے۔

میں اس واقعہ کو حلفاً بیان کرتا ہوں کہ یہ درست ہے۔اسی طرح انتخاب خلافت سے قبل متعدد احمدیوں کی خوابوں میں بھی ظاہر ہو گیا تھا کہ خلیفہ کون ہوں گے۔جو اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ خلیفہ خدا بناتا ہے۔اور بنواتا بندوں سے ہی ہے۔ اور جماعت احمدیہ تو پانچ بار اس عمل سے گزرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس بات پر قائم ہے کہ خلیفہ خدا بناتا ہے۔جس کو خدا خلیفہ بنانا چاہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جس کو نہ بنانا چاہے ساری مسلم امہ بھی اکٹھی ہو کر اسے خلیفہ نہیں بنا سکتی۔

جیسا کہ گزشتہ دہائیوں میں بھٹو صاحب نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا۔پس مبارک ہے جماعت احمدیہ جس کو خدائی خلافت عطا ہوئی ہے۔اللہ کرے ہم سب احمدی خلافت کی دل و جان سے اطاعت کرنے والے ہوں۔ہماری آئندہ نسلیں بھی خلافت سے وابستہ رہ کر اللہ تعالیٰ کے قرب اور پیار کو حاصل کرنے والی ہوں۔آمین

دارالقضاء میں ایک مقدمہ

1998ء میں مَیں نے اپنے بیٹے، داماد اور بھائی کے داماد کے لیے طاہر آباد میں سات کنال زمین خرید کر اس کی چاردیواری کر کے اس میں ایک چھوٹا سا رہائشی مکان جو ایک بڑے کمرے اور ایک باورچی خانہ پر مشتمل تھا، تعمیر کرایا۔کچھ عرصہ کے بعد مجھے اس زمین کو سنبھال نہ سکنے کے باعث فروخت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میرے ایک دوست رانا نصیر احمد صاحب پراپرٹی ایجنٹ تھے۔ان کو زمین فروخت

کرنے کے لیے کہا۔ایک دن ان کے مکان پر ایک انویسٹر ایک پراپرٹی ڈیلر کے ہمراہ آ گئے اور زمین کے سودا کی خواہش کی۔میں نے ان کو کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ زمین فروخت کروں گا تو اپنی طرف سے کمیشن رانا نصیر احمد صاحب کو دوں گا کسی اور کو نہیں۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو سودا کرتے ہیں۔آنے والے دوستوں نے یہ شرط منظور کی۔ چنانچہ میں نے ان کو کہا کہ زمین چھ کنال فروخت کرنی ہے۔ایک کنال کی رجسٹری ممکن نہیں کیونکہ اس کا مالک ملک سے باہر ہے اور وہ آ بھی نہیں سکتا اور چھ کنال کا تینتیس لاکھ روپے لوں گا۔انہوں نے کچھ کم کرنے کو کہا تو میں نے ساڑھے بتیس لاکھ لینے کو کہا۔ چنانچہ اس قیمت میں سودا طے ہو گیا۔اور جو انویسٹر تھے انہوں نے اسی وقت چار لاکھ روپے بیعانہ بھی دے دیا اور رجسٹری کے لیے کوئی میعاد مقرر کر لی، جو اَب مجھے یاد نہیں۔سودا کی کوئی تحریر نہ ہوئی، زبانی کلامی بات ہوئی۔میں نے رانا نصیر احمد صاحب کو کہا کہ ان سے بیعانہ تو لے لیا ہے لیکن ان کو کوئی تحریر نہیں دی۔ان سے پیسے لیے ہیں تو ان کو تحریر بھی دینی چاہیے۔انویسٹر صاحب کو تو میں جانتا نہیں۔پراپرٹی ڈیلر صاحب آپ کے واقف ہیں اس لیے ان کے نام رسید لکھ دیتے ہیں۔میں نے تو اپنی سادگی میں یہ ارادہ کیا۔رانا نصیر بھی اس کام کے غلط انجام کو نہ بھانپ سکا۔ چنانچہ پراپرٹی ڈیلر صاحب کے نام رسید لکھ دی۔چار لاکھ روپیہ ان سے بیعانہ لیا ہے اور زمین ان کو فروخت کی ہے۔

جو انویسٹر ہمارے پاس آیا تھا وہ آگے سید ندیم شاہ انویسٹر کا کارندہ تھا۔اس نے سودا ہوتے ہی اسے فون کیا کہ آپ کے لیے چھ کنال کا عمدہ قطعہ پینتیس لاکھ تیس ہزار روپے میں خرید لیا ہے اور اس بات کا ذکر اس نے اپنے ساتھ آنے والے پراپرٹی ڈیلر سے کر دیا کہ میں نے دو لاکھ تیس ہزار روپے اس سودے سے کمائے ہیں۔اس پراپرٹی ڈیلر کی نیت میں فوراً فتور آیا۔اس نے ندیم شاہ کے ایک اور کارندے کو کھڑا کر کے مخفی طور

پر پینتیس لاکھ تیس ہزار روپے میں اس انویسٹر والا سودا طے کر لیا۔ اور ایک اسٹامپ پیپر پر میری طرف سے اپنے نام سودا ظاہر کر کے اس پر مجھ سے دستخط بھی کرا لیے۔

مقررہ تاریخ پر رقم کی ادائیگی کرتے ہوئے رجسٹری ندیم شاہ کے نام کرالی اور ادائیگی بھی ندیم شاہ کی طرف سے کی لیکن میری جس قدر رقم باقی بنتی تھی اس میں انہوں نے ایک لاکھ اسی ہزار روپے زیادہ میرے کھاتہ میں جمع کروا دیے اور پہلے انویسٹر سے الگ ایک لاکھ روپے کمیشن بھی وصول کر لیا اور سودا میں سے اس کا پتہ بالکل کاٹ دیا۔ اس طرح اس نے بد دیانتی کی انتہا کر دی۔ رجسٹری کروا کر جب چنیوٹ سے واپس آ رہے تھے تو میں نے کہا کہ ایک لاکھ اسی ہزار روپے تو اب ندیم شاہ کے ہیں جس نے رقم ادا کی ہے۔ وہ پراپرٹی ڈیلر صاحب فوراً بولے ندیم شاہ ان پیسوں کا کیا لگتا ہے۔ مجھے ان کی نیت کی اس وقت سمجھ آئی۔ خیر گھر آ گئے۔

دو تین روز بعد وہ پراپرٹی ڈیلر صاحب اپنے بعد والے شراکت دار کے ساتھ میرے گھر آئے اور ایک لاکھ اسی ہزار روپے کا تقاضا کیا۔ میں نے کہا بیعانہ مجھے پہلے انویسٹر نے دیا تھا۔ رقم ندیم شاہ نے ادا کی ہے۔ آپ تینوں فریق اکٹھے ہو کر آ جائیں اور فیصلہ کر لیں کہ رقم کس کی ہے میں اسے بلا عذر دے دوں گا۔ کیونکہ میں نے جو مانگا تھا وہ مجھے مل گیا۔ کہنے لگے ایسے نہیں کریں گے۔ میں نے کہا میں امور عامہ میں رقم جمع کروا دیتا ہوں وہاں سے جس کی بنے وہ لے لے۔ کہنے لگے یہ بھی منظور نہیں۔ میں نے کہا یہ رقم تعمیر (بیت) ناصر میں دے دیتے ہیں۔ اس کا بھی انہوں نے انکار کیا۔ آخر میں نے ندیم شاہ کو بلایا اور اس کو رقم کا چیک دے دیا۔ کیونکہ ادائیگی اس نے کی تھی۔ رجسٹری بھی اسی کے نام تھی۔ اس پر ان پراپرٹی ڈیلر صاحب نے بعض وکلاء سے مشورہ کیا۔ کسی وکیل نے حامی نہ بھری۔ آخر ایک ایسا وکیل جس کی شہرت اچھی نہ تھی اس کے ذریعہ مجھ پر ایک لاکھ اسی ہزار روپے دیے جانے کا دعویٰ کر دیا۔ جس سے

مجھے بے حد پریشانی ہوئی۔ وزن بھی کم ہوا۔ بہت پریشان ہوا کہ مجھے وہ پراپرٹی ڈیلر وغیرہ ایک لاکھ روپے کی پیش کش کر رہے تھے کہ آپ لے لو۔ اسّی ہزار ہمیں دے دو۔ میں نے اس سے صاف انکار کیا۔ ادائیگی جس نے کی تھی اس کو رقم واپس کر دی، مقدمہ کیسا؟ تاہم مقدمہ کی کئی ماہ تک سماعت جاری رہی۔ پروفیسر ریٹائرڈ چوہدری صادق علی صاحب مرحوم قاضی تھے۔ انہوں نے ان کے خلاف اپنے فیصلہ میں لکھا

"دو پراپرٹی ڈیلروں نے ایک واقف زندگی کو اپنی بددیانتی میں شامل کرنا چاہا پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بچالیا۔"

اور مقدمہ خارج کر دیا۔ اس پر مدعیوں نے مرافعہ اولیٰ میں اپیل کی۔ وہ بھی خارج کر دی گئی۔ پھر وکیل مدعیان نے مرافعہ ثانیہ میں اپیل کی وہاں بھی فیصلہ قاضی اول بحال رکھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے میرے دامن پر کوئی بھی داغ لگنے سے بچالیا اور مجھے سکون بھی ملا اور دیانت داری کی مثال قائم کرنے کی توفیق بھی ملی۔ لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی لالچ اچھے بھلے انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور آدمی کے پھسل جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچائے۔ آمین

دارالقضاء میں خدمت کی توفیق (از جنوری 1993ء تا 2014ء)

خاکسار کو لمبا عرصہ بطور قاضی دارالقضاء ربوہ میں خدمات بجالانے کا موقع ملا۔ اس بیس اکیس سال کے قضائی تجربہ میں اللہ تعالیٰ نے معلومات میں بہت وسعت عطا فرمائی۔ بہت سے انسانوں کو پرکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ مختلف نوعیت کے مقدمات کی سماعت کی جن میں لین دین، جائیداد، حقوق کی ادائیگی وغیرہ شامل تھے لیکن زیادہ تر کیس خلع اور طلاق اور فریقین کے حقوق کے تھے۔ سارے تجربہ کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ تنازعات اپنی جگہ، اس میں کھینچا تانی کی کوششیں بھی اپنی جگہ لیکن احمدیوں میں

ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی کہ قسم کھانے سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس معاملہ میں دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔

ایک خاتون ٹیچر تھیں۔ انہیں ریٹائرمنٹ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے ملے۔ اس نے قومی بچت میں رکھنے چاہے تو اس کے ساتھ کی دو ٹیچرز نے انہیں سرگودھا میں ایک رہائشی قطعۂ زمین خریدنے پر آمادہ کر لیا کہ وہاں زمین کی قیمتیں بہت جلد بڑھ رہی ہیں دو تین سال میں آپ کی رقم دگنی تگنی ہو جائے گی۔ آپ پیسے ہمیں دے دیں۔ چنانچہ قریباً بیس سال بعد مدعیہ نے قضا میں دعویٰ دائر کیا کہ فلاں فلاں ٹیچرز نے مجھ سے اتنی رقم خریداری زمین کے لیے لی تھی اب وہ نہ زمین دے رہی ہیں اور نہ رقم۔

اس رقم کی کوئی رسید بھی نہ لی گئی تھی۔ تاہم درخواست سماعت کے لیے منظور کر لی گئی۔ فائل مجھے بھیج دی گئی۔ بظاہر تو کیس قابل پیش رفت نہ تھا تاہم مدعا علیھما کو طلب کیا گیا۔ وہ کوئی درست جواب دینے کے لیے تیار نہ تھیں۔ آخر تجویز ہوئی کہ مدعا علیھما قسم اٹھا لیں کہ انہوں نے مدعیہ سے رقم نہ لی تھی اور نہ دینی ہے تو مدعیہ دعویٰ واپس لے لیں گی۔ مدعیہ نے اس پر تحریر لکھ دی۔ چنانچہ ان دونوں ٹیچرز کو قسم کھانے کے لیے بلایا گیا تو انہوں نے فوراً کہا کہ ہم دو روز میں رقم ادا کر دیں گی قسم نہیں اٹھائیں گی۔ چنانچہ بیس سالہ معاملہ اس طرح حل ہو گیا کہ انہوں نے رقم ادا کر دی۔

اسی طرح ایک مقدمہ لین دین میں تین افراد ملوث تھے۔ ایک مدعی تھے اور دو مدعا علیہ۔ مدعا علیھا ن میں سے ایک پر مدعی کا دعویٰ یہ تھا کہ اس نے دوسرے مدعا علیہ کی طرف سے مجھے پچیس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ انکاری ہے کہ میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ تحریر کوئی موجود نہ تھی۔ اس پر مدعی نے کہا کہ اگر وہ مدعا علیہ قسم کھا لے کہ اس نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا تو میں رقم سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مدعا علیہ کو جب حلف لینے کے لیے کہا گیا تو اس نے حلف نہیں دیا بلکہ رقم ادا کرنے کا

وعدہ کرلیا۔اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ احمدی بہر حال اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

بطور قاضی کام کرتے ہوئے مجھے ابتداء میں کچھ عرصہ محترم آغا سیف اللہ صاحب، بعد ازاں چوہدری نصیر احمد صاحب نائب ناظم دارالقضاء اور حافظ راشد جاوید صاحب مربی سلسلہ ناظم دارالقضا کی رہنمائی اور بہت عمدہ تعاون حاصل رہا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین

قضاء میں مرافعہ اولیٰ میں جس میں قضاء اول کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی جاتی ہے دو قاضی سماعت کرتے ہیں۔ مجھے بھی بہت سے مقدمات میں شریک قاضی صاحب کے ساتھ سماعت کی نوبت آئی۔اول تو سارے قاضی صاحبان ہی بہت مخلص اور دیانت داری سے اپنے فرائض ادا کرتے تھے لیکن بعض قاضی صاحبان کا کردار بہت بلند تھا۔اس سلسلہ میں مَیں چوہدری ظفر اللہ خان وڑائچ ایل۔ایل۔بی کی مثال دوں گا۔ایکسائز کے محکمہ سے ریٹائر ہوئے تھے اور ایل۔ایل۔بی کر کے تیس سال تک ملازمت میں رہے اور دیانت داری کی مثالیں قائم کیں۔ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ آباد ہو گئے تو بطور قاضی ان کا تقرر ہو گیا۔

ایک مقدمہ چار سے کے پیسے کے لین دین کا تھا۔ یہ تین صد روپے کا مقدمہ تھا۔ قضاء اول کے فیصلہ کے بعد یہ مرافعہ اولیٰ میں آ گیا۔میں شریک قاضی تھا۔فریق مدعی کو کہا کہ دیکھو ایک سو روپیہ میں دیتا ہوں۔ایک سو روپیہ مدعا علیہ دیتا ہے اور ایک سو روپیہ تم چھوڑ دو۔ چنانچہ فریقین نے فیصلہ قبول کر لیا اور چوہدری صاحب نے اسی وقت ایک سو روپیہ اپنے پاس سے دیا اور سو روپے مدعا علیہ سے لے کر مدعی کو دیے اور مقدمہ ختم کر دیا۔میرا خیال ہے کہ قضا کے مقدمات میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک مقدمہ ان کے پاس سماعت کے لیے آیا۔ اس میں ایک نوجوان ایل۔ایل۔بی وکیل پیش تھے۔وہ کہنے لگے کہ ایک تو قضا میں ان پڑھ قاضیوں سے واسطہ پڑ

جاتا ہے۔ چوہدری صاحب نے بڑے تحمل سے فرمایا

آپ کی عمر کتنی ہے؟

وکیل نے اغلباً تیس سال عمر بتائی۔ تو چوہدری صاحب کہنے لگے آپ کی پیدائش سے دو سال پہلے میں نے ایل۔ ایل۔ بی کیا تھا۔ اس پر وکیل شرمندہ ہو گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ چوہدری صاحب نہایت سادہ لباس رکھتے تھے۔ سر پر پگڑی تو وہ بھی کسی عمدگی سے باندھ کر نہ رکھتے تھے۔ تہبند اور قمیض میں رہتے تھے۔ شاید کبھی شلوار بھی پہنی ہو لیکن میں نے ان کو اسی لباس میں دیکھا۔ بعض اوقات دوستی کے ناطے گھر بھی آجاتے تھے۔ گھر میں سیاہ شہتوت کا درخت تھا۔ آ کر شہتوت کھاتے تھے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے بطور قاضی اول بیس سالوں میں بہت سارے مقدمات کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے بہت ڈر ڈر کر۔ زیادہ تر مقدمات خلع اور طلاق وغیرہ کے ہی تھے۔ ان مقدمات میں میری پہلی کوشش یہ ہوتی تھی کہ صلح ہو جائے اور فریقین کو سمجھانے بجھانے سے اس میں متعدد بار کامیابی بھی ہوئی ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

ایک مدعیہ نے خلع کا دعویٰ دائر کیا۔ سماعت کے لیے کیس مجھے بھیج دیا گیا۔ تاریخ پیشی پر صرف مدعیہ آئی تھی۔ اس سے پوچھا کہ آپ کیوں خلع لینا چاہتی ہیں۔ کہنے لگی خاوند کی تین بہنوں میں سے ایک مجھے تنگ کرتی ہے اور ٹکنے نہیں دیتی۔ مدعیہ نوجوان تھی اور صرف ایک بچہ تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کی بھاوجیں کتنی ہیں۔ کہنے لگی تین۔ میں نے کہا کہ آپ ایک نند کو برداشت نہیں کرتی تو کیا تین بھاوجیں آپ کو برداشت کریں گی۔ جاؤ پندرہ دن سوچ کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا کہ آئندہ پیشی پر میاں بیوی دونوں آئے اور صلح نامہ لکھ کر دے گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ گھر ٹوٹنے سے بچ گیا۔

ایک دفعہ ایک دوست کی بچی کے خلع کا کیس میرے سپرد ہو گیا۔ فائل ابھی میرے پاس نہیں آئی تھی کہ وہ دوست میرے پاس پہنچ کر صورتحال بیان کرنے لگے۔ میں نے سکون سے ان کی بات سنی اور اگلے روز فائل آنے پر مقدمہ ہٰذا سننے سے معذرت کر لی۔ کیونکہ ایک طرف کی بات سن چکا تھا۔ میں نے کسی بھی مدعی یا مدعا علیہ کی قضا کی کرسی پر بیٹھے بغیر بات نہیں سنی تا کہ یکطرفہ ذہن پر اثر نہ ہو۔

قضا میں وکلاء بھی پیش ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے وکیل نے اپنے مؤکل کی طرف کی ہی بات کرنی ہوتی ہے۔ چاہے انصاف متاثر ہو رہا ہو۔ وکلاء میں سے میں نے چوہدری محمد شریف خالد صاحب کو حقیقت پسند وکیل پایا ہے۔ ایک مقدمہ میں مدعی مقدمہ نے اپنے بہنوئی پر کچھ رقم کی عدم ادائیگی کا دعویٰ کیا۔ قضا اول میں مدعی نے کہا کہ اگر مدعا علیہ حلف اٹھا لے تو میں دعویٰ سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ مدعا علیہ جرمنی تھا اس کو حلف کے الفاظ لکھ کر ارسال کیے گئے اس نے اس پر دستخط کر کے واپس قضا کو حلف نامہ ارسال کر دیا۔ قاضی اول نے دعویٰ خارج کر دیا۔ اب مدعی نے پھر چوہدری محمد شریف صاحب کے ذریعہ اس کیس کے فیصلہ کے خلاف اپیل کی۔ مرافعہ اولیٰ میں کیس زیر سماعت آیا۔ خاکسار اور ایک اور قاضی شریک سماعت تھے۔ میں نے چوہدری صاحب سے عرض کیا کہ چوہدری صاحب قضا اول میں آپ ہی اس مقدمہ کے وکیل تھے اور آپ ہی نے مدعی کی مرضی سے حلف نامہ تحریر کر کے بھجوایا۔ مدعی اقراری تھا کہ وہ حلف پر کیس سے دست بردار ہو جائے گا اب آپ ہی اس کی وکالت کر رہے ہیں۔

اسی وقت چوہدری صاحب نے مؤکل کو اس کیس سے دست بردار ہونے کا کہا اور قضا کو لکھ دیا کہ کیس داخل دفتر کیا جائے۔ اور مؤکل کو کہا کہ میں اس کی فیس میں آپ کا دوسرا کیس لڑوں گا۔ میرے دل پر اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

مدرسۃ الظفر وقف جدید میں خدمت

اغلباً1998ء میں مجھے پھر بطور مربی حسین آ گاہی ملتان جانے کا نظارت اصلاح وارشاد کا حکم ملا۔ملتان میں بطور مربی فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا کہ 1999ء کی کسی تاریخ کو واپس مرکز بلا کر مجھے مستعار طور پر انجمن وقف جدید میں رپورٹ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ وقف جدید میں اس وقت بطور ناظم ارشاد چوہدری اللہ بخش صاحب متعین تھے۔ان سے ملاقات پر مجھے علم ہوا کہ مجھے مدرسۃ الظفر میں بطور ٹیچر خدمات انجام دینے کے لیے بلایا گیا ہے۔ کیونکہ اب طلباء میٹرک پاس کر کے آتے تھے اور بالکل نوجوان ہوتے تھے ان کی تدریس کے ساتھ کردار کی بہتری کے لیے معمر با کردار اساتذہ کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ مجھ سے قبل مکرم رفیق احمد جاوید صاحب مربی سلسلہ وہاں پڑھا رہے تھے۔ وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے لیکن بہرحال انصاراللہ صف اول میں ان کا بھی شمار تھا۔مکرم ومحترم قاری محمد عاشق صاحب بھی بزرگ اساتذہ میں شامل تھے۔ علاوہ ازیں کچھ نوجوان مربیان بھی تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔محترم مبشر احمد خالد صاحب مربی سلسلہ پرنسپل مدرسۃ الظفر تھے۔ مدرسہ کا نصاب اس وقت دوسال پر محیط تھا۔ دوسال بعد امتحان لے کر پاس ہونے والے طلباء کو معلم بنا کر جماعتوں کی تربیت کے لیے متعین کیا جاتا تھا۔نصاب میں قرآن مجید کا ترجمہ، احادیث کی چھوٹی چھوٹی ایک دوکتب، سیرت خاتم النبیین ،سیرت حضرت مسیح موعودعلیہ السلام،اعتراضات کے جوابات کے علاوہ بھی بعض موضوعات تعلیم کے لیے مقرر تھے۔

چنانچہ اب صبح صبح مدرسہ میں پہنچنا ہوتا تھا۔طلباء کی رہائش دارالصدر ہوسٹل میں تھی اور تدریس کے لیے دفتر وقف جدید کی بالائی منزل پر انتظام تھا۔تدریس کا آغاز

اسمبلی سے ہوتا تھا جس میں تلاوت قرآن مجید کے بعد طلباء کی حاضری لی جاتی اور پھر ان کو کلاس رومز میں نظم وضبط کے ساتھ جا کر بیٹھنا ہوتا۔ غالبا ہر پیریڈ نصف گھنٹے کا ہوتا تھا۔ عام طور پر نوجوان اساتذہ کو صبح صبح بچوں کو سکول چھوڑنا ہوتا تھا۔ اس لیے اسمبلی میرے ذمہ لگادی جاتی۔ بعض اوقات سردیوں میں بھی اسمبلی چھ بج کر پچاس منٹ پر صبح ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ میں ہمیشہ چھ بج کر انچاس منٹ پر یا اس سے پہلے پہنچا ہوں۔ اکاون منٹ کبھی نہیں ہوئے۔ اسی طرح جتنا عرصہ مدرسہ میں تدریس سے وابستگی رہی یہ ریکارڈ ہے کہ میں کبھی بھی پیریڈ میں ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہوا۔ حالانکہ اب میری عمر 2000ء تک ستّر سال ہوگئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اچھی صحت سے نوازا ہوا تھا۔ تدریس کے لحاظ سے بھی بعض اوقات ہفتہ میں چھبیس پیریڈ تک پڑھایا۔ ہوسٹل میں بھی طلباء جو علمی پروگرام بناتے اس میں بھی ہمیشہ ان سے تعاون کیا ہے۔ طلباء کو ہمیشہ اپنے بیٹے ہی سمجھا ہے اور اگر ان کے بارہ میں مدرسہ کی انتظامیہ کو کوئی شکایت پیدا ہوئی تو ایسے بچوں کو گھر بلا کر ان کی تواضع بھی کی جاتی اور ان کو سمجھایا بھی کرتا تھا۔ اس طرح طلباء سے پیار، خلوص اور احترام کا تعلق پیدا ہو جاتا تھا۔

میرے گھر حضرت مرزا مسرور احمد صاحب ایدہ اللہ کی تشریف آوری

یونہی شب و روز گزرتے گزرتے فروری 2001ء آپہنچا۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی سلمیٰ نورین کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ مجھے شدید خواہش پیدا ہوئی کہ محترم امیر صاحب مقامی و ناظر صاحب اعلیٰ حضرت صاحبزادہ مرزا مسرور احمد صاحب کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ آپ تشریف لا کر بچی کو دلی دعاؤں سے رخصت فرمائیں۔ اس غرض کے لیے خاکسار نظارت علیا میں حاضر خدمت ہوا اور مدعا عرض کیا۔ استدعا منظور کرتے ہوئے فرمایا کہ وقت کیا ہوگا۔ عرض کیا جو وقت آپ دیں اسی

وقت دعا کر لی جائے گی۔ چنانچہ 15 فروری تاریخ رخصتی پر آپ اور مولانا سلطان محمود انور صاحب تشریف لائے اور دعائے رخصتی کروائی۔الحمدللہ۔فجز اھم اللہ احسن الجزاء

دعا کے بعد آپ کی خدمت میں چائے پیش کی گئی۔کافی مہمان اور بھی شریک ہو گئے۔عزیزم رفیق احمد بھی جرمنی سے بہن کی شادی پر آئے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں دریافت فرمایا کہ آپ کے کتنے بیٹے جرمنی میں ہیں۔عرض کیا کہ میاں صاحب دو بیٹے ہیں دونوں ہی جرمنی ہیں۔تو فرمایا آپ کب جرمنی جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا میاں صاحب میرا بھانجا عزیزم ظریف قمر جو سب عزیزوں کو لے جانے کا باعث بنا ہے، اس نے مجھے خط لکھا کہ ماموں آپ بڑے ہیں آپ کی سوچ ضرور ٹھیک ہو گی لیکن کبھی کبھی چھوٹوں کی بات پر بھی غور کر لینا چاہیے۔آپ سب کچھ فروخت کر کے جرمنی آ جائیں میں آپ کی بڑی مدد کروں گا۔میاں صاحب جو جواب میں نے ان کو دیا تھا آپ کی خدمت میں بھی عرض کر دیتا ہوں۔ میں نے اسے لکھا تھا کہ آپ کی پیش کش کا بہت شکریہ۔ابھی تو میرے چار بچے شادی کرنے والے رہتے ہیں زندگی نے وفا کی تو پہلے ان کی شادی کروں گا۔شادی کے بعد بہشتی مقبرہ یہاں سے قریب ہے۔ وہ فرمانے لگے بس پھر یہیں رہو۔ چنانچہ ربوہ میں جی جان سے بس رہے ہیں۔

جرمنی کا دوسرا سفر

بیٹی کی شادی کے بعد یونہی فرائض کی ادائیگی میں شب و روز گزر رہے تھے کہ جرمنی سے بیٹوں کی طرف سے دو ماہ کے ویزہ کے لیے سپانسر لیٹر مل گیا۔ اہلیہ اور میرے لیے تھا۔ایمبیسی ویزہ کے لیے درخواست دی تو انہوں نے مجھے تو ویزہ دے دیا لیکن اہلیہ کے لیے کچھ رقم کی ضمانت کی شرط عائد کر دی جو جرمنی بنک میں سپانسر کرنے والوں نے جمع کرا کر رسید بھیجنی تھی جس پر ویزہ جاری کیا جانا تھا۔ 2001ء میں جلسہ

بھی انگلستان کی بجائے جرمنی میں ہو رہا تھا کیونکہ انگلستان میں Mad Cow کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اب گویا مرکزی وفد نے بھی انگلستان کی بجائے جرمنی جانا تھا۔ چنانچہ امیر صاحب مقامی کی اجازت سے میں بھی مرکزی وفد کے ساتھ لاہور پہنچ گیا اور رات کو دارالذکر لاہور قیام کیا۔ رات کو کچن میں ناشتہ کا سامان بازار سے لا کر رکھ دیا تھا۔ علی الصبح اٹھ کر چائے اور ڈبل روٹی کا ساتھیوں سمیت ناشتہ کر کے ایئر پورٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ الحمدللہ بڑے اچھے وقت ایئر پورٹ پہنچ کر چیکنگ کے طریق کار سے گزرتے ہوئے جہاز میں سوار ہوئے۔ پی۔ آئی۔ اے کا جہاز ہالینڈ سے ہو کر فرنکفرٹ جرمنی جا رہا تھا۔ دس گھنٹے کے سفر کے بعد فرنکفرٹ پہنچ گئے۔ باہر میرے بیٹے اور عزیز لینے آئے ہوئے تھے۔ کسٹم اور ایئر پورٹ کے دوسرے امور کی تکمیل کے بعد باہر نکلے اور عزیزم رفیق احمد کے گھر رائن ہائم پہنچ کر آرام کیا۔ اس سفر کی سب سے اہم چیز قومی جلسہ سالانہ میں شمولیت اور بعد ازاں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے ملاقات کی سعادت تھی اور میں شکر کے جذبات سے لبریز تھا کہ وہ غریب و بے کس جس کے پاس والد صاحب کی وفات کے بعد گاؤں سے ربوہ پہنچنے کے لیے پانچ روپے کرایہ نہیں تھا آج اللہ کے فضل نہیں افضال سے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر جرمنی پہنچ گیا، امام وقت سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔

جلسہ سالانہ من ہائم میں ایک بہت بڑی مارکیٹ میں منعقد ہوا جس کے سارے انتظامات رضا کاروں کے ہاتھ میں تھے جنہوں نے نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے تمام انتظامات مکمل کیے اور جلسہ سالانہ پر آنے والوں کو راحت و آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ جلسہ پر پاکستان اور سندھ سے گئے ہوئے بہت سے احباب سے ملاقات کا موقع ملا۔ برادرم مولانا عبدالباسط صاحب اور مولانا منیر الدین احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ عزیزم رشید احمد جو مولانا عبدالباسط صاحب کا بڑا صاحبزادہ ہے

اس سے بھی ملنے کا موقع مل گیا۔ جلسہ کے بعد حضورؒ سے عزیزم رفیق احمد اور میری ملاقات ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ وہاں پر مکرم ومحترم چوہدری رشید احمد صاحب انجینئیر سوئی گیس اوران کی اہلیہ آپا ثریا جو کہ میری حیدرآباد تقرری کے وقت حیدرآباد تھے اور میرے ساتھ پرخلوص تعلق رکھتے تھے، سے بھی ملاقات ہوگئی۔ اس وقت تک جرمنی میں میرے تین بھانجے، تین بھانجیاں، دو بیٹے، دو بیٹیاں، میری اہلیہ کی دو بھانجیاں، ایک بھتیجی اور بعض دیگر عزیز مختلف جگہوں پر مقیم ہیں۔ جلسہ کے بعد ان کی طرف سے دعوتیں ملنا شروع ہوگئیں لیکن ان کو اہلیہ کی آمد تک مؤخر کیا۔ چنانچہ قریبا پندرہ دن بعد اہلیہ بھی اکیلی سفر کر کے جرمنی پہنچ گئیں۔ عزیزم بشیر احمد بھی جو پہلے مشرقی جرمنی والے حصہ میں تھا کیس منظور ہونے کے بعد رائن ہائم کے قریب ایک جگہ مکان لے کر رہائش پذیر تھا۔ چنانچہ کبھی رفیق کے ہاں اور کبھی بشیر کے ہاں چلے جاتے تھے۔ رہائش کے لحاظ سے رفیق احمد کے پاس بہتر انتظام تھا۔ اس لیے میں تو زیادہ تر رفیق احمد کے پاس ہی رہتا تھا۔ رفیق کے بالکل قریب عزیزہ امۃ القیوم کا گھر تھا جب جی چاہتا ان کے ہاں چلے جاتے۔ بہرحال بڑا آرام ملا اور پاکستان کی بہت سی کوفتیں اور کلفتیں بھول گئیں۔

جلسہ سالانہ 2001ء میں میری بھانجی عزیزہ اختر درانی نیشنل صدر لجنہ جرمنی تھی اور بہو اور بھانجی عزیزہ بشریٰ ریحانہ بھی نیشنل عاملہ لجنہ کی ممبر تھی۔ جلسہ میں نائب منتظمہ زنانہ جلسہ گاہ کے طور پر خدمت بجالا رہی تھی۔ جلسہ سالانہ میں حضورؒ کی تقریر سے قبل قرآن مجید کی تلاوت میری نواسی عزیزہ شاہدہ نسیم صبا بنت خالد حسین خادم صاحب نے کی تھی۔ میرے بیٹے عزیزم رفیق احمد، بشیر احمد اور داماد خالد حسین خادم تینوں ہی مختلف اہم ڈیوٹیوں پر متعین تھے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

جلسہ کے بعد جرمنی میں مختلف مقامات پر مقیم عزیزوں کی دعوتوں میں شرکت

شروع ہوگئی۔اتوار کو بالعموم رفیق احمد اور بشیر احمد فارغ ہوتے تھے اس لیے اتوار کے روز کسی نہ کسی عزیز کی دعوت پر جرمنی کے مختلف مقامات دیکھنے کا موقع مل جاتا۔جس طرف بھی جرمنی میں گئے ملک کی خوبصورتی، صفائی اور خوشنما مناظر ہی مناظر تھے۔ عزیزم محمد سلیم ضیاء کے پاس گئے اور تین دن قیام رہا۔ایک دن وہ سیر کی غرض سے اپنے گھر سے کچھ میل کے فاصلہ پر ایک پرفضا مقام پر لے گئے۔اردگرد سرسبز پہاڑ جن کی چوٹیوں پر چیل اور دیودار کے سربفلک سرسبز درخت۔اردگرد بہترین ہموار سڑکیں اور درمیان میں ایک خوبصورت وادی میں ایک بہت بڑا فوارہ پاس ہی ایک ہوٹل اور کچھ زرعی زمین میں ایک کسان ایک چھوٹے ٹریکٹر سے ہل چلا رہا تھا۔ہل چلانے والے کے ہاتھ میں ہل کا دستہ تھا۔ہل کے بلیڈ کے ساتھ انجن پیوستہ تھا جو بلیڈ کو کھینچ کر زمین پھاڑ رہا تھا۔عجیب نظارہ تھا۔بیلوں کی ضرورت نہیں تھی اور چلانے والے کو بھی پیدل چلنے کی مشقت کے علاوہ اور کوئی بوجھ نہیں تھا۔قریب ہی پہاڑ سے ایک چھوٹا سا نالہ جس میں قدرے پانی تھا، بہہ رہا تھا۔کچھ دیر قیام کے بعد وہاں سے واپس آنے کی ٹھانی۔لیکن ایسے نظارہ سے جو لطف آیا اس کا سرور آج بھی موجود ہے اور آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔اس کے علاوہ بعض اور عزیزوں کے ہاں بھی دو دو تین صد کلومیٹر کا سفر طے کر کے جانا ہوا۔سفر میں کوئی تھکاوٹ نہ ہوتی تھی۔سڑکیں اس قدر ہموار تھیں کہ گاڑیاں تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔چار چار رویہ سڑکیں۔ہر لین کی رفتار مقرر، سڑک کے کنارے کنارے خودکار کیمرے نصب۔اگر کوئی مقررہ رفتار سے زیادہ رفتار سے چلے تو کیمرہ میں اس کی تصویر محفوظ ہو کے اسے جرمانہ کی چٹ ادائیگی کے لیے اس کے گھر آجاتی تھی۔اگر کسی کی گاڑی راستہ میں خراب ہو جاتی تھی تو قریب ہی ٹیلیفون بوتھ تھے ان سے آپ مدد کے لیے کال کر سکتے تھے۔چند ہی منٹوں میں آپ کو دوسری گاڑی مل جاتی تھی جس سے آپ اپنا سفر جاری رکھ سکیں اور پہلی گاڑی

مرمت کے لیے ورکشاپ چلی جاتی۔مرمت ہونے پر آپ کو فون پر اطلاع کر دی جاتی کہ گاڑی ٹھیک ہوگئی ہے لے جائیں۔اگر کوئی ایکسیڈنٹ کر کے بھاگتا ہے تو اس کا جرم بہت زیادہ تصور کیا جاتا ہے۔اگر وہاں رک جاتا ہے تو اس کو کم قصوروار گردانا جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں قانون کی گرفت نہایت مضبوط ہے اور قانون نافذ کرنے والے افراد سوچ اور تصور سے بھی زیادہ ایماندار تجربہ میں آئیں گے۔دیانت داری کے اعلیٰ معیار بھی وہاں قائم ہیں۔الغرض جو کچھ اسلامی معاشرہ کی خصوصیات ہیں وہ سب وہاں عملاً موجود ہیں۔سڑکوں پر جا بجا بورڈ آویزاں ہیں جو سفر کے بارہ میں آپ کی ضروری رہنمائی کرتے ہیں۔مثلاً بورڈ لگا ہوگا کہ آپ کو پٹرول اتنی دور جا کر ملے گا یا واش روم اتنے فاصلے پر ہیں یا ہوٹل اور کھانے پینے کی اشیاء اتنے فاصلہ پر دستیاب ہیں۔جرمن قوم بنیادی طور پر مذہباً عیسائی تھی۔لیکن اب مذہبی رجحانات کم ہوگئے ہیں اور مادہ پرستی کی طرف زیادہ توجہ ہے۔جرمنی میں رشتوں کا تقدس اور اہمیت بھی ختم ہو گئی ہے۔ بلکہ سارے یورپ میں یہ وبا پھیل چکی ہے۔جس سے بوڑھے لوگ بے چارگی اور بے بسی کی زندگی بسر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس سفر جرمنی میں عزیزم رشید احمد ابن مولانا عبدالباسط صاحب شاہد مربی سلسلہ نے بھی میری اور اہلیہ کی دعوت کی اور نہایت خلوص اور محبت سے پیش آئے۔ الحمد للہ مولانا عبدالباسط صاحب کا گھرانہ بھی آباء واجداد سے خدمت دین میں مصروف ہے۔عزیزم رشید احمد کا بیٹا نبیل احمد بھی اب مربی سلسلہ بن چکا ہے اور اغلباً اس کا کہیں تقرر بھی ہو چکا ہے۔میرا پوتا انیق احمد بھی مربی بن چکا ہے۔الحمد للہ۔اسی طرح میرے بھانجے عزیز ظریف احمد قمر کا بیٹا بھی جامعہ احمدیہ انگلستان میں تکمیل تعلیم کے قریب ہے۔چھوٹے بھانجے عزیزم رفیع احمد کامران کا بیٹا بھی جرمنی میں جامعہ میں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔میرے بڑے بھانجے عزیزم محمد سلیم ضیاء کا پوتا بھی

جامعہ احمدیہ یو۔کے میں داخلہ لے چکا ہے اور پہلے سال میں اول آیا ہے۔

سلیم کی دعوت کے بعد عزیزہ مبارکہ طارق اور عزیزہ ساجدہ طاہر جو میری بیوی کی بھانجیاں ہیں اور میری بیٹی امۃ القیوم کی نندیں ہیں، کے ہاں بھی رائن ہائم سے کافی دور ملاقات اور دعوت کے لیے گئے۔ سب نے ہی بہت عزت اور خدمت اور محبت کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔ آمین

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ اہلیہ کو تین ماہ کا ویزہ ملا تھا اور میرے پندرہ دن بعد گئی تھیں اور میرا ویزہ دو ماہ کا تھا۔ چنانچہ میری واپسی کا وقت آ گیا اور میں 14 اکتوبر 2001ء کو واپس پاکستان آ گیا۔ واپسی پر اسی دن ہی مدرسۃ الظفر حاضری دے کر اصلاح وارشاد اندراجِ حاضری کے لیے چلا گیا اور اب پھر مدرسۃ الظفر، دارالقضاء اور انصاراللہ مرکزیہ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں شب و روز مصروف ہو گیا۔

محلّہ دارالرحمت غربی کا صدارتی انتخاب

میں محلّہ دارالرحمت غربی میں امام الصلوۃ تھا۔ واپس آیا تو 2001ء میں ہونے والے انتخاب کی منظوری آ چکی تھی۔ جس میں اس بار خلاف معمول نیا تجربہ کیا گیا۔ وہ یہ کہ کم ترین ووٹ لینے والے کو صدر محلّہ کا کام کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہمارے محلّہ میں صرف چار ووٹ لینے والے فرد کی بطور صدر محلّہ منظوری دی گئی۔ واپس آیا تو اہل محلّہ میں سے بعض کو سخت شاکی پایا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ مجھ تک بھی یہ بات پہنچ گئی۔ میں مربی محلّہ بھی تھا۔ میں نے جب احباب کو شاکی پایا تو عرض کیا کہ میں مرکز کا نمائندہ ہوں جس کی مرکز نے منظوری دی ہے میرا تعاون تو اس کے ساتھ ہوگا۔ پس میں نے تو تعاون جاری رکھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس ہوا کہ وہ شخص اس عہدہ کے حقوق وفرائض ادا کرنے کی بجائے اسے ذاتی تفاخر اور دنیاوی حکومتی عہدہ سمجھنے کی

غلطی کر رہا تھا جس سے کافی احباب کے ساتھ اس کے طرز سلوک اور طریق گفتگو نے اسے بے وقعت کر دیا۔ یوں اسے جماعتی طریق کار سے واقفیت بھی کم معلوم ہوتی تھی۔ مجلس عاملہ کے احباب سے اختلاف کرنا بھی اپنا وطیرہ بنالیا جس سے مجلس عاملہ کے اتحاد میں فرق آتا گیا۔

میں نے جب اس کی یہ روش دیکھی تو بطور مربی دارالرحمت وسطی میں تبادلہ کروا لیا۔ تاکہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں اگر مربی اور صدر کا اختلاف ہو تو دیگر لوگ اس سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ میرے متعلق بھی اس نے غیر پارلیمانی الفاظ کا استعمال کیا۔ آخر یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے مرکز تک چلا گیا۔ مجھے مرکز میں بلا کر صورتحال دریافت کی گئی۔ میں نے ایمانداری سے حقیقت حال عرض کر دی۔ چنانچہ مرکز نے معاملہ پر غور کرنے کے بعد اسے عہدہ سے فارغ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میرے نام قائمقام صدر محلّہ کا خط اس کو ارسال کر دیا۔ جو اس نے خود مجھے دیا۔ یہ بہت بڑا بوجھ تھا جو نہ چاہتے ہوئے مجھ پر ڈال دیا گیا اور اطاعت مرکز کی خاطر بجبر واکراہ یہ بوجھ اٹھانا ہی پڑا۔ بہت بڑا کام تھا مگر میرے ساتھ سیکرٹری اصلاح وارشاد مکرم شیخ محمد یونس مرحوم، سیکرٹری مال مکرم چوہدری ظفر اللہ خان صاحب اور محترم بشیر احمد سیفی صاحب سابق صدر محلّہ نے بھرپور تعاون کیا جس کے باعث میں اس چوبیس گھنٹے کی سروس سے کسی حد تک عہدا برآ ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ بعض اوقات آدھی رات کو بھی احباب آجاتے تھے کہ فلاں معاملہ میں سفارش کروانی ہے۔ فلاں معاملہ میں ابھی آپ سے رپورٹ کروا کر دفتر دینی ہے۔ ایک دفعہ نماز فجر کے بعد میں یہ اعلان کرنا بھول گیا کہ آج آٹھ بجے سے دوپہر تک بجلی بند رہے گی۔ گھر آکر یاد آیا تو اسی وقت سائیکل لیا اور سارے محلے میں خود اور بعض خدام کے ذریعہ اطلاع کروائی کہ آٹھ بجے بجلی بند ہو جائے گی کیونکہ غفلت سے کسی گھرانے کو تکلیف پہنچ جانے کا احتمال تھا۔

اسی دوران انتخاب عہدیداران آئندہ تین سال کے لیےعمل میں آ گئے اور بشیر احمد سیفی صاحب دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔منظوری آنے تک قریباً گیارہ ماہ تک اس فرض کی ادائیگی کے بعد اس سے سبکدوش ہوا۔ بہرحال بڑی سخت ڈیوٹی تھی۔اب محترم بشیر احمد سیفی صاحب کو یہ امانت تفویض کر دی گئی۔الحمدللہ

تعمیر (بیت الذکر) کے لیےقربانی کی توفیق

محلّہ دارالرحمت غربی کی (بیت الذکر) پرانی ہو چکی تھی اس کی تعمیر نو کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ مجلس عاملہ محلّہ کا عطیہ جات کے لیے اجلاس ہوا۔ مجھ پر اور میرے والد صاحب پر ایک ایسا وقت بھی آیا تھا کہ اسی (بیت الذکر) کی ابتدائی تعمیر کے لیے محلّہ کی تنظیم کی طرف سے والد صاحب کو بیس روپے چندہ تعمیر (بیت الذکر) دینے کے لیے خط تحریر کیا گیا لیکن والد صاحب اپنی تنگدستی کے باعث وہ بیس روپے پیش نہ کر سکے اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل اور جماعت کی برکت سے مجھے ایک لاکھ روپیہ تعمیر (بیت) کے لیے پیش کرنے کی توفیق ملی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ والد صاحب بیس روپے ادا نہ کر سکے تھے۔ چنانچہ والد صاحب کی طرف سے بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیس ہزار روپے تعمیر (بیت) کے لیے پیش کرنے کی توفیق ملی۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔

مدرسۃ الظفر میں ایک تبدیلی

2003ء میں مکرم ومحترم اسفندیار منیب صاحب جو کہ اس سے قبل جامعہ احمدیہ میں تدریسی خدمات بجا لا رہے تھے نیز ان کو مجلس خدام الاحمدیہ پاکستان میں بطور مہتمم اور نائب صدر بھی خدمت کی توفیق ملی، حضور انور کی طرف سے پرنسپل مدرسۃ الظفر مقرر فرما دیا گیا۔انہوں نے آتے ہی آہستہ آہستہ مدرسہ کی انتظامی اور تعلیمی حالت سنوارنا شروع

کر دی۔ چنانچہ پہلے تو دفتر مدرسہ کے لیے پہلے سے بہتر اور آرام دہ فرنیچر مہیا کیا گیا۔ پھر ایک متخصص صاحبِ حیثیت طالبعلم کے تعاون سے سٹاف روم میں نئے صوفے اور میز رکھوائے گئے جس سے سٹاف روم کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا اور بیٹھنے میں بھی آسانی ہوئی۔ علاوہ ازیں پہلے اساتذہ کی موجودگی میں پانچ مزید مربیان کرام جن میں سے دو متخصصین مکرم عبدالحق صاحب جو علم کلام کے متخصص تھے اور مکرم طاہر جمیل احمد بٹ صاحب جو علم حدیث میں تخصص کیے ہوئے تھے، ان کے علاوہ تین اچھی تعلیمی قابلیت رکھنے والے استاد مکرم طارق محمود طاہر صاحب مربی سلسلہ احمدیہ، مکرم شفیق احمد ججہ صاحب مربی سلسلہ احمدیہ اور مکرم شمیم احمد یحییٰ مربی سلسلہ کو بھی حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ کی منظوری سے سٹاف میں شامل کیا۔

نصاب تعلیم میں بھی گرانقدر اضافہ کیا گیا اور تعلیم کا دورانیہ بھی بڑھایا گیا۔ چنانچہ پہلے دو سال بعد امتحان لے کر طلباء کو فارغ کر دیا جاتا تھا اب یہ دورانیہ چار سال پر محیط ہو گیا جس سے مدرسہ کے طلباء میں جماعتوں کی نمائندگی کرنے اور ان کی عمدہ تربیت کرنے کی پہلے سے بہت بہتر استعداد پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

مدرسہ میں مختلف انتظامی شعبے بھی قائم کیے گئے مثلاً شعبہ امتحانات، اس کے قواعد وضوابط، نتیجہ کی تیاری وغیرہ ایک استاد کے سپرد کیا گیا۔ کھیلوں کا شعبہ بھی الگ طور پر قائم ہو کر اس کا سربراہ مقرر ہوا۔ اسی طرح بعض دیگر شعبہ جات بھی قائم کیے گئے۔ تحریر وتقریر کی مشق کے لیے بھی علیحدہ انتظام کیا گیا اور طلباء کو آخری امتحان پاس کرنے کے لیے بتائے گئے عنوان پر مقالہ لکھنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔

مدرسہ کی تقاریب کے لیے ویڈیوز بنانے کے لیے ویڈیو کیمرہ کی ضرورت تھی تو محترم پرنسپل صاحب نے مجھے ارشاد فرمایا کہ ویڈیو کیمرہ آپ مدرسہ کو مہیا کر دیں۔ چنانچہ خاکسار نے بطیبِ خاطر جرمنی سے بیس ہزار روپے کا ویڈیو کیمرہ منگوا کر تحفۃً

پیش کر دیا۔اسی طرح مدرسہ کی الگ لائبریری کا قیام بھی مقصود تھا تو مجھ سے اپنی ذاتی کتب کی لائبریری مدرسہ کو پیش کرنے کی خواہش کی گئی چنانچہ میں نے اپنی ساری کتب مدرسہ کی لائبریری کے لیے پیش کر دیں۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔اسی طرح دفتر کی منظوری سے ہر سال کتب خرید کر لائبریری میں اضافہ کیا جاتا رہا۔انتظام کے لیے باقاعدہ ہمہ وقتی لائبریرین کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔علاوہ ازیں جدید رجحانات کی روشنی میں طلباء کے لیے کمپیوٹر کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا اور محترم اسفند یار صاحب پرنسپل مدرسۃ الظفر نے ایک صاحب حیثیت مدرسہ کے استاد کے توسط سے تین چار کمپیوٹر بھی منگوا کر مدرسہ میں رکھے تا کہ ہمارے طلباء جدید رجحانات سے بھی آگاہ ہو سکیں۔بہر حال اب مدرسہ ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔طلباء کی تعداد بھی پچاس سے بڑھ کر ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہو گئی تھی۔محترم پرنسپل صاحب کے اپنے سارے سٹاف کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔مدرسہ کے اوقات میں وقفہ کے وقت سٹاف روم میں اکٹھے چائے پیتے اور مدرسہ اور طلباء کی بہتری کے لیے باہم تجاویز پر بھی غور کرتے۔اب سٹاف میں مندرجہ ذیل ممبران تھے۔

سٹاف مدرسۃ الظفر

۱۔پرنسپل مکرم اسفند یار منیب صاحب مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ
۲۔وائس پرنسپل مکرم مولانا رفیق احمد جاوید صاحب مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ
۳۔مکرم ومحترم جناب قاری محمد عاشق صاحب
۴۔مکرم چوہدری عبدالحق صاحب شاہد مربی سلسلہ احمدیہ
۵۔مکرم طاہر جمیل بٹ صاحب مربی سلسلہ احمدیہ
۶۔مکرم طارق محمود طاہر صاحب مربی سلسلہ احمدیہ

۷۔مکرم شفیق احمد بجہ صاحب مربی سلسلہ احمدیہ

۸۔مکرم شمیم احمد یحییٰ صاحب مربی سلسلہ احمدیہ

۹۔خاکسار حکیم نذیر احمد رہان شاہد مربی سلسلہ احمدیہ

۱۰۔مکرم مسعود احمد شاہد صاحب معلم وقف جدید

۱۱۔مکرم ملک وزیر خان ساجد صاحب معلم وقف جدید

۱۲۔مکرم عمران اسلم صاحب معلم وقف جدید

۱۳۔مکرم نداء الحبیب صاحب معلم وقف جدید

۱۴۔مکرم حافظ ناصر احمد صاحب معلم وقف جدید

۱۵۔مکرم حافظ طاہر احمد صاحب معلم وقف جدید

۱۶۔مکرم لقمان احمد شاد صاحب معلم وقف جدید۔لائبریرین مدرسۃ الظفر

۱۷۔مکرم آفاق احمد زاہد صاحب (کمپیوٹر کلرک)

۱۸۔مکرم عبدالقدوس تبسم صاحب (اکاؤنٹنٹ)

۱۹۔مکرم اعجاز احمد بلوچ صاحب (مددگار کارکن)

تمام سٹاف ممبران باہم متحد اور یکسوئی سے اپنے فرائض ادا کر رہے تھے اور مدرسۃ الظفر اکابرین سلسلہ کی نظر میں ایک وقیع ادارہ کا مقام حاصل کر چکا تھا۔تکمیل تعلیم کے بعد میدان عمل میں جانے والے معلمین کرام کے کام کے متعلق خوش کن رپورٹس ملنے لگیں۔خصوصاً نگر پارکر جیسے ریگستان میں ان کی قربانیوں کو بے حد سراہا گیا۔ادارے کے سالانہ اہم مواقع پر سلسلہ احمدیہ کے اکابرین تشریف لا کر طلباء کی حوصلہ افزائی کرتے اور بزرگانِ سلسلہ اکثر و بیشتر مواقع پر تشریف لاتے،صدر انجمن احمدیہ اور تحریک جدید انجمن احمدیہ کے ناظران اور وکلاء صاحبان کو جب بھی مدعو کیا گیا وہ ضرور تشریف لاتے۔فجزاھم اللہ احسن الجزاء

محترم اسفندیار منیب صاحب کے دور میں مدرسہ نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ یہ ترقی ہمہ جہت تھی۔ تعلیمی ، انتظامی و سخت کیشی کا طلباء کو عادی بنانا، مختلف علمی موضوعات پر تقاریر سنوانا اور کروانا، کھیلوں کی مختلف اقسام سے طلباء کے جسموں کو مضبوط کرنا، پہاڑی پیدل سفر کروانا وغیرہ سب پر عمل ہوتا تھا۔ لیکن کھیلوں میں سے ایک کھیل بہت ہی دلچسپ ہوتا تھا جسے روک دوڑ کہا جاتا ہے اس کی تو شان ہی نرالی تھی۔ اسے دیکھ کر بہت مزہ آتا تھا۔ طلباء بے خوف وخطر کھیل کے مختلف ایونٹس میں سے گزر رہے ہیں۔ آخر میں پانی میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ پانی میلا ہوتا ہے۔ طالب علم کا سارا جسم کیچڑ سے لت پت ہو جاتا ہے اور اس کی عجیب وغریب شکل ہو جاتی ہے۔ جسے دیکھ کر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال طلباء اس ساری صورتحال سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور ناظرین کی خوشی کا موجب بننے کے علاوہ اس پر مشقت کھیل سے ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں۔

اب تک تو طلباء کی تعلیم کے لیے دفتر وقف جدید کی عمارت کی بالائی منزل پر انتظام تھا۔ اور ہوسٹل کا انتظام محلّہ دارالصدر میں وقف جدید کی خرید کردہ بعض عمارات میں تھا۔ لیکن اب مدرسہ اور ہوسٹل کے یکجا ہونے اور آبادی سے الگ ماحول میں عمارت مدرسہ کی تعمیر کی ضرورت محسوس کی گئی تو محلّہ دارالعلوم سے آگے یونیورسٹی روڈ سے ملحق وقف جدید کی خرید کردہ تقریباً نو ایکڑ اراضی میں حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی منظوری سے مدرسہ کی خوبصورت عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ نقشہ تو پہلے سے بنا ہوا تھا لیکن عمارت کو جدید ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اور بہتر سے بہتر بنانے کے لیے محترم اسفندیار صاحب نے نقشہ بنانے والے انجینئر سے لاہور جا کر بھی ملاقاتیں کیں جس سے عمارت کی خوبصورتی اور مدرسہ کی ضروریات دونوں مقاصد عمدگی سے پورے ہو سکتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ کی عمارت کی بنیاد رکھ دی گئی اور

اللہ تعالیٰ نے دیگر اساتذہ کے ساتھ اس عاجز کو بھی بنیاد میں اینٹ رکھنے کی توفیق دی۔ لیکن عمارت کے افتتاح سے پہلے مکرم اسفند یار صاحب کا مدرسہ سے تبادلہ ہو گیا اور حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دوست محمد شاہد صاحب مؤرخ احمدیت کی وفات کے باعث شعبہ تاریخ احمدیت کا سربراہ مقرر فرما دیا۔ یوں مدرسہ اور مدرسہ کا سٹاف ایک بہترین منتظم اور بہترین دوست اور بہترین عالم دین کی صلاحیتوں سے استفادہ سے محروم ہو گیا۔ اگر چہ عندالضرورت وہ مدرسہ کے طلبہ اور عملہ کو اپنے تعاون اور رہنمائی سے کبھی بھی محروم نہیں کریں گے لیکن اب ہمہ وقتی سہولت تو نہیں ہو گی۔

مکرم اسفند یار منیب صاحب 2010ء میں بطور سربراہ شعبہ تاریخ احمدیت مدرسہ سے تشریف لے گئے۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مکرم مولانا رفیق احمد جاوید صاحب مربی سلسلہ احمدیہ بطور قائمقام پرنسپل انتظام مدرسہ چلاتے رہے تا آنکہ 2012ء میں مکرم محمد اقبال عابد صاحب مربی سلسلہ بطور پرنسپل مدرسۃ الظفر تشریف لے آئے۔ مدرسۃ الظفر کی نئی عمارت کی تعمیر 27 دسمبر 2008ء کو شروع ہوئی اور اس کی تکمیل ستمبر 2013ء میں ہوئی اور 29 ستمبر 2013ء کو محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب ناظر اعلیٰ و امیر مقامی نے حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی نمائندگی میں مدرسہ کی نئی عمارت کا افتتاح فرمایا۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک مدرسہ کی نئی عمارت میں تعلیم و تدریس جاری ہے۔ خاکسار کو 1999ء سے لے کر 2015ء تک مدرسہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دینے کی توفیق ملی ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اس لمبے تدریسی عرصہ میں خدا تعالیٰ کے فضل سے مدرسہ کے کسی فرد خواہ استاد ہو یا طالبعلم، سے کسی بھی قسم کی بدمزگی نہیں ہوئی۔ بلکہ تمام اساتذہ اور طلباء سے محبت و شفقت کا سلوک قائم رہا ہے اور اساتذہ سے تو اب تک یہ تعلق جاری ہے۔ سٹاف میں اس وقت سات اساتذہ خاکسار کے شاگرد ہیں۔

ربوہ میں خدمت انسانیت میں مصروف جماعتی ہسپتال

گذشتہ صفحات میں 1997ء میں جرمنی جانے کا ذکر آچکا ہے اور وہاں کے ڈاکٹر سے ملاقات کا بھی ذکر آ چکا ہے کہ کس طرح وہ وقت مقررہ پر انتظار گاہ میں اپنے کمرے سے باہر خود مجھے لینے آیا پھر بڑی عمدگی سے معائنہ اور مشورہ کے بعد مجھے رخصت کیا تو مجھے پاکستان کے ڈاکٹر یاد آ گئے اور اس یاد نے مجھے احمدیت کے بے پایاں احسانات بھی یاد کرا دیے جن کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کو دل بے قرار ہو گیا۔ پاکستان بننے کے بعد جماعت کے شیرازہ کو مجتمع کرنے کے لیے مرکز ربوہ کی بنیاد رکھی گئی۔ قادیان کے اداروں کا یہاں حسبِ استعداد جماعت قیام عمل میں آنے لگا۔ نور ہسپتال جو قادیان میں انسانیت کی خدمت میں سرگرم عمل تھا اس کا بھی قیام عمل میں آیا جو دو کچے کمروں پر مشتمل تھا جس میں مکرم صاحبزادہ مرزا منور احمد صاحب، ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب، ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور بزرگ ڈاکٹر حضرت ڈاکٹر حشمت اللہ صاحب خدمات انجام دے رہے تھے۔ ایک کمرے میں ڈاکٹر مریضوں کا معائنہ کرتے تھے تو دوسرے کمرے میں مکرم لطف الرحمٰن انور صاحب، مکرم رانا کرامت اللہ صاحب اور بعض دیگر کارکن مریضوں کو تجویز شدہ نسخہ کے مطابق ادویہ دیتے تھے۔ علاقہ کے لوگوں کا آہستہ آہستہ رجوع بڑھنے لگا۔ مرکز میں احمدی آبادی بھی بڑھنے لگی۔ ہسپتال کی ضروریات میں بھی وسعت آنی شروع ہوئی تو موجودہ جگہ نیا ہسپتال تعمیر ہوا جس کا نام فضل عمر ہسپتال رکھا گیا۔ جو بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اپنی موجودہ وسعت تک پہنچ گیا۔ اگرچہ ابتداءً وسائل کی کمی کے باعث مریض ڈاکٹر کے نسخہ کے مطابق بھی ادویہ کے حصول کے لیے اگلے دن تک منتظر رہتے تھے۔ کیونکہ ادویہ کا بجٹ روزانہ کی بنیاد پر مقرر تھا جو جلد ختم ہو جاتا تھا۔

میں خود بھی بلڈ پریشر کا دیرینہ مریض تھا۔ ربوہ آنے کے بعد ہسپتال سے مستقل رابطہ رہتا۔ اغلباً 2005 یا 2006ء کی بات ہے مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ راولپنڈی سے ایک ڈاکٹر آتے ہیں جو ماہر امراضِ قلب ہیں، ان کو دکھایا جائے۔ چنانچہ مکرم ڈاکٹر صاحب کی آمد کی اطلاع پر پرچی روم سے پرچی بنوا کر دکھانے گیا اور ڈاکٹر صاحب کے نامِ نامی سے اطلاع ہوئی کہ آپ ڈاکٹر محمد مسعود الحسن نوری صاحب ہیں اور پاکستان آرمی میں جرنیل ہیں۔ اپنی باری پر جیسے ہی میں کمرے میں گیا، محترم ڈاکٹر صاحب نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ کرسی پر بٹھایا اور معائنہ کر کے نسخہ لکھ دیا۔ فراغت پر بھی اسی طرح کھڑے ہو کر ملے اور رخصت کیا۔

میں ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ لمحہ بھر کے لیے سوچا کیا میں اس وقت جرمنی میں ہوں؟ پھر خود ہی ہوش کے ناخن لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے اعلیٰ ترین اخلاق سے قلب کی گہرائیوں تک متاثر ہو کر دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا واپس آیا۔ پاکستان میں بعض اور ماہرین امراض قلب سے ملا ہوں۔ کسی میں بھی مریض کے ساتھ یہ احترام اور شفقت پر مبنی سلوک دیکھنے میں نہیں آیا۔ محترم نوری صاحب کچھ عرصہ بعد فوج سے ریٹائر ہونے والے تھے۔ دوسری طرف حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ربوہ میں امراض قلب کے علاج کے لیے بہت بڑا ہسپتال بنانے کا منصوبہ جماعت کو دیا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے طاہر ہارٹ کے نام سے کئی منزلوں پر مشتمل ایک عظیم الشان عمارت بطور ہسپتال امراض قلب تیار ہو گئی جس میں جملہ امراض قلب کا علاج ہو رہا ہے۔ اور باہر کے ہسپتالوں سے علاج کے اخراجات خود غیر از جماعت مریض تسلیم کرتے ہیں کہ بہت کم ہیں۔

ہسپتال جماعت کی نگرانی میں کام کر رہا ہے مگر اس کے انتظامی سربراہِ اعلیٰ مکرم ڈاکٹر محمد مسعود الحسن نوری ہیں۔ جن کے اخلاق عالیہ کا ایک اور واقعہ تحریر کرتا

ہوں۔2009ء میں میری انجیوگرافی اور بعد ازاں انجیو پلاسٹی تجویز ہوئی۔ چنانچہ بخیریت تمام اس عمل سے گزر گیا۔ ہدایت تھی کہ آٹھ دن بعد ڈاکٹر صاحب کو دوبارہ دکھانا ہے۔ میں ہسپتال گیا اور مکرم ڈاکٹر انوارالدین صاحب ماہر امراض قلب سے ادویہ لے کر آ گیا۔ اگلے روز گھر پر ڈاکٹر نوری صاحب کا فون آیا کہ کل آپ نے معائنہ کرانا تھا، کیوں نہیں آئے؟ عرض کیا کہ محترم انوارالدین صاحب سے معائنہ کروا کر ادویہ لے لی ہیں اور ہر وہ مریض جو آپ کے علاج کے بعد ہسپتال سے فارغ ہوتا اسے ہفتہ یا پندرہ روز بعد اس کے گھر فون کر کے اس کی خیریت معلوم کرتے اور نہ آنے کی وجہ پوچھتے کہ معائنہ کیوں نہیں کرایا۔ پاکستان میں ایسے ڈاکٹروں کا وجود ایک عظیم الشان نعمت سے کم نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور صحت میں بہت برکت دے۔آپ کے ایک صاحبزادے خالد حسن نوری صاحب امریکہ سے ربوہ آ کر امراض قلب کے مریضوں کا آپریشن کرتے ہیں۔ بہرحال جماعت کے اعلیٰ ترین اخلاق کے حامل ڈاکٹر صاحبان ہمہ وقت مریضوں کے علاج میں مصروف ہیں اور جماعت سے مخاصمت رکھنے والے احباب بھی عندالضرورت امراض قلب کے علاج سے استفادہ کے لیے بے دھڑک چلے آتے ہیں۔ہسپتال کے جملہ امور پر روشنی ڈالنا تو میرے بس کی بات نہیں۔کوئی ڈاکٹر یا متعلقہ ماہر دوست ہی تفصیل بیان کر سکتا ہے۔ میں چونکہ پرانا واقف حال ہوں اس لیے جماعت کی ترقی اور انسانیت کی خدمت کی اس روشن مثال کو اختصار سے قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔

علاوہ ازیں بانی خاندان نے نظام جماعت کی اجازت سے طاہر ہارٹ کی بلڈنگ کے ساتھ ہی زچہ بچہ کے علاج معالجہ کے لیے ایک مکمل ونگ زبیدہ بانی کے نام سے بنوا کر جماعت کے حوالہ کیا۔ جس میں جملہ امراض نسواں کا علاج ہوتا ہے اور علاقہ کی مستورات کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔(بانی خاندان سے مراد شیخ محمد

صدیق صاحب بانی ساکن چنیوٹ کا خاندان ہے جنہوں نے (بیت) اقصیٰ ربوہ کی تعمیر کے جملہ مصارف ادا کیے تھے۔ اور محترمہ زبیدہ صاحبہ شیخ محمد صدیق صاحب بانی کی اہلیہ محترمہ تھیں)

تیسرا سفر جرمنی

میرے بیٹے نے سپانسر لیٹر ارسال کر دیا۔ خاکسار کو دو ماہ کے لیے ویزہ مل گیا۔ چنانچہ 10 جولائی 2007ء سے 9 ستمبر 2007ء تک جرمنی کا سفر کرنے کی توفیق ملی۔ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ انہی دنوں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی جرمنی تشریف لائے ہوئے تھے۔ میرے بیٹے رفیق احمد کی بمع فیملی ملاقات کی اجازت مل گئی اور خاکسار کو بھی اس فیملی ملاقات میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز سے خلیفہ بننے کے بعد یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بیت السبوح ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ بہت سے احباب مرد و زن ملاقات سے فیض پانے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ کئی سال بعد خلیفۃ المسیح کی اقتداء میں نماز کی ادائیگی کی توفیق ملی۔ میں پچھلی صفوں میں بیٹھا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ مکرم مسعود احمد صاحب دہلوی سابق ایڈیٹر الفضل بھی (بیت الذکر) میں موجود تھے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اگلی صف میں لے گئے اور کہا کہ پیچھے پیچھے کیوں رہ رہے ہیں۔ اسی دوران مولانا عبدالباسط صاحب مربی سلسلہ احمدیہ جو میرے مدرسہ احمدیہ سے کلاس فیلو بھی تھے اور جگری یار بھی وہ بھی وہاں مل گئے جس سے بے حد خوشی ہوئی۔

نماز کے بعد اپنی باری پر کمرہ ملاقات کے لیے بیٹے، بہو، دو پوتوں اور دو پوتیوں کے ساتھ آگے آگے کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹے کا نام رفیق احمد ہے۔ حضور نے فوراً

مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا آپ کا نام رفیق احمد تو نہیں۔ عرض کیا جی حضور رفیق احمد میرا بیٹا ہے اور یہ ہمراہ ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ میں نے اٹھنا چاہا۔ حضور نے فرمایا بیٹھیں کیا جلدی ہے۔ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں مَیں نے عرض کیا حضور میری یہ الیس اللہ کی انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈال کر مس کر دیں۔ حضور نے میری وہ انگوٹھی جس کا نگینہ عقیق کا ہے اور اس پر الیس اللہ بکاف عبدہٗ کندہ ہے، کو ازراہِ کرم اپنی انگلی میں پہن کر مس کیا اور پھر ہاتھ کو الٹا کر کے اپنے پاس سے ایک انگوٹھی ساتھ ملا کر فرمایا۔ لو آپ کی انگوٹھی نے بچہ بھی دے دیا۔ چنانچہ آج تک وہ الیس اللہ کی انگوٹھی میرے ہاتھ کی زینت ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ ملاقات کے آخر پر اپنے ساتھ تصویر بنانے کا شرف بھی ہمیں بخشا۔ یہ تصویر عزیزم رفیق احمد کے پاس جرمنی میں محفوظ ہے۔ اس ملاقات سے اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ بار بار سوچتا تھا کہ کہاں میں غریب و بے کس و بے بس کہاں خلیفۂ وقت سے ملاقات اور پھر ان کا انگوٹھی عطا کرنا اور تصویر بنوانا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ ملاقات کے بعد سارے افراد خوشی خوشی گھر آئے۔ الحمدللہ کہ اب میرے پاس حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے ہاتھ کی مس شدہ انگوٹھی کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ کے ہاتھ سے مس شدہ دو انگوٹھیاں میری عظیم دولت ہیں۔ اللہ تعالیٰ زندگی بھر مجھے اور میرے بعد میری اولاد در اولاد کو خلافت سے وابستہ رکھے اور دین کی خدمت کی توفیق دیتا چلا جائے۔ آمین

2007ء میں میرے جانے پر رفیق احمد نے جرمنی میں اپنے مکان کی تعمیر شروع کی جس کے لیے رائن ہائم شہر کی انتظامیہ سے زمین حاصل کی گئی اور دو ماہ میں نچلی منزل کی چھت تکمیل کے مراحل میں تھی۔

علاوہ ازیں عزیزم خالد حسین خادم کی تحریک پر انہی دنوں ہالینڈ کی جماعت کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا، اس میں بھی شمولیت اختیار کر لی اور وہاں پر بھی حضور کی زیارت

سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہوا۔مزید برآں میرے مدرسہ احمدیہ کے کلاس فیلو برادرم عبدالحکیم اکمل صاحب جو ہالینڈ میں (مربی) رہ چکے تھے اور اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، ان کے بیٹوں سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔اکمل صاحب کی فیملی ہالینڈ میں ہی بس گئی ہے۔آپ کے بیٹے بڑی مسرت اور بشاشت سے ملے اور میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

نیز برادرم عبدالحمید صاحب مرحوم ساکن محراب پور ضلع نوابشاہ کے دو بیٹوں سے بھی ملاقات ہوگئی وہ بھی ہالینڈ میں بس گئے ہیں۔نن سپیٹ کی (بیت الذکر) بھی دیکھی۔برادرم فضل کریم صاحب جو کہ میرے سمدھی ہیں، کے دو بیٹے عزیزم سعید احمد صاحب اور فرید احمد صاحب سے بھی ملنے کا موقع مل گیا۔اسی طرح مکرم ومحترم امیر صاحب ہالینڈ اور مربی سلسلہ مکرم ومحترم حامد کریم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔

ہالینڈ سے واپسی پر کچھ دیر شیخ طاہر احمد صاحب جو کہ عزیزم خالد حسین خادم صاحب کے بہنوئی ہیں، کے پاس رات قیام کیا اور وہاں سے اگلے روز واپس رائن ہائم آ گئے۔رائن ہائم میں عزیزم رفیق احمد اور عزیزم خالد حسین خادم جو کہ میرا داماد ہے ،ان کے گھر بالکل قریب قریب ہیں اور دونوں خاندانوں کا آپس میں بھی بہت پیار اور بہت محبت کا تعلق ہے جسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

اب بشیر احمد رہان میرا چھوٹا بیٹا بھی اسی شہر میں آ چکا ہے لیکن ان دونوں گھرانوں سے اس کا مکان کچھ فاصلہ پر ہے۔سب کے پاس اپنی گاڑیاں ہیں۔آنے جانے کے لیے کسی قسم کی دقت نہیں۔عزیزم بشیر احمد کے پاس جماعتی عہدہ بھی ہے۔ اس وقت عہدہ تو یاد نہیں البتہ اس کے ساتھ دو تین جماعتوں کا تربیتی دورہ کرنے کی توفیق ملی۔ایک جگہ خطبہ جمعہ بھی دیا۔رائن ہائم میں بھی بعض اوقات خطبات جمعہ دینے کا موقع ملا۔الحمدللہ علیٰ ذالک

جرمنی میں اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور دیگر تمام عزیزوں کو خدمت دین میں منہمک پا کر بے حد مسرت ہوئی۔ ہنسی خوشی وقت گزر رہا تھا کہ پاکستان سے اطلاع ملی کہ اہلیہ صاحبہ کی طبیعت بڑی خراب ہے اور وہ فضل عمر ہسپتال میں داخل ہیں اور چونکہ اہلیہ کو ہیپا ٹائٹس والے وارڈ میں رکھا گیا اس لیے ساتھ ہی عزیزوں میں یہ بات بھی پھیلنے لگی کہ مریضہ کو ہیپا ٹائٹس ہی ہے جس سے بہت فکر دامن گیر ہوئی۔ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں خاکسار اور چھوٹی بیٹی سلمٰی کلیم نے بار بار دعا کے لیے لکھا۔ اب چند یوم بعد کوئی جماعتی فنکشن تھا اس میں شمولیت کے بغیر واپس بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔ بہر حال متواتر حضور کی خدمت میں خطوط لکھے اور پھر مقررہ وقت پر ہی واپس آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اہلیہ کو ہیپا ٹائٹس نہیں تھا۔ میرے آتے ہی اہلیہ ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر آ گئیں۔ الحمد للہ۔ اور گھر میں ہنسی خوشی وقت بسر ہونے لگا۔ جرمنی سے 9 ستمبر 2007ء کو واپس ربوہ آ گیا۔ مدرسۃ الظفر کی ڈیوٹی بھی پھر سے شروع ہو گئی جو سفر جرمنی کے باعث معطل تھی۔ علاوہ ازیں دارالقضاء کی مصروفیت کا بھی اجراء ہو گیا۔ اپنے محلّہ میں بھی درس و تدریس کے فرائض کی ادائیگی کی توفیق ملی۔

چوتھا سفر جرمنی

گزرتے ایام کے ساتھ زندگی کی مصروفیات بھی بدلتی رہیں تا آنکہ عزیزم رفیق احمد رہان نے اپنی بیٹی عمرانہ بسالت کی شادی کا پروگرام بنا لیا اور اس پر بڑا اصرار کیا کہ ابا امی دونوں ضرور اس شادی میں شریک ہوں اور سپانسر لیٹر بھیج دیا۔ چنانچہ ویزہ کے لیے ضروری سفری دستاویزات تیار کروائیں۔ جرمنی کے سفارت خانے سے تاریخ اور وقت حاصل کر کے عزیزم مسعود احمد کے ہاں چلے گئے۔ پاکستان میں اب دہشتگردی کے واقعات رونما ہو رہے تھے اس لیے سفارتخانوں کی حفاظت کے لیے بھی

مختلف انتظام کیے گئے تھے جن سے گزرنے کے بعد جرمن سفارتخانے گئے۔ کاغذات جمع کروائے تو حکم ہوا کہ فلاں لیبارٹری سے آپ میاں بیوی اپنے سارے طبی معائنے کروائیں اوراس کی رپورٹ لائیں۔ چنانچہ ایک ہفتہ مجھے اوراہلیہ کومسعوداحمد کے ہاں اسلام آباد میں قیام کرنا پڑا۔ رمضان کے دن تھے۔ بیس ہزارروپے ٹیسٹوں پرخرچ ہو گئے۔ نتائج لے کر سفارتخانہ گئے۔ کاغذات اورفیس تو پہلے ہی جمع تھی۔ کہا گیا کہ آپ جائیں پاسپورٹ آپ کو بذریعہ ڈاک مل جائیں گے۔ چنانچہ اگلے روز اسلام آباد سے واپس آئے۔ سرگودھا سے بس لالیاں کے قریب پہنچی تھی کہ ربوہ سے عزیزم عمران اسلم صاحب استاد مدرسۃ الظفر کا فون ملا کہ برادرم سیٹھ محمد یوسف صاحب امیر ضلع نوابشاہ کو راہِ مولا میں قربان کر دیا گیا ہے۔ یوسف صاحب کے ساتھ بیس سال سے زائد عرصہ گزرا تھا۔ جبکہ میں نوابشاہ ضلع میں مربی تھا۔ ایک دم دل کو بڑا دھچکا لگا۔ اہلیہ کو بھی خبر سنائی۔ بہت پریشانی ہوئی۔ بہرحال انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا اور کیا چارہ ہوسکتا تھا۔ دو روز بعد تعزیت کے لیے نوابشاہ روانہ ہوا۔ بچوں سے تعزیت کے بعد باندھی آ گیا تو فون پر اطلاع ملی کہ ایک ماہ کا ویزہ مل گیا۔

باندھی سے واپس ربوہ آیا۔ اب زوروشور سے سفر جرمنی کی تیاری شروع ہوگئی۔ کیونکہ اب تو شادی پر جارہے تھے اور وہ بھی پوتی کی شادی پر۔ بہرحال بساط بھر تمام عزیزوں اورشادی والے گھر کے افراد کے لیے تحائف لیے۔ قطر ایئر لائن سے سیٹ بک کروائی اور دو اکتوبر 2008ء کو فرنکفرٹ ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ سیالکوٹ سے ایک غیراز جماعت جوڑا بھی اپنے بیٹے اور بہو کو ملنے کے لیے ہمسفر تھے۔ انہوں نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہمارے پاس شادی کے باعث سامان زیادہ تھا۔ دوحا میں جہاز تبدیل کرنا تھا اور جہاز پر بھی سیڑھی کے ذریعہ سوار ہونا تھا جس پر ہاتھ کا سامان لے کر سوار ہونا مشکل ہورہا تھا۔ انہوں نے اس بارہ میں میری مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر

عطا فرمائے۔ آمین۔ ایئر پورٹ پر رفیق احمد، بشریٰ ریحانہ اور بشیر احمد پہنچ گئے۔ خیریت سے گھر پہنچ کر آرام کیا۔ آج عزیزم رفیق احمد کے نئے تعمیر شدہ ذاتی مکان میں رہائش رکھی۔ اگرچہ مکان کی جرمنی کے لحاظ سے زیبائش و آرائش ابھی باقی تھی۔ لیکن اب کرایہ کا تونہیں اللہ تعالیٰ نے ذاتی مکان عطا کر دیا ہے۔ ذاتی مکان دنیا میں بہت بڑی نعمت شمار ہوتا ہے۔ سوالحمدللہ اللہ تعالیٰ نے عزیزم رفیق احمد کو عطا کر دیا۔

اب کبھی امۃ القیوم اور عزیزم خالد حسین خادم کے ہاں، کبھی عزیزم بشیر احمد کے ہاں اور کبھی مختلف عزیزوں سے ملاقات میں وقت گزرنے لگا۔ ایک دن جمعہ کا روز تھا تو عزیزم بشیر احمد نے امام شمشاد احمد صاحب قمر صاحب سے میرا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کو کہیں کہ جمعہ کا خطبہ دیں۔ اس کے بعد نومبائعین کی ایک تربیتی کلاس ہے اس میں ان کے سوالات کے جوابات دیں۔ ترجمان کی معاونت انہیں حاصل ہوگی۔ چنانچہ جمعہ کا خطبہ بھی دیا اور جمعہ کے بعد قریباً دو گھنٹہ کی مجلس وسوال و جواب میں مختلف سوالات کے جوابات بھی دیے۔ اسی طرح بشیر احمد کو اپنے عہدہ کے لحاظ سے اپنے حلقہ کی ایک اور مجلس کا بھی اگلے جمعہ دورہ کرنا تھا۔ چنانچہ وہ وہاں بھی ساتھ لے گئے اور وہاں بھی خاکسار نے خطبہ جمعہ دیا۔

جلسہ ہالینڈ میں شمولیت

انہی ایام میں، معین تاریخیں تو مجھے یاد نہیں ہالینڈ کی جماعت ہائے احمدیہ کا نن سپیٹ (بیت الذکر) میں سالانہ جلسہ تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بھی جلسہ سے خطاب فرمانے والے تھے۔ عزیزم خالد حسین خادم، امۃ القیوم اور بعض اور احباب بھی جلسہ میں شمولیت کے لیے تیار ہو گئے۔ خاکسار اور اہلیہ بھی ان کے ساتھ چل پڑے۔ چنانچہ ہالینڈ پہنچ کر نماز ظہر کے وقت میں اور خالد

حسین خادم نماز ظہر وعصر سے قبل (بیت الذکر) کی اگلی صف میں امام سے کچھ فاصلہ پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نماز کے لیے تشریف لائے جس سے حضور کی بخوبی زیارت ہوگئی۔ نمازوں کے بعد جلسہ میں شریک ہوئے، خطابات سنے۔ شام کو ہالینڈ کے ساحل سمندر کی ایک جگہ سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ ہمارے دائیں طرف ایک بہت بلند مٹی کا بند تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مضبوط پختہ سڑک تھی۔ بند پر چڑھ کر دوسری طرف سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ بند اور قریب کی پختہ سڑک اہل ہالینڈ کے بلند عزم اور جواں ہمتی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سمندر کو مٹی اور پتھروں سے پُر کر کے تیس میل لمبی مضبوط پختہ سڑک تیار کی ہے۔ وہاں ایک جگہ ایک پل ہے۔ پل کے دائیں بائیں سمندر کا پانی ہے اور پل پر ایک مزدور کا پتھر کا مجسمہ تیار کر کے اغلباً وہاں لکھا ہے آدمی اور پانی کی جنگ اور مزدور جھک کر پتھر اٹھا رہا ہے۔ بائیں طرف سمندر میں ایک عمارت تعمیر ہے جس میں سمندر کے پانی کے اندر ہوٹل بنایا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ڈچ قوم کی علو ہمت اور عظیم الشان محنت کا شاہکار ہے۔ اس سیر کے بعد واپس جرمنی کے بارڈر پر ایک عزیز کے مکان پر رات بسر کی اور اگلے روز عزیزہ ساجدہ کے ہاں سے ہوتے ہوئے واپس رائن ہائم آ گئے۔

(بیتِ) خدیجہ برلن کا افتتاح

برلن ہماری رہائش کے شہر رائن ہائم سے قریباً سات سو کلومیٹر تھا۔ عزیزم بشیر احمد شاہد میرے چھوٹے بیٹے نے ہمیں (بیت الذکر) کے افتتاح میں شمولیت کے لیے لے جانے کی حامی بھر لی۔ چنانچہ افتتاح سے ایک روز قبل میں اور اہلیہ عزیزم بشیر احمد کے ساتھ روانہ ہوئے۔ بشیر احمد کے برلن سے کچھ فاصلہ پر ایک دوست تھے۔ ان کو فون کر دیا کہ ہم رات آپ کے پاس قیام کریں گے۔ چنانچہ رات گئے ان دوست

کے ہاں پہنچ گئے۔ رات آرام سے بسر کی اور اگلے دن بشیر احمد ہی کی گاڑی میں برلن روانہ ہوئے۔ جرمنی کے بہت سے علاقہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جو نہایت سرسبز، خوبصورت اور جا بجا ہوا سے بننے والی بجلی کے کھمبے دور دور تک نظر آتے تھے۔ آخر جمعہ سے تھوڑی دیر قبل (بیتِ) خدیجہ پہنچ گئے۔ نماز جمعہ میں شریک ہوئے۔ اس طرح اس تاریخی موقع پر شمولیت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

دوسرے حضور سے ملاقات کی درخواست کی تھی وہ بھی منظور ہوگئی۔ اور انتظار گاہ میں کئی مربیان سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ان میں مکرم آغا یحییٰ خان صاحب مربی سویڈن بھی تھے جو سویڈن جانے سے قبل کچھ عرصہ مدرسۃ الظفر وقف جدید میں تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے اور ہم باہم مدرسہ میں اکٹھے تھے۔ جیسے ہی خاکسار اور اہلیہ حضور ایدہ اللہ کے ملاقات کے کمرے میں داخل ہوئے، حضور نے فرمایا آپ کو ہالینڈ (بیت الذکر) میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ وہاں کیا کر رہے تھے۔ عرض کیا حضور کی زیارت کے لیے گیا تھا اور ہالینڈ کے جلسہ سالانہ میں شمولیت بھی مقصود تھی۔ پھر خاکسار نے اہلیہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ حضور کی دعاؤں سے یہ بچ گئی ہے۔ گزشتہ سال میں جب جرمنی آیا تھا تو یہ بہت بیمار ہوگئی تھی۔ حضور کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی ہے اور اب تو سمندر کے کنارے ہالینڈ کا بہت بڑا بند ہے اس پر چڑھ کر اگلی طرف سمندر کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔

حضور نے فرمایا جہاں سمندر کے کنارے مچھلی فرائی بیچتے ہیں وہاں بھی گئے تھے اور مچھلی کھائی تھی۔ عرض کیا حضور اس طرف نہیں جا سکے۔ پھر اغلباً حضور نے دریافت فرمایا کہ کہاں سے آئے ہیں تو عرض کیا کہ فرنکفرٹ کے پاس سے۔ اسی طرح میں نے عرض کیا ابھی تو بیلجیئم بھی حضور کے ہمراہ جانا ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا آپ بہت دور سے آئے ہیں۔ بیلجیئم میں تو سولہ سترہ آدمی ہیں وہاں میں نے پندرہ بیس منٹ

ٹھہرنا ہے۔ آپ آہستہ آہستہ واپس جائیں۔ آپ کا سفر بہت لمبا ہے۔ حضور نے ہمارے ساتھ تصویر بھی بنوائی۔ لیکن وہ تصویر مجھ تک پہنچ نہیں پائی۔ چنانچہ رات کو ہی واپس روانگی ہوئی اور صبح پانچ بجے کے قریب ہم رائن ہائم رفیق احمد کے مکان پر بخیریت تمام پہنچ گئے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

(بیتِ) خدیجہ برلن کے افتتاح کے بعد جرمنی میں اب سب سے بڑی مصروفیت عزیزہ عمرانہ بسالت بنت رفیق احمد کی شادی کا موقع تھا۔ چنانچہ اغلباً 24 یا 25 اکتوبر کو شادی ہال بک کروایا گیا۔ انگلینڈ، جرمنی اور ہالینڈ سے بہت سے عزیز شادی میں معین تاریخ میں شمولیت کے لیے پہنچ گئے اور شادی بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔ اب جرمنی واپسی میں صرف تین دن باقی تھے۔ سب عزیزوں سے ملاقات کے بعد اغلباً 29 اکتوبر 2008 کو قطر ایئر ویز کی فلائٹ سے واپس روانگی ہوئی۔ اور الحمد للہ 30 اکتوبر 2008 کو بخیریت تمام ربوہ پہنچ گئے۔ الحمدللہ۔

واپسی پر بھی سیالکوٹ والی فیملی ہمراہ تھی۔ لاہور تک اکٹھے سفر کیا اور لاہور سے وہ سیالکوٹ چلے گئے۔ واپسی پر بھی انہوں نے بڑی مدد کی۔ فجز اھم اللہ احسن الجزاء

جرمنی میں میرے بہت سے عزیز قیام پذیر ہیں۔ سب نے ربوہ کے مقیم عزیزوں کو بہت سارے تحائف بھیجے جو ان تک پہنچائے گئے۔ آتے ہی پھر روزمرہ کے معمولات شروع ہو گئے۔ مدرسۃ الظفر میں تدریس اور دارالقضا کے مقدمات وغیرہ امور کی انجام دہی شروع ہوگئی۔

جلسہ سالانہ قادیان 2009ء میں شمولیت کے لیے مقدس سفر

میری خوش قسمتی کہ مدرسۃ الظفر کے اساتذہ اور طلباء کو قادیان کے جلسہ میں ڈیوٹیاں دینے کے لیے نظام سلسلہ نے منتخب کیا اور اس عاجز کو بھی اس مقدس سفر کی

سعادت مل گئی۔ اغلباً اپنے احباب کے ہمراہ 18 دسمبر 2009ء کو علی الصبح بس میں سوار ہو کر واہگہ بارڈر کے لیے روانگی ہوئی۔ واہگہ بارڈر پہنچے تو وہاں جماعت احمدیہ لاہور اور ہانڈو گجر کی جماعتوں کا مشترکہ مہمان نوازی کا عمدہ انتظام تھا۔ جماعت لاہور نے بارڈر کی مشکلات سے مہمانوں کو بچانے کے لیے بھی ضروری انتظامات کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ بسہولت تمام بارڈر کی چیکنگ کے نظام سے گزرتے ہوئے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ وہاں کے بارڈر اہلکاران کا رویہ بھی دوستانہ تھا۔ قادیان والوں نے وہاں سے قادیان تک بسوں کا انتظام کیا ہوا تھا۔ وہاں سے بس میں بیٹھے اور شام کو بخیریت قادیان پہنچ گئے۔ جیسے ہی بس وڈالہ گرنتھیاں سے جو قادیان سے قریباً چھ میل کے فاصلہ پر ہے، آگے گزری احباب نے نہایت جوش و خروش سے نعرہ ہائے تکبیر وتوحید بلند کرنا شروع کر دیے اور انہی نعروں میں قادیان کا وہ میدان آ گیا جہاں مہمانوں کو بسوں سے اترنا تھا۔ چنانچہ وہاں اتر کر احباب پہلے سے بتائی گئی جماعتی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ خاکسار تو وہاں سے قریب ہی بیوت الحمد کوارٹرز قادیان میں اپنی بھانجی بشریٰ، جو بڑی آپا مرحومہ کی بیٹی ہے، کے ہاں چلا گیا۔ اسے پہلے سے اطلاع تھی۔ اس نے ہر طرح سے آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ کھانے اور رہائش کا عمدہ انتظام ہو گیا۔ جلسہ تو 26 دسمبر کو شروع ہونا تھا اس لیے ابھی فراغت تھی۔ چنانچہ ناشتہ کے بعد بہشتی مقبرہ دعا کے لیے چلا جاتا۔ آرتھرائٹس کی تکلیف کے باعث چلنا مشکل ہو جاتا تو کسی جگہ تھوڑا سا بیٹھ کر آگے چل پڑتا۔ بہرحال بہشتی مقبرہ میں دعاؤں کی توفیق پانے کے بعد وہاں سے (بیت) مبارک، بیت الدعا میں دعا کا موقع مل جاتا اور جی بھر کر دعا کر لیتا۔ بیت الفکر اور (بیت) مبارک میں نوافل کی توفیق مل جاتی۔ دوپہر کو دارالضیافت سے کھانا کھا لیتا اور پھر (بیت) اقصیٰ نماز ظہر وعصر کے لیے چلا جاتا۔ الغرض خوب دعاؤں اور عبادت کی توفیق ملی۔ مرحومہ

بہن کے شوہر مولوی فیض احمد صاحب دیہاتی (مربی) اوران کے بیٹے شمس الدین مبارک اوراس کے بچوں سے ملاقات ہوئی۔ برادرم رفیق احمد جاوید صاحب کو بھی میں نے اپنے پاس ٹھہرالیا تھا کیونکہ وہ زمین پرنہیں سو سکتے تھے اور میرے پاس ایک بڑا پلنگ تھا جس پر ہم دونوں گزارہ کر لیتے۔ بیت الدعا میں دعا کے وقت ایک دن وہ بھی ہمراہ تھے تو انہوں نے اپنے کیمرے سے خاکسار کو بیت الدعا کی سیڑھیوں پر کھڑا کر کے تصویر بھی بنائی ہوئی ہے۔ اللہ کرے مل جائے تو شاملِ کتاب کرسکوں۔

جلسہ کے تمام انتظامات نہایت عمدہ تھے۔ تقاریر بہت معیاری تھیں۔ مولوی سلطان محمود انور صاحب ناظر رشتہ ناطہ کی بھی تقریر تھی۔ بعض ہندوؤں اور سکھوں نے بھی جلسہ میں تقاریر کیں اور جماعت احمدیہ کی مساعی کو خوب سراہا۔ ایک ہندو شاعر نے تو (دینِ حق) کی تعریف میں نظم بھی پڑھی۔ حضور کا براہِ راست خطاب سننے کے لیے بہت سے سکھ اور ہندو بھی آئے ہوئے تھے۔ بہرحال ہر شامل ہونے والے نے جلسہ کی برکات سے خوب جھولیاں بھریں اور خوب برکات سمیٹیں۔ پر

روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

جلسہ ختم ہوا اور اس مقدس بستی سے جدائی کا وقت آن پہنچا۔ علی الصبح بس اڈے پر پہنچ کر بس میں سوار ہوئے اور واہگہ بارڈر پاکستان واپسی کے لیے پہنچ گئے۔ بارڈر پر محترم طاہر جمیل احمد صاحب مربی سلسلہ جو ہمارے مدرسہ میں کولیگ بھی تھے اور خدام الاحمدیہ کے عہدہ دار بھی، انہوں نے میرا بہت خیال رکھا اور سفر میں آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو بے حساب جزائے خیر عطا فرمائے۔ بارڈر سے گاڑی میں سوار ہوئے اور ربوہ گھروں کے سامنے اترے۔ الحمدللہ تمام سفر بخیر وخوبی انجام پذیر ہوا۔ معلوم نہیں پھر جانے کی کبھی زندگی میں سعادت ملے گی بھی کہ نہیں اور سعادت ملے تو صحت اس قابل ہوگی کہ سفر کرسکوں یا نہیں۔ جلسہ قادیان سے سرور

بھرے ایام کی یاد لیے واپس ربوہ پہنچ کر اسی پہلی ڈگر پر جو روزمرہ کے معمولات اور دیگر دینی امور کی انجام دہی میں مصروفیت ہوگئی۔ انجیو پلاسٹی کے بعد متعدد بار طاہر ہارٹ میں مختلف تکالیف کے باعث مختلف اوقات میں داخل ہونا پڑا اور خدا تعالیٰ کا شکر کرنے کی توفیق ملی کہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو ایسا عمدہ ادارۂ علاج بنانے کی توفیق بخشی جس کا ہر کارکن خلوص کے ساتھ خدمت میں مصروف ہے۔

لاہور میں واقعہ دہشت گردی

جیسا کہ الٰہی جماعتوں کو جان، مال، جذبات، وطن وغیرہ بے شمار قسم کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ افراد جماعت احمدیہ کو بھی مخالفین نے مختلف قسم کی تکالیف میں مبتلا کر کے ان قربانیوں کو پیش کرنے کا موقع فراہم کرتے رہتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ سے ہی جاںنثارانِ احمدیت کو سب سے قیمتی چیز یعنی جان کی قربانی پیش کرنے کی سعادت ملی۔ اور کابل میں حضرت مولوی عبدالرحمٰن صاحب اور حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب کو راہِ مولا میں قربان کیا گیا۔ اس کے علاوہ احمدیت کی تاریخ جانی قربانی کرنے والے احمدیوں سے بھری پڑی ہے اور احباب نے 1953ء، 1974ء اور 1984ء سے اب تک انفرادی طور پر خوب قربانیاں پیش کی ہیں لیکن اجتماعی قربانی کا واقعہ جو 28 مئی 2010ء کو لاہور میں پیش آیا یہ بہت عظیم واقعہ ہے۔

اس روز جمعہ کا دن تھا اتفاق سے جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد میں نے ٹی وی لگایا تو سامنے دارالذکر لاہور میں دہشت گردوں کی کارروائی کو ٹی وی والے دکھا رہے تھے۔ اوپر منار پر چڑھ کر دہشت گرد وقفے وقفے سے گولیاں برسا رہا تھا اور نہتے احمدی نمازی گولیوں سے چھلنی کیے جا رہے تھے۔ جن میں بچے بھی موجود تھے۔ گورنمنٹ کی طرف سے کوئی مدد نہیں کی گئی۔ اس حادثۂ جانکاہ میں ماڈل ٹاؤن اور گڑھی شاہو

دارالذکر میں پچاسی افراد اپنی جانوں کا نذرانہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کر چکے تھے۔

ماڈل ٹاؤن میں ان نہتے احمدیوں نے ایک دہشت گرد کو باوجود نہتے ہونے کے نہایت حوصلہ مندی اور جرأت سے قابو کر کے پولیس کے حوالے کیا۔ انتہائی دلدوز واقعہ تھا لیکن جان قربان کرنے والوں کے تمام لواحقین نے اپنے عزیزوں کا صدمہ ہمت اور جرأت سے برداشت کیا۔ اس واقعہ میں ڈیڑھ صد کے قریب احباب زخمی بھی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور خلافت کی برکت سے راہِ مولا میں جان قربان کرنے والوں کے لواحقین کے لیے کسی ادارہ سے کوئی امداد قبول نہیں کی گئی۔ بلکہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے جماعت کو از خود ان کے لواحقین کے اخراجات برداشت کرنے کی ہدایت فرمائی اور عالمی جماعت احمدیہ نے اب تک تمام جان قربان کرنے والوں کے بچوں کے ہر قسم کے ضروری اخراجات اللہ تعالیٰ کے فضل سے اٹھا رکھے ہیں۔

مدرسۃ الظفر سے اصلاح وارشاد واپسی

مدرسۃ الظفر کی عمارت مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے افتتاح وغیرہ کا ذکر گزر چکا ہے۔ اب خاکسار کی رہائش مدرسہ کی عمارت سے خاصی دور تھی اور اب بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے کے باعث سائیکل بھی نہیں چلا سکتا تھا۔ موٹر سائیکل کی اجازت نہیں تھی۔ دو اڑھائی سال گاڑی رکھی۔ مگر ڈرائیونگ عزیزم آفاق احمد میرا نواسہ کرتا رہا۔ اب وہ جرمنی جا رہا تھا اس لیے گاڑی تو فروخت کر دی اور رکشہ کا استعمال شروع کیا جو کافی دقت کا باعث تھا۔ اب مجھے مدرسہ میں پڑھاتے ہوئے تقریباً سترہ سال کا عرصہ ہو گیا تھا۔ مدرسہ میں مَیں اصلاح وارشاد سے عاریۃً لیا گیا تھا۔ چنانچہ اپریل 2015ء میں میری اصلاح وارشاد میں واپسی ہو گئی۔ اس وقت سے اب تک اصلاح وارشاد کے

تحت (بیت) مبارک میں مصروف عمل ہوں۔لیکن مدرسۃ الظفر کے اکثر اساتذہ سے اب بھی مضبوط دوستانہ تعلقات ہیں اور اکثر ملاقات کی تقریبات پیدا کی جاتی ہیں۔

ان سطور کی تحریر کے وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری عمر چھیاسی سال اور آٹھ ماہ ہوگئی ہے اور آرتھرائیٹس کے باعث چلنا پھرنا مشکل ہو رہا ہے۔صبح محترم بشیر احمد سیفی صاحب سابق صدر محلّہ کی مہربانی سے ان کی گاڑی میں ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں اور کرایہ کے رکشہ پر واپس گھر آ جاتا ہوں۔

سپاسنامہ از طرف اساتذہ مدرسۃ الظفر

مدرسۃ الظفر میں خاکسار کو اور محترم رفیق احمد جاوید صاحب کو جو الوداعیہ دیا گیا اس میں اساتذہ کرام نے اپنی طرف سے مندرجہ ذیل سپاسنامہ پیش کیا۔اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے اور اپنے فضلوں کا وارث بنائے۔آمین

''اللہ تعالیٰ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے اپنے فضل سے جماعت احمدیہ کو بہت سے مخلص، فدائی اور بے نفس خادم عطا کیے ہیں۔جنہوں نے اپنی زندگیاں اس راہ میں وقف کر کے خدمت سلسلہ میں گزار دیں۔آج ہم نے ایسے ہی دو بزرگان کے اعزاز اور تکریم اور ان کو مدرسۃ الظفر سے الوداع کہنے کے لیے اس تقریب کا انعقاد کیا ہے۔

مکرم ومحترم حکیم نذیر احمد ریحان صاحب کچھ عرصہ قبل یہاں سے رخصت ہوئے اور اب مکرم ومحترم رفیق احمد جاوید صاحب تشریف لے جا رہے ہیں۔مدرسۃ الظفر مکرم حکیم نذیر احمد ریحان صاحب سے 17 سال جبکہ مکرم رفیق احمد جاوید صاحب سے تقریباً20 سال تک مستفیض ہوتا رہا۔مکرم رفیق احمد جاوید صاحب اس وقت وائس پرنسپل کے طور پر خدمت بجالا رہے تھے۔ابتداء میں آپ کو انچارج کلاس اور مختلف

مواقع پر قائمقام پرنسپل کے طور پر بھی خدمت کی توفیق ملتی رہی۔

ان دونوں بزرگان کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ان کی گفتار اوران کا کردار ہر دو حقیقی وقف کی روح کے آئینہ دار ہیں۔ایک لمبا عرصہ ہمیں ان کی صحبت میسر رہی اور ہم ان کی خوبیوں اور بلند کردار کے نہ صرف گواہ ہیں بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا ہے۔کبھی ان کی گفتار نے ہماری تربیت کی تو کبھی ان کا کردار ہمارے لیے خاموش مربی ثابت ہوا۔

ان کی نیکی، تقویٰ، سادگی، عاجزی، سچائی، بے نفسی، ہمدردی، زندہ دلی، وقت کی پابندی، علم دوستی، اپنے کام سے اخلاص، محنت کی عادت، نمازوں کی سنوار کر ادائیگی، دعائیں، خلافت سے وفا اور محبت کا تعلق، ساتھیوں سے دوستانہ اور مشفقانہ برتاؤ، طلباء سے پدرانہ اور ہمدردانہ تعلق آج بھی ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ان کی پدرانہ شفقت کا ہی نتیجہ تھا کہ طلباء حقیقی والدین کی طرح اپنائیت کے ساتھ ان سے اپنی باتیں کہتے اور اپنے مسائل پیش کر کے رہنمائی لیتے اور کسی قسم کی جھجھک محسوس نہ کرتے۔

لاریب ان کی دعائیں اور ان کا وجود مدرسہ کے لیے بہت ہی مفید رہا۔ان کے بہت سے نیک خصائل نے طلباء اور اساتذہ پر اپنی تاثیر ظاہر کی اور ان میں منتقل ہوئے۔فارسی کا ایک خوبصورت شعر ہے

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

کسی نے اس مٹی کو جس میں پھول لگے تھے ہاتھ میں لے کر سونگھا تو اسے اس میں سے بھی خوشبو آئی۔اس نے مٹی کو مخاطب کر کے پوچھا کہ تُو تو مٹی ہے تجھ میں یہ خوشبو کہاں سے آئی؟ تو مٹی نے جواب میں یہ شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ۔ میرے ہمنشیں کے حسن و جمال نے مجھ میں یہ تاثیر پیدا کی ہے ورنہ میری حقیقت تو

یہی ہے کہ میں مٹی کی مٹی ہی ہوں۔

پس یقیناً ان کی سیرت و کردار کے حسن و جمال نے ہمیں جوان کے ساتھی ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں متاثر کیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی خوبیوں کا وارث بنائے اور ان کی کمی محض اپنے فضل سے پوری فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر اور صحت میں بے پناہ برکت عطا فرمائے، اپنی حفظ و امان میں رکھے، ہر آن حامی و ناصر ہو اور بے شمار فضلوں کی بارش ان پر برساتا رہے۔

ہم ان سے بھی درخواست گزار ہیں کہ پہلے کی طرح ہمیشہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ہماری غلطیوں، کوتاہیوں اور بھول چوک سے صرفِ نظر فرمائیں۔ اپنے اس ادارے کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جہاں آپ کو اتنا لمبا عرصہ خدمت کی توفیق ملی جس میں ایک بچہ پیدا ہو کر جوان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور بے شمار فضلوں سے نوازے۔ آمین

ہر گام پر فرشتوں کا لشکر ہو ساتھ ساتھ
ہر ملک میں تمہاری حفاظت خدا کرے

والسلام

ہم ہیں

اساتذہ مدرسۃ الظفر ربوہ''

ربوہ میں میرے بعض مخلص اہل محلّہ

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مبشر

آپ ابتدائی واقفین زندگی میں سے تھے۔ سال ہا سال تک افریقہ کے بعض ممالک میں سلسلہ کی خدمات بجالاتے رہے۔ میرے ربوہ آنے سے پہلے آپ محلّہ میں سکونت پذیر تھے۔ نہایت عابد زاہد، صاحبِ کشف والہام اور دعا گو بے نفس وجود تھے۔ ابتداءً گھانا میں گئے اور ملک میں منادی کر دی کہ حضرت امام مہدی آ گئے ہیں۔ مخالف علماء نے کہا کہ مہدی کی آمد کی نشانی ملک میں زلزلہ آنا ہے۔ جبکہ ملک گھانا زلازل کی زون سے باہر واقعہ ہے۔ حضرت مولانا نے اللہ کے حضور دعا کی تو آپ پر انکشاف ہوا کہ فلاں ماہ فلاں تاریخ تک زلزلہ آئے گا۔ آپ نے اس کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ آپ کے اعلان کے مطابق ملک گھانا میں زلزلہ آیا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت کا ثبوت بنا۔ مجھے تو آپ کی صحبت سے استفادہ کا بہت قلیل موقع ملا لیکن محلّہ میں آپ کی نیک تاثیرات ضرور سایہ فگن تھیں۔ آجکل آپ کے چھوٹے صاحبزادے مکرم ومحترم ڈاکٹر منیر احمد صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس گورنمنٹ سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد اسی محلّہ میں مخلوق خدا کی خدمت میں محو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بے حد وحساب برکات سے نوازے۔ آمین

مکرم ملک بشارت احمد صاحب

دوالمیال ضلع جہلم کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد محترم کو حضرت مسیح موعود

علیہ السلام کی رفاقت کا شرف حاصل ہے۔آپ نے بہت ابتداء میں ربوہ میں رہائش کے لیے زمین خریدی تھی۔محترم ملک بشارت احمد صاحب کو دارالرحمت غربی کا یہ پلاٹ ورثہ میں ملا تھا۔ملک بشارت احمد صاحب ذاتی طور پر نہایت نیک، شریف النفس، دعا گو، تہجد گزار اور نظام سلسلہ سے مضبوط تعلق رکھنے والے تھے۔ بقول ایک معتبر اہل محلّہ اٹھارہ سال تک بیت دارالرحمت غربی میں امام الصلوۃ کے فرائض نہایت عمدگی اور بے نفسی سے ادا کیے اور اسی خدمت کے دوران ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں داخل فرمائے۔آمین

مکرم ملک مبارک احمد صاحب

آپ مکرم ملک بشارت احمد صاحب کے حقیقی بھائی تھے۔واقف زندگی ہونے کا شرف حاصل تھا۔عربی زبان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔جامعہ احمدیہ میں سال ہا سال تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔(مربیان) کی ایک بڑی تعداد کو ان کا شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہے اور خاکسار کو بھی ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین

جناب صوفی بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے

آپ کے والد محترم جناب صوفی عطا محمد صاحب تھے۔ایک بار لاہور دہلی دروازہ کی بیت میں دوران تعلیم طبیہ کالج لاہور ان کی اقتداء میں نماز جمعہ کی ادائیگی کی بھی توفیق ملی تھی۔ان کے صاحبزادے جناب صوفی بشارت الرحمٰن صاحب بلند پایہ علمی حیثیت کے مالک تھے۔تعلیم الاسلام کالج میں پروفیسر رہے۔جب گورنمنٹ نے تعلیمی ادارے قومیا لیے تو صوفی صاحب محترم نے استعفٰی دے دیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ

اللہ نے آپ کوسیکرٹری مجلس کارپرداز کے فرائض ادا کرنے کا ارشاد فرمایا۔ چنانچہ آپ خدمت سلسلہ میں ایک بار پھر سے مصروف ہو گئے۔ علمی شخصیت تھے۔ محلّہ میں بعد نماز عصر احباب کو تین آیاتِ قرآنی کا ترجمہ پڑھایا کرتے تھے۔ 56-1955 کی بات ہے۔ محترم مولانا ابوالمنیر نورالحق صاحب کے بعد قائد مجلس خدام الاحمدیہ ربوہ منتخب ہوئے تو خاکسار بھی آپ کی مجلس کا ممبر تھا اور ایک موقع پر آپ کے رخصت لینے کے باعث خاکسار نے قائمقام قائد ربوہ کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ محترم صوفی صاحب اپنے رفقائے کار سے نہایت احترام سے پیش آتے تھے۔ آپ عالم باعمل متقی اور زاہد انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

پنڈت عبدالسلام صاحب

ان کے والد محترم ہندوؤں سے احمدی ہوئے تھے اور اغلباً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے رفیق بھی تھے۔ عبدالسلام نوجوان تھے، خدام الاحمدیہ محلّہ کی تنظیم میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ حفاظت خلافت کے طور پر بھی آپ کو خدمات کی سعادت حاصل ہے۔ نظام جماعت کے پابند، نماز باجماعت ادا کرنے والے مخلص وجود تھے۔ سالہا سال تک محلّہ میں سیکرٹری وقف جدید کے طور پر خدمت کی توفیق ملی۔ نہایت محنت سے اپنے فرائض کی ادائیگی کرنے والے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے۔ آمین

چوہدری محمد ظفر اللہ صاحب

ملتان سے جب خاکسار کا تبادلہ نظارت امور عامہ ربوہ شعبہ احتساب میں ہوا تو آپ اسی شعبہ میں خدمات سلسلہ کی بجا آوری میں مصروف تھے۔ خاکسار کو بھی شعبہ

احتساب میں آپ کے ساتھ خدمات سلسلہ کی توفیق ملی اور ایک دوسرے سے بخوبی تعارف بھی ہو گیا۔ نیز ایک ہی محلّہ کی بیت میں ادائیگی صلوٰۃ کی توفیق ملتی تھی اس طرح تعارف مزید بڑھ گیا۔ آپ محلّہ کے سیکرٹری مال تھے اور سال ہا سال سے سیکرٹری مال کے فرائض نہایت تندہی، ایمانداری اور محنت سے ادا کرتے رہے۔ کچھ عرصہ خاکسار کو بھی مرکز کی طرف سے قائمقام صدر محلّہ کا اعزاز عطا ہوا تو میرے ساتھ آپ کا تعاون مثالی تھا۔ آج کل اللہ تعالیٰ کے فضل سے صدر محلّہ کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مخلص، کم گو، تہجد گزار، فرض شناس، پانچوں وقت نماز باجماعت کی پابندی کے عادی۔ اللہ تعالیٰ مزید خدمات کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کی اہلیہ صاحبہ بھی اس وقت صدر لجنہ کے فرائض ادا کر رہی ہیں اور نہایت مخلص اور غرباء کی ہمدرد خاتون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی بیش از پیش خدمات سلسلہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

چوہدری بشارت احمد کاہلوں صاحب مرحوم

آپ لطیف آباد حیدر آباد سے آکر ربوہ آباد ہوئے تھے۔ نہایت مخلص، پانچ وقت نماز باجماعت کے پابند، تہجد گزار اور مالی قربانی میں پیش پیش رہتے تھے۔ اب وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ آمین

چوہدری ناصر احمد صاحب

ربوہ آنے سے قبل ناروے میں مقیم تھے۔ بوڑھے ماں باپ کی خدمت کے لیے واپس پاکستان آکر والدین سمیت ربوہ میں آباد ہو گئے۔ اس وقت محلّہ کے سیکرٹری امور عامہ کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ نہایت محنتی ہیں۔ بیت ناصر کی تعمیر نو میں سارا سامان تعمیر نہایت محنت سے خرید کر مہیا کیا اور اپنا کثیر وقت اس خدمت پر

صرف کیا۔ ہر نماز کے وقت بیت میں موجود ہوتے ہیں۔حفاظت بیت کے لیے خدام سے اچھے تعلقات استوار کیے ہوئے ہیں۔ مالی امور میں بھی فراخ دلی سے حصہ لیتے ہیں۔نہایت خوش خلق، ملنسار اور ہر ایک کے کام آنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بیش از پیش خدمات کی توفیق دے۔آمین

محترم ملک عبدالرب صاحب مرحوم

میں اپنے گھر سے باہر نکلوں تو بائیں طرف محترم ملک صاحب کا گھر ہے۔ ملک صاحب کے آباء واجداد خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خدمتگار تھے۔محترم ملک صاحب بھی خاندان مسیح موعودؑ کے افراد سے محبت بھرا تعلق رکھتے تھے۔خصوصاً ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب تو ملک صاحب کو اپنا بھائی سمجھتے تھے اور ملک صاحب کے ہاں دکھ سکھ میں بمع اہل وعیال شرکت فرماتے تھے۔ملک صاحب سالہا سال محلّہ میں سیکرٹری امور عامہ رہے۔میرے ساتھ نہایت محبت بھرے تعلقات تھے۔حق ہمسائیگی سے خوب آگاہ تھے۔جس کی عندالضرورت باحسن وجوہ ادائیگی بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اکلوتے بیٹے عزیزم ڈاکٹر ملک عبدالقیوم صاحب کو بھی حسناتِ دارین سے نوازے اور نرینہ اولاد عطا فرمائے۔آمین

میاں مبارک احمد صاحب

میرے ربوہ آباد ہونے کے وقت رحمت بازار میں کریانے کا کاروبار کرتے تھے۔ رحمت بازار تاجران کے صدر بھی تھے۔نہایت مخلص، نمازی اور تہجد گزار تھے۔نمازِ فجر سے قبل گلیوں سے صل علیٰ بلند آواز سے پڑھتے ہوئے گزرتے جس سے نماز پر آنے کی احباب کو تحریک ہو جاتی۔میرے گھر سے دو گھر آگے آپ کا خوبصورت وسیع مکان تھا۔

آپ کے اہل خانہ اور بچے میرے اہل خانہ اور بچوں سے پیار محبت کے تعلقات رکھتے اور ملتے ملاتے رہتے۔اب سارا خاندان کینیڈا میں آباد ہو گیا ہے۔اللہ تعالیٰ بیش از پیش حسناتِ دارین سے نوازے۔آمین

مکرم شیخ برکت علی صاحب

ان کے والد محترم قادیان میں درویش تھے۔ برکت علی صاحب تین بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ میٹرک پاس کر کے صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت اختیار کی۔ ابتداء میں خلافت لائبریری کے کارکن تھے۔ پھر نظارت اصلاح و ارشاد میں بطور اکاؤنٹنٹ لمبا عرصہ فرائض ادا کیے بعد ازاں دارالضیافت میں سٹور کیپر کے طور پر خدمت میں آخری دم تک مصروف رہے۔ بہت نیک آدمی تھے۔ ایک احمدی کی صفات سے متصف تھے۔ میرے ساتھ ان کے بہت قدیمی اور دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کے دوسرے بھائی شیخ محمد یونس صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر لاہور منتقل ہو گئے اور 28 مئی 2010ء کو ماڈل ٹاؤن لاہور کے سانحہ میں راہِ مولا میں قربان ہو گئے۔ تیسرے بھائی بھی صدر انجمن احمدیہ کی ملازمت کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ مکرم شیخ برکت علی صاحب موصی تھے اور بوقت وفات تمام حساب کتاب صاف تھا۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے۔ آمین

صوفی لیاقت علی صاحب

ان کے والد مکرم صوفی علی محمد صاحب خادم سلسلہ تھے اور بحیثیت معلم وقف جدید خدمت کی توفیق پائی۔ خاکسار کے ساتھ سندھ میں لمبا عرصہ کام کیا۔ صوفی صاحب محترم ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دستِ شفا بخشا ہوا ہے۔ خوب

مریض آتے ہیں۔نہایت خوش الحانی سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔میرے زمانۂ صدارت میں امام الصلوۃ بھی رہے۔قرآن مجید کا کافی سارا حصہ حفظ ہے۔مالی قربانی میں پیش پیش تھے۔اب دارالرحمت وسطی میں کوٹھی بنا کر اس میں منتقل ہو گئے ہیں۔ایک رمضان میں ان کے مکان پر نماز فجر کے بعد لجنہ کے لیے درس القرآن کی خاکسار کو توفیق ملی۔الحمدللہ

ڈاکٹر رشید احمد صاحب ایاز

محلّہ کے ایک مخلص فرد ہیں۔سلسلہ کی خدمات میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیش پیش ہیں۔احباب جماعت کے ساتھ قرب ومحبت کے گہرے تعلقات ہیں۔ان کا صاحبزادہ بھی مخلص خادم سلسلہ ہے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین

چوہدری بشیر احمد صاحب اٹھوال

58-1957ء میں ربوہ آکر آباد ہو گئے۔ابتداء میں معمولی نوکری وغیرہ کرتے۔اس دوران غرباء اور مشکلات میں مبتلا احباب کی مدد کرتے۔ بعد ازاں تجارت شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس قدر نوازا کہ آج کوٹھی، کار، بنک بیلنس اور وسیع کاروبار کے مالک ہیں۔ بشاشت کے ساتھ بڑھ چڑھ کر مالی خدمات کی توفیق پاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو (بیت الذکر) کے قرب میں کوٹھی عطا کی ہے۔نماز باجماعت کی بھی پابندی کرتے ہیں۔کاروبار اب بیٹے چوہدری محمد موسیٰ کے سپرد ہے۔ چوہدری صاحب محترم عاجزی اور انکساری کا مرقع ہیں۔ گفتگو میں نرمی اور متانت ہے۔نمود ونمائش اور تکبر سے مبراء ہیں۔اللہ تعالیٰ بیش از پیش خدمات کی توفیق دے اور صحت والی لمبی زندگی عطا کرے۔آمین

بشیر احمد سیفی صاحب

آباء واجداد ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں مشرف باحمدیت ہوئے۔سیفی صاحب محترم چھوٹی عمر میں ہی اپنے بھائی عبدالجبار صاحب کے پاس حصول تعلیم کے لیے چنیوٹ آ گئے اور پڑھتے پڑھتے بی۔اے کرلیا۔ چنانچہ آپ کو یونائٹڈ بنک میں ملازمت مل گئی۔شادی بھی ہوگئی اوردارالرحمت غربی ربوہ میں مکان بھی اللہ تعالیٰ نے عطا کر دیا۔میں نے جب بچوں کو اپریل 1989ء میں ربوہ اپنے اس مکان میں منتقل کیا، جو دارالرحمت غربی میں واقع ہےتوسیفی صاحب صدرمحلّہ کے عہدہ پر فائز تھے۔میں جب ملتان سے تبدیل ہوکرربوہ آیاتو آپ صدرمحلّہ ہی کے منصب پر فائز تھے۔میرے ساتھ نہایت احترام سے پیش آتے۔ بلکہ اکثر جماعتی جلسوں میں خاکسار کوتقریر کا موقع دیتے۔کچھ عرصہ خاکسار نے قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ بھی پڑھایا ہے۔علاوہ ازیں قرآن وحدیث وکتب سلسلہ کے دروس کے لیےبھی مجھ سے خدمت لیتے۔

بیت الناصر دارالرحمت غربی بہت پرانی ہوچکی تھی۔اس کی تعمیرنو کے لیے کمر ہمت کس کرتن من دھن سے مصروف ہوگئے۔تعمیر بیت میں اپنی اوراپنے خاندان کی طرف سے آٹھ لاکھ کی خطیر رقم بطورعطیہ دی۔علاوہ ازیں تعمیر کی نگرانی اورسامان کی خریداری کے لیے جتنی بار بھی سفر کرنا پڑا اخراجاتِ سفر اپنی گرہ سے ادا کیے۔اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک وسیع وعریض بیت کی تعمیر کا موجب بنے۔ہمارے محلّہ کی یہ بیت،بیتِ اقصیٰ اوربیتِ مبارک کے بعد ربوہ کی تیسری بڑی بیت ہے جس کی تعمیر کی نگرانی اوراخراجات کے حصول کی آپ نے بھرپور کوشش کی۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔علاوہ ازیں بہت سارے احباب کے ساتھ انفرادی طور پر بھی

ان کا سلوک مثالی ہے۔مثلاً خاکسار پر بھی ان کی بے پایاں شفقت اور احسان ہیں۔قریباپونے دوسال سے میں مدرسۃ الظفر کی تدریس سے واپس اصلاح وارشاد آ گیا۔اس وقت سے روزانہ صبح دفتر کے وقت پر نہ صرف مجھے بلکہ دواور احباب کو بھی گاڑی میں سوار کر کے لے جاتے اور بر وقت دفتر پہنچا دیتے ہیں۔اسی طرح محلّہ کے بیس سے زائد ایسے احباب جو بیرون پاکستان جا چکے ہیں ان کے مکان سیفی صاحب محترم کے سپرد ہیں۔کرایہ پر دے کران کی فائلیں بنائی ہوئی ہیں۔کرایہ وصول کر کے مالکوں تک پہنچاتے ہیں۔گویا بہت بڑے خادم اور امین کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔واقف زندگی احباب کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔آجکل سارے ربوہ کے سیکرٹری مال کے فرائض بھی آپ کے ذمہ ہیں جس سے خوبصورتی کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔فجزاھم اللہ احسن الجزاء

مکرم رفیع الدین صاحب

میرے دائیں طرف والے ہمسایوں کا ذکر تو رہ ہی گیا۔خاکسار کے دائیں طرف مکرم ومحترم رفیع الدین صاحب کی کوٹھی تھی۔ یہ خاندان قادیان کا باشندہ تھا۔اب ہجرت کے بعد بھی مرکز احمدیت کو ہی مسکن بنایا اور ابتداءً ہر قسم کی مشکلات کے باوجود مرکز کی سکونت کو ہی قائم رکھا۔آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نفوس اور اموال میں برکت دینا شروع کی اور اللہ تعالیٰ نے رفیع الدین کو آٹھ بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا۔ چار بیٹے بیرون ملک جا چکے ہیں اور چار ربوہ میں کاروبار کر رہے ہیں۔عمدہ سا شادی ہال بنایا ہوا ہے اور باقی لوازمات بھی اپنے ہیں۔ربوہ میں متعدد پلاٹ خرید چکے ہیں۔ سب بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور سب صاحب اولاد ہیں۔سلسلہ کی خدمت میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔رفیع الدین صاحب تو اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ان کی

اہلیہ صاحبہ بقید حیات ہیں۔سارے بیٹے والدہ کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

شروع سے ہی میرے ساتھ ان کے تعلقات اچھے ہیں۔کبھی بھی ان کی طرف سے کسی قسم کی ترش روئی پیش نہیں آئی۔ بلکہ ہمیشہ ہی محسنوں کا سا سلوک ہے۔اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین۔یہ ہے تابعین رفقاء احمد علیہ السلام کی کہکشاں جس میں زندگی کے شب و روز بسر ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و نیاز اور شکرانہ کے جذبات پیش کرنے کی توفیق مل رہی ہے۔ان احباب میں سے چھ احباب تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔میاں مبارک احمد صاحب بچوں سمیت کینیڈا سدھار گئے ہیں اور اب یہ شعر بار بار زبان پر آ رہا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اللہ تعالیٰ ہم سب کا انجام بخیر کرے۔آمین

مکرم ڈاکٹر حنیف احمد قمر صاحب

گذشتہ صفحات میں ان اہل محلّہ دوستوں اور بزرگوں کا ذکر کیا جا چکا ہے جو تابعین رفقاء حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ذیل میں آتے ہیں اور خاکسار کو ان کے ساتھ زندگی کے لمحات بسر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ان سطور میں بھی ایک مخلص دوست مکرم و محترم ڈاکٹر حنیف احمد قمر صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس کا تذکرہ مقصود ہے جو دارالرحمت غربی میں بود و باش رکھتے ہیں۔کوالیفائیڈ ڈاکٹر اور سرکاری ملازم ہیں محلّہ میں دینی و دنیاوی لحاظ سے مومنانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پانچ وقت نماز با جماعت کی ادائیگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔گذشتہ دنوں صدر محلّہ دارالرحمت غربی کے عہدۂ جلیلہ کے لیے منتخب ہوئے۔لیکن سرکاری مصروفیات آڑے آئیں اور جماعتی

خدمت سے معذرت کے سوا چارہ کار نہ رہا۔ ناچار اس خدمت سے معذرت کر لی۔ نہایت خوش الحانی سے صحت تلفظ اور قرأت کے قواعد کو پیش نظر رکھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی نعمت کے ساتھ خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ڈیوٹی سے واپس آتے ہیں تو ضرور تمند فون کالز کے ذریعہ آپ کے فن معالجہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ ہر امیر وغریب کے بلاوہ کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور نہایت قلیل چارجز وصول کرتے ہیں۔ ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ جس وقت بھی آپ کو کوئی بلائے بلا عذر و تاخیر تشریف لے آتے ہیں۔ احمدی اور غیر احمدی غرباء کے ساتھ نہایت مروت اور احسان سے پیش آتے ہیں۔ کسی بھی مریض کے معائنہ اور تجویز علاج کے بعد از خود کسی فیس کا مطالبہ نہیں کرتے۔ مریض کے از خود دریافت کرنے پر فیس وغیرہ بتا دیتے ہیں۔ اگر وہ ادائیگی کر دیں تو ٹھیک ورنہ خاموشی سے واپس آجاتے ہیں اور جب کوئی ادائیگی کرے قبول کر لیتے ہیں۔ اس بارہ میں طبیعت میں کوئی لالچ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت میں استغناء کی دولت ودیعت کی ہوئی ہے۔ آپ کے نانا حضرت حاجی محمد الدین صاحب تہال ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ آپ کو رفاقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سعادت حاصل تھی۔ تقسیم ملک کے وقت بطور درویش دیار مسیح موعود علیہ السلام میں 1965ء تک مقیم رہے۔ 1965ء میں پاکستان آئے تو بیمار ہو کر مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں ان کی تدفین ہوئی۔ تقسیم ملک کے کچھ عرصہ بعد خاکسار کو زیارت قادیان کا شرف حاصل ہوا تو محترم حاجی صاحب کی اقتداء میں بیت مبارک میں تہجد باجماعت ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

محترم ڈاکٹر صاحب کے ذکر میں اختصار کے ساتھ یہ بھی تحریر ہے کہ آپ سادگی، قناعت، اطاعت نظام اور اطاعت امام کے جذبات سے بھرپور حصہ رکھتے ہیں۔ اللہ

تعالیٰ انہیں روحانی وجسمانی لحاظ سے زیادہ سے زیادہ نعماء سے سرفراز فرمائے اوران کی اولاد کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔آپ بھی اسی کہکشاں کے ایک تارے ہیں جن میں مجھے زندگی کے چھبیس سال گزارنے کا اب تک موقع مل چکا ہے۔آئندہ خدا جانے کب تک مہلت ملتی ہے اور کب کشتی کنارے جالگتی ہے۔اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے۔آمین

میری اولاد

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے مجھے آٹھ بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا۔ دو بیٹیاں تو نوعمری میں فوت ہوگئیں۔ چھ پروان چڑھیں جن کے نام اور مختصر کوائف درج ذیل ہیں۔

امۃ السلام

سب سے بڑی بیٹی امۃ السلام تھی۔ جس کا نام حضرت اماں جان نے رکھا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ باندھی میں بطور ٹیچر گرلز سکول سروس کی اور پھر اس کی شادی کر دی گئی جس پر اس نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کے میاں عزیزم معین الدین تھے جو بابے بھاگ کے پڑپوتے تھے۔ اس کے ہاں بھی چھ بچے، چار بیٹیاں اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان سب بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور سب صاحب اولاد ہیں۔ لیکن عزیزہ امۃ السلام 2003ء میں بریسٹ کینسر کے باعث وفات پا گئی۔

امۃ القیوم

اس سے چھوٹی بیٹی امۃ القیوم اس وقت جرمنی میں اپنے بچوں اور میاں عزیزم خالد حسین خادم صاحب کے ساتھ مقیم ہے۔ اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ سب شادی شدہ ہیں اور نظام جماعت سے بخوبی وابستہ ہیں۔

رفیق احمد رہان

تیسرے نمبر پر عزیزم رفیق احمد رہان مقیم جرمنی ہے۔ اس کی اہلیہ عزیزہ ریحانہ بشریٰ ہیں۔ ان کے بھی دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایک بڑا بیٹا واقف زندگی ہے اور جامعہ جرمنی کے آخری سال میں ہے۔ اس کی بھی شادی ہوگئی ہے۔ ایک بیٹی عمرانہ

بسالت نے حضور انور سے اپنی تعلیمی قابلیت کے باعث میڈل بھی لیا تھا۔شادی شدہ ہے۔مزید ایک بیٹی ہے اس نے بھی تعلیمی قابلیت کے باعث میڈل لیا تھا۔ایک چھوٹا بیٹا زیر تعلیم ہے۔

خالدہ تحسین

چوتھے نمبر پر عزیزہ خالدہ تحسین ہے۔ان کے میاں عزیزم زاہد ارشاد صاحب ہیں۔ان کے ہاں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا عزیزم آفاق احمد ساکن جرمنی ہے۔دو بیٹیوں شمائلہ اور بشریٰ کی شادی ہو چکی ہے اور حانیہ اور ثانیہ ابھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔حانیہ تعلیمی لحاظ سے بہت قابل ہے اور اسّی فیصدی سے بھی زیادہ نمبر لیتی ہے۔

بشیر احمد رہان

عزیزم بشیر احمد رہان ساکن جرمنی ۔ یہ لاء گریجوایٹ ہے۔اس کی اہلیہ عزیزہ نعیمہ بشریٰ ہیں۔ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔دو بیٹیوں کے رشتے طے ہو چکے ہیں۔ایک بیٹی اور بیٹا ابھی چھوٹے ہیں۔

امۃ الباسط

امۃ الباسط نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی اور محترم مربی عبدالحمید طاہر صاحب کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی۔اس کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ بیٹی میڈیکل میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ایک بیٹا گھانا یونیورسٹی میں ٹیلی ویژن انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر چکا ہے۔دوسرا بیٹا چائنا یونیورسٹی میں ایروناٹیکل انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے اس سال چلا گیا ہے۔ایک بیٹا ابھی چھوٹا ہے۔عبدالحمید طاہر صاحب قریباً بیس سال سے گھانا میں خدمت دین میں مصروف ہیں۔

بشریٰ صدیقہ

بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔اس کی بھی شادی ہو چکی ہے اور پانچ بیٹیاں

ہیں۔اس کے میاں عزیزم قدیر احمد ناصر صاحب انگلستان گئے تھے۔ان کا کیس وہاں پاس ہو چکا ہے۔سوائے عفت قدیر کے باقی سارے بچے جا چکے ہیں۔

سلمیٰ کلیم

اپنے میاں عزیزم کلیم احمد بٹ صاحب کے ہمراہ جرمنی میں ہے اور اس کے ہاں بھی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے جو ابھی نوعمر ہیں۔میں جس قدر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر کروں کم ہے۔میں اپنے والد کا اکلوتا بیٹا تھا جسے انہوں نے وقف کیا۔لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی کہ میری شادی اور اولاد کو دیکھ پاتے۔مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنی لمبی زندگی دی ہے کہ اولاد در اولاد کی بھی شادیاں دیکھنے کی توفیق ملی ہے۔الحمدللہ علیٰ ذالک

میری اولاد اور جماعتی خدمات

عزیزہ امۃ السلام

میری بڑی بیٹی عزیزہ امۃ السلام نے سینتالیس سال عمر پائی۔اس کی چار بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔تمام شادی شدہ ہیں۔ایک بیٹا بمع بیوی بچوں کے جرمنی میں ہے۔بڑی بیٹی حیدرآباد میں ہے۔اس کا میاں قائد خدام الاحمدیہ ہے۔دوسری بیٹی بمع بچوں کے جرمنی میں ہے۔تیسری بیٹی انگلستان میں سکونت پذیر ہے۔چوتھی بیٹھی ملائشیا میں ہے۔امۃ السلام کا چھوٹا بیٹا اور اس کا میاں معین الدین جس کے آباء واجداد قادیان کے رہنے والے ہیں، وہ حیدرآباد میں مقیم ہے۔

عزیزہ امۃ القیوم

یہ بھی بچوں سمیت 1989ء سے جرمنی میں مقیم ہے۔اور جب سے جرمنی گئی ہے لجنہ میں مختلف خدمات بجالا رہی ہے۔اس کی خدمات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

1992ء سے 2010ء قریباً اٹھارہ سال تک صدر لجنہ رائن ہائم رہی اور اپنا مکان

خرید لینے کے باعث رائن ہائم سے نقل مکانی کر کے BUETTELBORN شہر میں 2011ء سے 2014ء تک بطور صدر لجنہ خدمت کی توفیق ملی۔ علاوہ ازیں شعبہ اشاعت میں معاونہ برائے مصباح اور ریجن میں سیکرٹری تربیت کے طور پر بھی خدمت کی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ عزیزہ نظام وصیت میں شامل ہے۔

سلمان طیب عزیزہ امۃ القیوم کا بڑا بیٹا صحافت کا کورس پاس کر کے اب ایم۔ ٹی۔ اے انٹرنیشل کے لیے وقف کر چکا ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ جماعتی پروگرامز اور حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ کے پروگرامز کی کوریج کرتا ہے۔ عزیزہ امۃ القیوم کے شوہر عزیزم خالد حسین خادم پیدائشی احمدی ہیں اور مولوی عبدالحق صاحب نور مرحوم ساکن کرونڈی ضلع خیر پور کے نواسے ہیں۔ میٹرک تک تعلیم یافتہ ہیں۔ 1989ء میں جرمنی گئے۔ ان کی جماعتی خدمات مختصراً کچھ اس طرح ہیں۔

1990ء میں سیکرٹری دعوت الی اللہ

1991ء میں قائد مجلس ڈی برگ

1992ء میں زونل قائد گراس گراؤ

1993ء تا 1996ء نیشنل مجلس عاملہ خدام الاحمدیہ جرمنی میں معتمد کے طور پر خدمت کی توفیق پائی۔

1990ء تا 1994ء جماعت احمدیہ رائن ہائم کے صدر رہے۔

1998ء تا 2003ء ریجنل امیر رہے۔

2008ء تا 2016ء سیکرٹری وقف نو

2011ء تا 2016ء صدر حلقہ BLUETTELBORN

2016ء سے تا حال صدر حلقہ ہٰذا کے علاوہ سیکرٹری سمعی بصری کی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں بھی میاں بیوی مختلف فرائض ادا کر کے جماعت کی خدمت

کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دونوں میاں بیوی نظام وصیت میں شامل ہیں بلکہ ایک چھوٹا بیٹا عزیزم محمد عقیل بھی نظام وصیت میں شامل ہے۔

عزیزم رفیق احمد رہان

عزیزم رفیق احمد رہان بی۔اے 1990ء میں حیدر آباد سے ملازمت چھوڑ کر بچوں سمیت جرمنی چلا گیا اور فرنکفرٹ سے چالیس کلومیٹر کے قریب قصبہ رائن ہائم میں سکونت ملی۔ 1992ء میں مجلس خدام الاحمدیہ رائن ہائم کے قائد مجلس منتخب ہوئے۔ مجلس رائن ہائم جو اس وقت جرمنی میں کارکردگی کے لحاظ سے دسویں نمبر پر تھی تیسرے نمبر پر آ گئی اور مزید ایک سال بعد یہی مجلس کارکردگی کے لحاظ سے جرمنی کی نمبر اول مجلس شمار ہوئی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک

۲۔ دو سال تک قائد ضلع کی ذمہ داری بھی سرانجام دی۔

۳۔ مختلف اوقات میں تین بار صدر جماعت احمدیہ رائن ہائم کے طور پر خدمت کی سعادت ملی۔ اس نو سال کے عرصہ میں جماعت احمدیہ رائن ہائم ریجن میں پہلے نمبر کی جماعت شمار ہوئی۔

۴۔ جلسہ ہائے سالانہ جرمنی پر چار سال تک ریفریشمنٹ نو مبائعین کا فرض بھی ادا کرنے کی سعادت ملی۔

۵۔ دو سال بحیثیت ناظم پارکنگ جلسہ سالانہ بھی خدمت کی توفیق پائی۔

۶۔ 94ء تا 96ء اجتماع خدام الاحمدیہ کے مواقع پر ناظم ضیافت کا فرض ادا کیا۔

۷۔ اِس وقت جماعت احمدیہ رائن ہائم کے سیکرٹری تربیت کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔

عزیزم کی دو بیٹیاں ہیں۔ دونوں اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے باعث حضور انور ایدہ اللہ

تعالیٰ بنصرہ العزیز کے دستِ مبارک سے انعامی میڈل حاصل کر چکی ہیں اور دونوں میاں بیوی اور دونوں بیٹیاں وصیت کر چکی ہیں۔ دو بیٹے ہیں ایک عزیزم انیق احمد ہے جو اس وقت جامعہ احمدیہ جرمنی سے فارغ التحصیل ہو کر مربی بن چکا ہے اور آجکل حضور ایدہ اللہ کے ارشاد کے پیش نظر بینین گیا ہوا ہے۔

ایک واقعہ اور نیک شگون

انیق احمد ابھی چھوٹا ہی تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ جرمنی تشریف لائے تو میں نے رفیق احمد کو فون پر کہا کہ حضور انور رحمہ اللہ کی خدمت میں میری طرف سے عرض کرو کہ انیق احمد کو اٹھا کر فوٹو بنوا دیں تا کہ میں زندگی میں اپنی آئندہ نسل یعنی تیسری نسل بھی خلافت احمدیہ کی گود میں دیکھ لوں۔ چنانچہ حضور رحمہ اللہ نے یہ فرما کر کہ آؤ رہان صاحب کے پوتے انیق احمد کو اٹھا کر فوٹو بنوائی ہوئی ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ عزیزم انیق احمد وقف کی صورت میں خلافت احمدیہ کی گود میں محفوظ ہو گیا ہے۔ چھوٹا بیٹا انیب احمد اس وقت دسویں سال میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

عزیزہ ریحانہ بشریٰ اہلیہ رفیق احمد رہان

میری بڑی بہو عزیزہ ریحانہ بشریٰ بی اے تک تعلیم یافتہ ہے۔ قرآن مجید با ترجمہ بخوبی یاد ہے۔ اپنے چاروں بچوں کو ترجمہ کے ساتھ گھر میں خود ہی قرآن مجید پڑھایا۔ جماعتی خدمات کے لحاظ سے بھی پیش پیش ہے۔ دس سال تک لجنہ اماء اللہ جرمنی کی مرکزی مجلس عاملہ کی ممبر رہی ہے۔ اب ریجن کی سیکرٹری تربیت کے فرائض سر انجام دے رہی ہے۔ جلسہ ہائے جرمنی میں لجنات میں حضور انور کے تشریف لے جانے کے وقت حفاظتی طور پر صدر لجنہ کے ہمراہ حضور انور کے ساتھ جلسہ گاہ میں جایا کرتی ہے۔ عزیزہ ریحانہ کی بڑی بہن عزیزہ اختر درانی جو کہ میری بھانجی اور میرے

ہاں پرورش شدہ ہے،صدر لجنہ اماءاللہ جرمنی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہی ہے۔

عزیزہ خالدہ تحسین

عزیزہ خالدہ تحسین تعلیم میں باقی بہن بھائیوں سے پیچھے رہ گئی تھی اور صرف سات جماعت تک تعلیم حاصل کر سکی تھی۔ وہ بھی شادی شدہ ہے اور بیوت الحمد ربوہ میں اپنے میاں اور بچوں کے ہمراہ سکونت پذیر ہے۔خالدہ تحسین لجنہ اماءاللہ مرکزیہ کی سالانہ کھیلوں میں دو تین سال تک دوڑ میں اول انعام حاصل کرتی رہی ہے۔اس کا ایک بیٹا آفاق احمد جرمنی میں ہے اور جماعتی لحاظ سے ایم ٹی اے انٹرنیشنل میں خدمت کرتا ہے۔اور نظام وصیت میں شامل ہے۔

عزیزم بشیر احمد رہان بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی

عزیزم بشیر احمد شادی کے بعد 1995ء میں جرمنی گیا۔اور اس وقت ان میاں بیوی کو جرمن حکومت نے مشرقی جرمنی رکھا۔تقریباً پانچ سال بعد ان کا اسائلم کیس منظور ہو گیا اور یہ مغربی جرمنی اپنے باقی عزیزوں کے پاس آ گئے۔اکثر قریبی عزیز رائن ہائم میں تھے۔اس لیے انہوں نے بھی رائن ہائم کے قریب ایک قصبہ میں مکان کرایہ پر لے کر رہائش اختیار کر لی۔اس کی جماعتی خدمات کا خاکہ کچھ اس طرح ہے۔

1995ء میں ہی جماعت احمدیہ ZWICKAU (سوئی کاؤ) میں بطور سیکرٹری تربیت خدمت کی توفیق ملی۔

2001ء میں مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی منتقل ہو کر جماعت احمدیہ رائن ہائم میں بطور سیکرٹری مال خدمت کی توفیق پائی۔

2009ء میں انصار اللہ صف دوم میں نائب ناظم علاقہ مقرر ہوئے اور 2011ء تک یہ فرض نبھایا۔

اسی طرح لوکل امارت ڈی برگ میں جنرل سیکرٹری اور 2012ء سے 2013ء

تک زعیم خدام الاحمدیہ مجلس رائن ہائم رہے۔

2013ء سے تا حال جماعت رائن ہائم میں جنرل سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

2015ء سے 2016ء دسمبر تک ناظم اعلیٰ علاقہ حیسن ویسٹ کی ذمہ داری ادا کی۔علاوہ ازیں جلسہ سالانہ جرمنی میں مترجم کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور اس وقت محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے قائد عمومی مجلس انصار اللہ جرمنی کے فرض کی ادائیگی کی توفیق مل رہی ہے۔الحمدللہ۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے خدام الاحمدیہ جرمنی میں خدمات پر خدام الاحمدیہ جرمنی نے نہایت خوبصورت انداز میں بشیر احمد کو سپاسنامہ پیش کر کے خدمات پر شکریہ ادا کیا ہے۔

عزیزہ امۃ الباسط

عزیزہ امۃ الباسط ایف اے تک تعلیم یافتہ ہے۔اس وقت اپنے میاں مکرم عبدالحمید طاہر مربی سلسلہ احمدیہ گھانا کے ساتھ گھانا افریقہ میں بیس سال سے زیادہ عرصہ سے مقیم ہے۔میدانِ عمل میں میاں کا خوب ساتھ دیتی ہے۔بے حد مہمان نواز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی مہمان نوازی کا اس کو شرف حاصل ہو چکا ہے۔

محترم مربی صاحب کی ٹمالے گھانا میں تقرری تھی کہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز وہاں تشریف لے گئے۔حضور کا قیام اسی مکان میں تھا جہاں یہ قیام پذیر تھے۔ حضور انور اور اہلِ قافلہ کی مہمان نوازی عبدالحمید اور امۃ الباسط کے ذمہ تھی۔حضور انور کی خدمت میں امۃ الباسط نے از خود نمکو بنا کر پیش کی تو حضور انور نے بہت پسند فرمائی۔الحمدللہ کہ یہ خاندان بھی خدمت دین میں منہمک ہے۔اور دونوں میاں بیوی نظام وصیت میں شامل ہیں۔

عزیزہ بشریٰ صدیقہ قدیر

پانچویں بیٹی عزیزہ بشریٰ قدیر ربوہ میں ہی محلّہ میں لجنہ کی خدمت میں مصروف تھی۔اس کے ہاں پانچ بیٹیاں ہیں۔میاں عزیزم قدیر احمد ساجد انگلستان چلے گئے ہیں اوران کو وہاں قیام مل گیا ہے۔اللہ کے فضل سے 9 فروری 2017ء کو یہ بھی انگلستان میاں کے پاس چلی گئی ہے۔اور چار بیٹیاں بھی انگلستان پہنچ گئی ہیں۔

عزیزہ سلمیٰ کلیم

اولاد میں سے سب سے چھوٹی بیٹی عزیزہ سلمیٰ کلیم ہے۔نوعمری میں ہی جماعتی خدمات میں مصروف ہوگئی تھی۔جس کی وجہ محترمہ انیسہ فاضل صاحبہ صدر لجنہ محلّہ دارالرحمت غربی تھیں۔انہوں نے نہایت شفقت کے ساتھ سلمیٰ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ جماعتی خدمات میں لگادیا۔چنانچہ شادی سے پہلے 1995ء سے 2001ء تک سیکرٹری اصلاح وارشاد لجنہ محلّہ دارالرحمت غربی رہیں۔

شادی کے بعد جرمنی جاکر 2008ء سے 2013ء تک اپنی جماعت میں سیکرٹری وقف نو کے طور پر خدمت کی سعادت پائی۔

2009ء سے 2015ء تک سیکرٹری ہیومینٹی فرسٹ کے طور پر کام کیا۔

2013ء سے 2016ء تک سیکرٹری تعلیم جماعت ہٰذا رہیں۔

2015ء سے ترتیل کا امتحان پاس کر کے معلّمہ ترتیل القرآن بن گئیں۔

2016ء سے اپنی لجنہ میں معلّمہ ترتیل القرآن کے فرائض سرانجام دے رہی ہیں اور بچیوں کو اجتماعات کی تیاری کرواتی ہیں۔

ان کے میاں عزیزم کلیم احمد بٹ اپنی جماعت ڈسن باخ میں ایک حلقہ کے صدر جماعت بھی ہیں اوراس کے علاوہ ساری جماعت کے سیکرٹری وقف جدید کے طور پر بھی خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔

الحمد للہ کہ ساری اولاد نظام جماعت سے بخوبی وابستہ ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں قیامت تک سرسبز وشاداب رکھے اور ہمیشہ خلافت سے وابستہ رکھے اور میرے لیے ان سب کو صدقہ جاریہ بنائے۔اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فضل عظیم ہے کہ بڑی بیٹی امۃ القیوم اوراس کا میاں خالد حسین خادم بھی نظام وصیت میں شامل ہیں۔ بلکہ اس کے دو بیٹے عزیزسلمان احمد اور عزیزم محمد عقیل بھی نظام وصیت میں شامل ہیں۔

بڑا بیٹا عزیزم رفیق احمد، اس کی اہلیہ، دو بیٹیاں عزیزہ عمرانہ بسالت اور انیلہ احمد چاروں نظام وصیت میں شامل ہیں۔عزیزم انیق احمد مربی سلسلہ، رفیق کا بڑا بیٹا، بھی نظام وصیت میں شامل ہے۔میرا چھوٹا بیٹا عزیزم بشیر احمد بھی نظام وصیت میں شامل ہے۔خاکساراور خاکسار کی اہلیہ بھی وصیت کر کے حصہ جائیداد ادا کر چکے ہیں۔امۃ الباسط اوراس کے میاں عبدالحمید طاہر دونوں نظام وصیت میں شامل ہیں۔زاہد ارشاد اور خالدہ تحسین کا بیٹا عزیزم آفاق احمد ساکن جرمنی عرصہ سے نظام وصیت میں شمولیت اختیار کر چکا ہے اور بخوبی نظام جماعت اور خلافت سے وابستہ ہے۔اس کے والد زاہد ارشاد بھی 2010ء سے نظام وصیت میں شامل ہیں۔

پس خاکسار کے والد مرحوم بھی موصی تھے۔خاکسار اور اہلیہ بھی موصی ہیں اور اولاد میں سے بھی موصیان موجود ہیں۔اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ سب ہی عبادت الٰہی اور نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو رؤیاء صالحہ کی نعمت سے بھی سرفراز اور دعا گو ہیں۔میری اولاد کی اس نیک تربیت میں ان کی والدہ کا بہت بڑا کردار ہے۔وہ اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔لیکن بچوں کی تربیت کے لحاظ سے بہت عمدہ کردار کی مالک ہیں۔بچوں کی صحت وسلامتی، خوراک اور جسمانی صفائی اوراخلاقی نگرانی کے لحاظ سے اس نے مثالی کردار ادا کیا ہے اور وہ جو ابتدائی زندگی کا اظہار مجھ سے ہوا ہے اس کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ

وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّلَّکُمْ

بحیثیت ایک واقف زندگی کی بیوی کے وہ کبھی بھی میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنی۔ بلکہ زندگی کے ہر لمحے میں میرا عمدگی سے ساتھ دیا۔خواہ بچوں اور بچیوں کے رشتوں کا معاملہ ہو،خواہ گھر کے اخراجات وغیرہ کا مسئلہ ہو۔کبھی بھی میری بات سے اختلاف نہیں کیا۔گھریلو اخراجات کی ذمہ واری تو ابتدائی زندگی میں مجھے سونپ دی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اس معاملہ میں ہمیشہ سرخرو کیا ہے۔الحمدللہ علیٰ ذالک۔اللہ تعالیٰ میری اہلیہ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔آمین

اولاد کو وصیت اور نصیحت

اپنی اولاد کو وصیت اور نصیحت کے طور پر یہاں میں وہ عہد بھی لکھنا چاہتا ہوں جو حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے صد سالہ خلافت جوبلی کے موقع پر جماعت سے لیا تھا، کہ میری اولاد ہمیشہ اس عہد کی جان و دل سے پاسداری کرے۔عہد کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

”(تشہد)۔آج خلافت احمدیہ کے سو سال پورے ہونے پر ہم اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ہم (دین حق) اور احمدیت کی اشاعت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام دنیا کے کناروں تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک کوشش کرتے چلے جائیں گے اور اس مقدس فریضہ کی تکمیل کے لیے ہمیشہ اپنی زندگیاں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف رکھیں گے۔ اور ہر بڑی سے بڑی قربانی پیش کر کے

قیامت تک (دین حق) کے جھنڈے کو دنیا کے ہر ملک میں اونچا رکھیں گے۔

ہم اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ہم نظام خلافت کی حفاظت اور اس کے استحکام کے لیے آخری دم تک جد و جہد کرتے رہیں گے اور اپنی اولاد در اولاد کو ہمیشہ خلافت سے وابستہ رہنے اور اس کی برکات سے مستفید ہونے کی تلقین کرتے رہیں گے تاکہ قیامت تک خلافت احمدیہ محفوظ چلی جائے اور قیامت تک سلسلہ احمدیہ کے ذریعہ (دن حق) کی اشاعت ہوتی رہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا دنیا کے تمام جھنڈوں سے اونچا لہرانے لگے۔اے خدا تو ہمیں اس عہد کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرما۔

اَللّٰھُمَّ آمِیْن. اَللّٰھُمَّ آمِیْن. اَللّٰھُمَّ آمِیْن.''